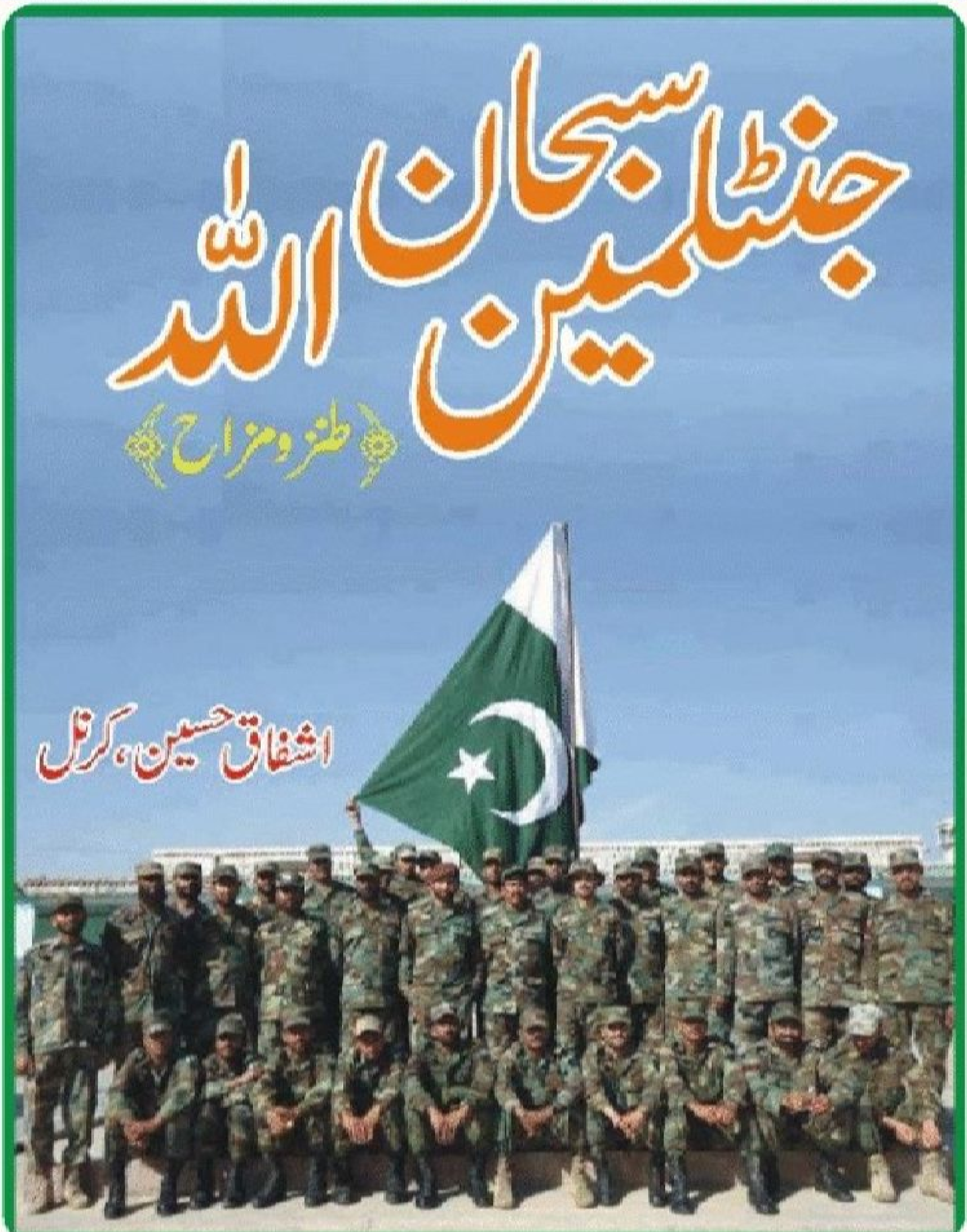

جنٹلمین سبحان اللہ
طنز و مزاح
اشفاق حسین، کرنل

عسکری ادب

ضرب مومن

ضرب مومن سے تھکے ہارے واپس لوٹے تو یار لوگوں نے ایسے ایسے سوالات کئے کہ ہم نے جھنجلا کر سر پیٹ لیا۔ وہی داستان یوسف علیہ السلام والی بات تھی کہ تمام رات سر دھنتے رہے' صبح دم پوچھتے ہیں کہ زلیخا مرد تھا یا عورت؟ ضرب مومن کے بارے میں اتنی خبریں' مضامین' ڈائریاں' اداریے' شذرے' تنقید اور جانے کیا کچھ چھپتا رہا لیکن دوران مشق بھی ہمارے سویلین دوستوں کی طرف سے یہ سوال رہا اور اب بھی درپیش ہے کہ جب فائر نہیں ہوا' گولی نہیں چلی' توپیں داغی نہیں گئیں' راکٹ چھوڑے نہیں گئے' جہازوں نے بم گرائے نہیں۔۔۔۔۔۔تو یہ جنگی مشق کیسی؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ مشق اسٹریٹجک (عسکری حکمت عملی) سطح کی تھی جس میں فائرنگ سے کہیں زیادہ اہمیت فوجوں کی نقل و حرکت کی ہوتی ہے اور دوسری یہ کہ فائرنگ کی باری تو بہت بعد میں آتی ہے' اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا ہوتا ہے' اس کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ پہلی گولی چلنے سے پہلے آدھی جنگ جیتی یا ہاری جا چکی ہوتی ہے۔ اس فیلڈ سے ناآشنا لیکن دلچسپی رکھنے والے دوستوں کے لیے ہم ان دونوں باتوں کو مزید وضاحت سے بیان کریں گے۔

ہم نے کہا کہ اسٹریٹجک جنگ میں اصل اہمیت فوجوں کی نقل و حرکت کی ہوتی ہے۔ یہ نقل و حرکت اتنی سیدھی سادی نہیں ہوتی کہ جدھر جی چاہا' منہ اٹھا کر چل دیے اور راتوں رات ستر' اسی کلومیٹر فاصلہ طے کر کے سینہ پھلا کر اس پر فخر کیا جائے' سینکڑوں میل کا فاصلہ تو روزانہ انتہائی پھٹیچر' دھواں اڑاتی بسیں بھی طے کر لیتی ہیں لیکن ان کی نقل و حرکت سٹریٹجک نہیں کہلاتی۔ پھر یہ سٹریٹیجی ہے کیا بلا؟

آکسفورڈ ڈکشنری میں سٹریٹیجی کی تعریف کچھ یوں بیان کی گئی ہے۔

"جنرل شپ' جنگی فن' کسی فوج یا فوجوں کا انتظام و انصرام' فوجوں اور بحری یا ہوائی جہازوں کو اس انداز میں حرکت میں لانا کہ دشمن کو اپنی مرضی کے علاقے میں' اپنی مرضی کے وقت پر اور اپنی مرضی کے حالات میں لڑنے پر مجبور کر دیا جائے۔"

اس کی تعریف میں اپنی فوجوں کی نقل و حرکت کا ذکر ہے۔ یہ نقل و حرکت یعنی فوج کے ایک بڑے حصے کا پورے اسلحہ اور ساز و سامان سمیت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا بجائے خود ایک بڑی بات ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ آپ برسوں سے ایک ایسے گھر میں مقیم ہوں جس میں زندگی کی تمام ضروریات میسر ہوں۔ آپ کو یہ حکم ملے کہ اس گھر کے تمام سامان سمیت راتوں رات پچاس

کلومیٹر دور کسی جگہ ایسے منتقل ہو جائیں کہ وہاں منتقل ہوتے ہی گھر کا سارا انتظام اپنے روزمرہ معمول کے مطابق چالو حالت میں ہو' ہر سہولت موجود ہو' سوئی دھاگے سے لے کر توا' چمٹا' پرات تک' سبھی کچھ ہو۔ پھر اسی پر بس نہیں' وہاں سے کسی اور جانب کوچ کے لیے بھی ہر دم تیار رہے۔ اب اس منتقلی میں ماچس یا لائٹر ہی پیچھے رہ جائے تو کھانا پکانے کا سارا انتظام دھرے کا دھرے رہ جائے گا۔ گھر میں تو پھر یوں ہوتا ہے کہ ڈرائنگ روم سے بیڈ روم کا کام بھی لیا جاسکتا ہے لیکن فوج کے مختلف صیغے اپنی اپنی جگہ اتنے اہم ہیں اور ہر صیغے کا اپنا ایسا رول ہے کہ کسی کو پیچھے نہیں چھوڑا جاسکتا۔ (بجا' حالت نقل میں گھر کی بہت سی چیزیں پیچھے چھوڑی جاسکتی ہیں جیسے ڈرائنگ روم کا آرائشی سامان ------ یونٹیں بھی زمانہ امن میں جیتی ٹرافیاں' کوارٹر گارڈ اور غیر ضروری چیزیں پیچھے چھوڑ جاتی ہیں) پھر نقل و حرکت میں یونٹوں کی ایک خاص ترتیب ہوتی ہے اور ایک دوسرے سے متعین فاصلہ قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً انفنٹری یا آرمر پیش قدمی کر رہے ہوں تو اپنی رینج کے مطابق توپ خانہ ان کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ اگر توپوں کی مار زیادہ سے زیادہ تیس کلومیٹر ہے تو ضروری ہے کہ وہ ایڈوانس کرتے دستوں سے زیادہ سے زیادہ بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہوں تا کہ اگر دشمن سے مڈھ بھیڑ ہو جائے تو سات آٹھ کلومیٹر دور ہی اسے توپوں کی زد میں لیا جاسکے۔ اے وی جنگ میں ہماری انفنٹری چھمب جوڑیاں فتح کر کے اکھنور کے مضافات میں جا پہنچی تھی۔ شہر کی عمارات نظر آرہی تھیں۔ لیکن ان کی پیش قدمی روکنے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ توپخانہ پیچھے رہ گیا تھا۔ اسی طرح انجینئرز بھی قریب ہی موجود ہونے چاہئیں کہ کوئی دریا' نہر یا کوئی اور رکاوٹ درپیش ہو تو اسے عبور یا دور کیا جاسکے۔ راستے میں خراب ہونے والی گاڑیوں اور اسلحہ کی فوری مرمت کا انتظام بھی ضروری ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ان حرکت پذیر دستوں کا آپس میں ایسا رابطہ ہو کہ کمانڈر اپنی صوابدید کے مطابق جس کو جہاں متعین کرنا چاہے' کر سکے جس کی ترتیب بدلنا چاہے' بدل سکے۔

ابھی حال ہی میں آرمی ایئر ڈیفنس کمانڈ وجود میں آئی ہے۔ ان کا وجود باقی دستوں کے لیے گویا چھتری کی مانند ہے۔ دستے جہاں بھی جائیں' اس کمانڈ کا مقصد انہیں دشمن کے ہوائی حملوں سے محفوظ رکھنا ہے۔ محض مشینوں کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا' اصل کام یہ ہے کہ انہیں پوری ذہانت سے استعمال کیا جائے۔ آرمی ایئر ڈیفنس کو قائم ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن پاک فوج میں متعلقہ ساز و سامان کو اس دانائی سے استعمال کیا گیا ہے کہ پوری دنیا سے آنے والے فوجی ماہرین عش عش کر اٹھے۔ خود امریکی ماہرین نے ضرب مومن کے دوران میں اس نظام کا مطالعہ کیا تو ان کے ایک جنرل نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں ریکارڈ کرائے۔ "پاکستان نے جو نظام وضع کیا ہے وہ امریکہ سے بھی بہتر ہے۔"

اللہ جانے یہ اس کے دل کی آواز تھی یا ہمیں مکھن لگانے کی کوشش!

''ضرب مومن'' پاک فوج کی تاریخ کی سب سے بڑی فوجی مشق تھی جس میں ایک لاکھ انتیس ہزار افسروں اور جوانوں نے حصہ لیا۔ مشق کے علاقے کو دریائے سندھ اور جہلم و چناب کے درمیان محدود کیا گیا تھا۔ شمال میں چشمہ جہلم رابطہ نہر اور جنوبی حد پنجند ہیڈ ورکس تھی۔ مشق میں حصہ لینے والے یونٹوں' ہیڈ کوارٹروں اور ساز و سامان کی موٹی موٹی تفصیل:

فوجی دستوں کی تعداد ------	129,287
کور ہیڈ کوارٹرز ------	4
ڈویژن ہیڈ کوارٹرز ------	11
بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز ------	57
بٹالین کی سطح کے یونٹ ---	227
ٹینک ------	755
بکتر بند گاڑیاں ------	487
توپیں ------	754
گاڑیاں ------	14,124
جنگی طیارے ------	188

اتنے زیادہ ساز و سامان کے ساتھ سوا لاکھ نفری کو بیرکوں اور دفتروں سے نکال کر میدان میں لا ڈالنا اور ایک خاص حکمت عملی کے ساتھ حرکت میں رکھنا' ایک بڑا کام تھا اور اس مشق نے پاک فوج کی تربیت میں اہم کردار ادا کیا جس کے اثرات آئندہ کئی برسوں تک محسوس ہوتے رہیں گے۔

بات ہو رہی تھی نقل و حرکت کی ------ دشمن کو اپنی مرضی کے علاقے میں لانے یا بھیجنے کا کیا فائدہ ہوتا ہے اور یہ عمل کیوں کر ہوتا ہے' اسے دو مثالوں سے سمجھئے۔

ہمارے ہمسائے نے جب براس ٹیک مشقوں کے دوران اپنی فوجیں ہماری سرحدوں پر لا کھڑی کی تھیں تو ہمارا ایک پورا ڈویژن اپنی جگہ سے غائب ہو گیا اور باوجود سر توڑ کوششوں کے دشمن کو اس کا سراغ نہ مل سکا۔ اب ہوتا یوں ہے کہ جارح فوج جہاں حملہ آور ہو

رہی ہوتی ہے وہاں تو اس کی فوجوں کا خاصا ارتکاز ہوتا ہے' ان کی قوت بہت ہوتی ہے لیکن وہ اپنی تمام سرحدوں پر اتنی ہی مضبوط نہیں ہوتی۔ جارحانہ دفاع میں دفاعی دستے تو حملہ آور فوجوں کو بہرصورت روکے رکھنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جبکہ اسٹریٹیجک ریزرو فارمیشن کسی ایسی جگہ سے فریق مخالف کی سرحدوں پر حملہ آور ہوتے ہیں جہاں وہ کمزور ہو۔۔۔۔۔۔۔ تو براس ٹیک مشق کے دوران جب ہمارے ہمسایوں نے اپنی قوت ہماری سرحدوں پر مرکوز کر دی اور ہمارا ایک پورا ڈویژن بغیر کوئی سراغ چھوڑے غائب ہو گیا تو خوف یہی تھا کہ جانے وہ کہاں سے' کہاں حملہ آور ہو جائے۔ یہی خوف پرامن مذاکرات کی کلید بن گیا۔

دوسری مثال دوسری جنگ عظیم کی ہے۔ جرمن جب پورے یورپ کو روند کر جنوب میں سپین' اٹلی اور یونان تک قابض تھے تو اتحادی فوجیں شمالی افریقہ میں کامیابیاں حاصل کر چکی تھیں۔ یہ طے تھا کہ اتحادیوں نے حملہ کرنا ہے۔ جرمنوں نے اسے ناکام بنانے کے لیے ہر طرح کی تیاری کر رکھی تھیں۔ فیصلہ ہوا کہ حملہ اٹلی کے جنوب میں واقع جزیرہ سسلی پر کیا جائے۔ جرمنوں کو دھوکہ دینے کے لیے برطانیہ کے ایک انٹیلی جنس افسر مونٹا گو نے ایک عجیب وغریب منصوبہ پیش کیا جو تھوڑی سی پس وپیش کے بعد منظور کر لیا گیا۔ ایک تازہ تازہ انتقال فرمائے ہوئے شخص کی نعش حاصل کی گئی۔ اس کی فوجی کٹ حجامت کی گئی' اسے ایک میجر کی وردی پہنائی گئی اور اس کی جیبوں میں ایسے کاغذات ٹھونس دیئے گئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اصلی حملہ سسلی سے تقریباً ساڑھے سات سو کلو میٹر مشرق میں یونان پر کیا جائے گا۔ اس پورے چکر کو قابل یقین بنانے کے لیے اور بہت سے اقدامات کئے گئے جن کے بیان کا یہ موقع نہیں۔ مختصر یہ کہ ان میجر صاحب کی نعش بحیرہ روم میں بہادی گئی۔ کاغذات جرمنوں کے ہاتھ لگے تو انہوں نے اس پر یقین کر لیا اور یونان پر متوقع حملے کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے سسلی سے فوجیں نکال کر مشرق کی طرف بھیج دی گئیں۔ فرسٹ پینزر ڈویژن یونان پہنچا دیا گیا۔ زیادہ تر تارپیڈو کشتیاں بھی ادھر ہی منتقل کر دی گئیں۔ اصل حملہ شروع ہونے کے دو ہفتوں بعد تک ہٹلر یہی سمجھتا رہا کہ اتحادی اسے "دھوکا" دینے کے لیے سسلی میں کارروائیاں کر رہے ہیں اصل حملہ یونان ہی پر ہو گا۔ اس نے اپنے بہترین جنرل' مارشل رومیل کو بھی وہیں بلوا بھیجا۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جو تھوڑی بہت فوج سسلی میں رہ گئی ہو گی اسے زیر کرنا اتحادی فوجوں کے لیے کتنا آسان رہا ہو گا۔ سسلی میں جب پہلی گولی چلی ہو گی تو آدھی جنگ جیتی یا ہاری جا چکی تھی یا نہیں۔۔۔۔۔۔۔ اسی پر بس نہیں' سسلی پر حملے کے بعد جب اتحادی قوتوں نے مغرب کی جانب سے جون ۱۹۴۴ء کو حملہ شروع کیا تو ہزاروں فوجی یونان اور اٹلی کے درمیان ہی پھنسے ہوئے تھے اور ان کی جگہ ہٹلر نے ان "رضا کاروں" کو استعمال کیا جو پولینڈ' ہنگری' چیکوسلواکیہ' رومانیہ اور یوگوسلاویہ وغیرہ سے بھرتی کئے گئے تھے (یہ "رضا کار" بھرتی نہ ہوتے تو نازی کیمپوں میں پڑے ہوتے)

ضرب مومن کی مشق کے دوران بھی رضا کار استعمال کئے گئے۔ جب فوکس لینڈ کی فوج ایک خاص علاقے کو چھوڑ رہی تھی تو اس کے جونیئر کمانڈروں نے علاقے کے سکول اور کالج کے طلبہ کو اکٹھا کیا اور انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ جب بلیولینڈ کی فوج ان کے علاقے میں آئے تو جہاں ممکن ہو وہ ان کی مواصلات کی تاریں کاٹ دیں۔ سادہ سا کام تھا' چند گھنٹوں کی تربیت سے طلبہ طاق ہو گئے۔ بلیولینڈ کی فوج وہاں آئی تو تین چار دنوں تک ان کا بذریعہ تار مواصلاتی نظام قائم نہ ہو سکا۔ سارا کام وائرلیس پر کرنا پڑا۔ سگنل بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر کو سخت خفت اٹھانا پڑی۔ تیسرے دن کچھ طلبہ تاریں کاٹتے ہوئے پکڑے گئے۔ پوچھ گچھ پر پتہ چلا کہ فوکس لینڈ کے "تربیت یافتہ کمانڈو" ہیں۔ ایمپائروں سے شکایت کی گئی جنہوں نے گاؤں کے چوہدریوں سے مل کر انہیں سمجھایا کہ ضرب مومن میں حصہ لینے والے دونوں فریق پاک فوج کے ہیں اس لیے طلبہ کو غیر جانبدار رہنا چاہیے۔ مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن یہ بات ثابت ہو گئی کہ فوجی معاملات میں سویلین کتنا اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ضرب مومن مشق کے دوران نفسیاتی جنگ (Psychological War) کے حربے بھی آزمائے گئے۔ مشق کے دوران فوکس لینڈ کی طرف سے دعویٰ کیا گیا کہ انہوں نے بلیو بینڈ کے ایک سینئر افسر بریگیڈیئر جمشید کو جنگی قیدی بنا لیا ہے اور ان کے قبضے سے اہم نقشے اور کاغذات برآمدات ہوئے ہیں۔ یہ خبر بعض اخبارات میں شائع بھی ہوئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ گرفتاری بلیولینڈ کی طرف سے باقاعدہ منصوبہ بندی کا حصہ تھی اور جو نقشے اور کاغذات فوکس لینڈ کے ہاتھ آئے تھے ان پر بنائے گئے تمام منصوبے جعلی تھے۔ بلیولینڈ والوں کا دعویٰ تھا کہ فوکس لینڈ کی فوجوں نے ان منصوبوں کا ناکام بنانے کے لیے اپنی فوج کو جس طرح ترتیب دیا' اسی نے انہیں شمال کی طرف سے بسرعت پیش قدمی میں مدد دی۔ وہ دستے جو ان کی راہ میں مزاحم ہو سکتے تھے' ان کے راستوں سے ہٹا کر وہاں لگا دیئے گئے تھے جہاں بلیولینڈ والے چاہتے تھے۔

نقل وحرکت کے علاوہ عسکری حکمت عملی میں ایک اور اہم عنصر وقت کا ہوتا ہے۔ جنرل رومیل کو ۴۳ء میں فرانس بھیجا گیا اس ہدایت کے ساتھ کہ وہ دیوار اوقیانوس (Atlantic Wall) کا معائنہ کرے جو ہٹلر نے اتحادیوں کے متوقع حملے خلاف یورپ کے مغربی کنارے پر قائم کی تھی۔ یہ معروف معنوں میں کوئی دیوار نہ تھی بلکہ دفاع کے ان زبردست اقدامات کو جو بحر اوقیانوس کے کنارے کئے گئے تھے' یہ نام دیا گیا تھا۔ جنرل رومیل کو اس دفاع میں کئی شگاف نظر آئے۔ اس نے دن رات ایک کر کے دفاع کو بہتر بنایا۔ سمندر کے کنارے خاردار تاروں اور بارودی سرنگوں کا جال بچھا دیا۔ ایک سال بعد اپنے اے ڈی سی سے گفتگو کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "اب میرا اصل دشمن ایک ہی ہے اور وہ ہے وقت" جب "وقت" آیا اتحادیوں نے نارمنڈی پر حملہ کیا تو رومیل

چھٹی پر اپنے گاؤں گیا ہوا تھا۔

نقل و حرکت کی ایک بہترین مثال رسول خدا ﷺ نے قائم کی۔ جب آپ نے مکہ فتح کرنے کا فیصلہ کیا تو دس ہزار صحابہ کو لے کر مدینے سے شمال کی جانب کوچ کیا۔ مکہ مدینے سے جنوب میں واقع ہے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آئی کہ آپ مکہ تشریف لے جا رہے ہیں۔ شمال کی طرف کچھ دور سفر کرنے کے بعد آپ نے جنوب کا رخ کیا اور عام راستوں سے ہٹ کر تیزی سے مکہ جا پہنچے۔ یہ سٹریٹجی اتنی موثر تھی کہ کفار مکہ اس کا کوئی توڑ نہ کر سکے۔ ''وقت'' ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ رحمۃ للعالمین سے عفو و درگزر کے طالب ہوں اور قربان اس رہبر اعظم کے کہ سٹریٹیجک جنگ تو وہ جیت ہی چکے تھے۔ ''لاتثریب علیکم الیوم'' کا فرمان جاری کر کے آپ ﷺ نے دلوں کی دنیا بھی جیت لی۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!

جنگ چھڑ جانے کے بعد وقت کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس کی مثال کرکٹ کے کھیل کی سی ہے کہ جب بیٹسمین بال کو ہٹ لگا دیتا ہے تو اصل کشمکش وقت اور جگہ (Time and Space) ہی کے لیے ہوتی ہے۔ بال تیزی سے باؤنڈری لائن کی جانب بڑھ رہی ہوتی ہے۔ فیلڈرز کی کوشش ہوتی ہے کہ اسے باؤنڈری تک جانے سے پہلے پہلے نہ صرف روک لیا جائے بلکہ کوئی وقت ضائع کئے بغیر وکٹوں کی طرف پھینک بھی دیا جائے۔ جب فیلڈر گیند اٹھا لیتا ہے تو اس کے پاس بڑا ہی محدود وقت ہوتا ہے۔ اسی محدود وقت میں اس نے فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ اسے وکٹوں کی کس جانب پھینکا جائے۔ اسی تھرو پر کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہوتا ہے۔ ادھر بیٹسمینوں کے پاس لامحدود وقت نہیں ہوتا بلکہ گیند کے پیچھے لپکتے ہوئے فیلڈر کو دیکھتے ہوئے انہوں نے فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ ان کے پاس کتنا وقت ہے۔ گیند کی واپسی سے پہلے پہلے انہوں نے وکٹوں کے درمیان بھاگتے ہوئے رنز مکمل کرنا ہوتے ہیں۔ وقت اور جگہ کے بارے میں ذرا سی غلطی کسی بیٹسمین کو پویلین واپس بھیج دیتی ہے۔

اب رہ گئی وضاحت اس بات کی کہ جب اصل فائرنگ نہیں ہوتی تو مشق کیوں کر ہوتی ہے۔ جنگ کوئی نئی چیز تو ہے نہیں۔ انسان صدیوں سے لڑتا آ رہا ہے۔ آج کل کے زمانے میں تو شاید ہی کوئی لمحہ ایسا ہوتا ہو جب دنیا میں کہیں نہ کہیں گولی نہ چل رہی ہو اور فوجیں/نیم فوجی دستے یا شہری ایک دوسرے سے برسر پیکار نہ ہوں۔ برسوں کے مشاہدے سے کچھ نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔ مثلاً اگر پیدل دستوں کی پیش قدمی کے دوران بارودی سرنگیں آ جائیں اور کمانڈر اپنے انجینئروں کی مدد سے انہیں صاف کروانے کی بجائے (جو کہ ایک وقت طلب کام ہے اور وقت محدود ہوتا ہے) یہ حکم دے کہ دستے سرنگوں کے بیچ سے گزر جائیں تو مشاہدہ یہ ہے کہ زخمی اور

شہید ہونے والوں کی تعداد پانچ سے دس فیصد تک ہوتی ہے۔

اسی طرح اگر مورچہ بند دفاعی دستوں کے خلاف حملہ کیا جائے تو حملہ آور دستوں میں تیس فیصد افراد کے زخمی یا شہید ہونے کا امکان ہے۔ اگر دفاع بلندی پر لیا گیا ہو اور خود کار ہتھیاروں کو ذہانت سے سائٹ کیا گیا ہو اور دفاع کے آگے دوسری رکاوٹیں بھی ہوں تو حملہ آور دستوں کا نقصان ساٹھ فیصد تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ خیال رہے کہ جس یونٹ کے بیس فیصد افراد شہید یا زخمی ہو جائیں تو جب تک اس کی افرادی قوت پوری نہ کر دی جائے بطور یونٹ اسے جنگ کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔

ایسی صورت حال بھی ہو سکتی ہے کہ حملہ آور دستے ایسی فوجوں پر ٹوٹ پڑیں جو تازہ تازہ کسی جگہ وارد ہوئے ہوں اور ابھی دفاعی مورچے نہ کھودے گئے ہوں تو ظاہر ہے کہ اس شکل میں حملہ آور دستوں کا نقصان کم سے کم ہوگا۔

ضرب مومن کی مشقوں کے دوران ایسا ہوا بھی۔۔۔۔۔۔ بلیو لینڈ کے انجینئرز نے راتوں رات دریائے چناب پر تین پل قائم کئے اور بڑی تیزی سے ایک پورا ڈویژن دریا کے پار اتر گیا۔ پار اترنے کے بعد ابھی ان کے یونٹ نئی جگہوں پر حیرانی و پریشانی کے عالم ہی میں تھے؛ اپنی صفیں درست بھی نہ کر پائے تھے کہ فوکس لینڈ کے ایک انفنٹری بریگیڈ نے آرمرڈ سکواڈرن کے ساتھ ان پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا اچانک اور بھرپور تھا کہ بلیو لینڈ ڈویژن کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ ایمپائروں نے اس حملے کو کامیاب قرار دیتے ہوئے بلیو لینڈ ڈویژن کے ساٹھ فیصد افراد کو زخمی یا شہید اور اسی نسبت سے ساز و سامان کو ''تباہ و برباد'' قرار دے دیا۔ (کامیابی کا اصل عنصر ''وقت'' ہی رہا کہ فوکس لینڈ والے بروقت اپنا بریگیڈ دریا کے کنارے لانے میں کامیاب ہو گئے۔ دیر کرتے تو بلیو لینڈ والے اپنا دفاع سنبھال چکے ہوتے) ساٹھ فیصد نقصان کا مطلب یہ تھا کہ بلیو لینڈ والے جب تک نیا ڈویژن اس جگہ نہ لے آتے' مزید پیش قدمی نہ کر سکتے تھے۔

مشق کے چیف کنٹرولر اور چیف ایمپائر لیفٹیننٹ جنرل حمید گل تھے۔ ان کی معاونت کے لیے میجر جنرل سے لے کر میجروں تک کی ایک پوری ٹیم تھی جنہیں مشق شروع ہونے سے پہلے تفصیلی ہدایات بھی دی گئی تھیں اور ایک ہفتے کا کورس بھی کروایا گیا تھا۔ جنرل رینک کے ایمپائروں کو ہیلی کاپٹر مہیا کئے گئے تھے تاکہ وہ وسیع علاقے میں ہوتی ہوئی فوجی نقل و حرکت کا تفصیلی جائزہ لے سکیں۔ جبکہ فارمیشن سے لے کر کمپنی سطح تک بھی ایمپائر مقرر تھے۔ ان کا کام سب سے زیادہ سخت تھا۔ وہ رہتے تو یونٹ کے ساتھ ساتھ ہی تھے لیکن ان کے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ یونٹ والے انہیں ''مار آستین'' کہہ کر پکارتے تھے کہ ان کے زیادہ تر فیصلے ''دشمن'' کے حق میں جاتے تھے مثلاً دریائے چناب پر پل بنا کر جب بلیو لینڈ کے ڈویژن نے آگے بڑھنا چاہا تو ایمپائر نے دریا کے پار لگی ہوئی بارودی

سرنگوں کو ''انتہائی موثر'' گردانتے ہوئے انہیں صاف کرنا ضروری قرار دیا اور پھر تقریباً تین گھنٹے پورے ڈویژن کو اس حال میں روکے رکھا کہ ہر شخص پا بہ رکاب تھا' پیش قدمی کے لیے تیار ۔۔۔۔۔۔سرنگیں صاف کرنے کا عمل دہرایا گیا' انجینئروں کے چند افراد ''شہید'' ہوئے تو آگے بڑھنے کا اذن ملا۔اسی طرح شمال سے جنوب کی طرف پیش قدمی کرتا ہوا ڈویژن جب حیدرآباد اور مانگیرہ کی سڑک تک پہنچا تو ایمپائر نے فوکس لینڈ کے دفاع کو مضبوط قرار دیتے ہوئے اگلے ٹینکوں کو ''تباہ'' قرار دے دیا اور پیش قدمی رک گئی۔ یہ سب کچھ کسی لگے بندھے اصول کے مطابق ہوتا ہے۔

ترقی یافتہ ملکوں میں تو مشقوں کے دوران فوجی ایک خاص لباس پہنتے ہیں جو پر ربڑ کی گولی اگر ایسی نازک جگہ آ لگے کہ اصل گولی کی صورت میں انسان کے جانبر ہونے کا امکان نہ ہو تو سٹیل ہیلمٹ پر لگا ایک سرخ بلب جل اٹھتا ہے اور اس وقت تک جلتا بجھتا رہتا ہے جب تک متعلقہ فرد لیٹ نہ جائے۔اسی طرح ٹینکوں میں ایک ایسا نظام فٹ کر دیا جاتا ہے کہ اس پر کوئی مصنوعی راکٹ آ لگے تو اس کا سٹیرنگ جام ہو جاتا ہے اور اس کے اوپر لگا ایک بلب جل اٹھتا ہے۔

پاکستان میں ابھی تک یہ نظام نہیں اپنایا جاسکا۔یہاں کمپنی کی سطح تک ایمپائر موجود ہوتے ہیں اور پیش قدمی کرتے ہوئے افراد کا بغور جائزہ لیتے رہتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ کوئی فرد اس احتیاط سے کام نہیں لے رہا جو اصل فائرنگ کے وقت لینی چاہیے یا احتیاط کے باوجود ''دشمن'' کی طرف سے آنے والا فائر موثر ہو تو وہ فرداً فرداً کسی کو شہید' کسی کو زخمی قرار دیتے ہیں۔اس بارے میں ایک چٹ متعلقہ فرد کے حوالے کی جاتی ہے جس پر زخمی ہونے کا وقت اور ''زخم'' کی نوعیت بھی لکھی ہوتی ہے۔''شہید'' ہونے والے کو پیچھے لے جانے کے سلسلے میں تو تاخیر گوارا کی جاسکتی ہے لیکن زخمی افراد کا معاملہ مختلف ہوتا ہے۔''اگلے مورچوں'' سے بٹالین ہیڈکوارٹر تک لانا تو یونٹ کے اپنے سٹریچر بیریر کا کام ہوتا ہے' وہاں سے پیچھے لے جانا آرمی میڈیکل یونٹ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔میڈیکل کور کا یہی امتحان ہوتا ہے کہ وہ کتنی جلدی زخمی کو طبی امداد کی کسی پوسٹ یا ہسپتال میں پہنچانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔پھر یہ نہیں ہوتا کہ مشق میں زخمی شخص (جو اصلاً تو ٹھیک ٹھاک ہی ہوتا ہے) کو سٹریچر پر ڈالے جھولا جھلاتے واپس لے آئیں بلکہ مختلف مرحلوں سے گزرتے ہوئے اس کی کچھ نہ کچھ دیکھ بھال بھی ہوتی رہنی چاہیے۔مثلاً ایمپائر کے مطابق اگر کسی کی ٹانگ ''ٹوٹ'' گئی ہے تو وہ خود تو نہیں چل سکے گا' اسے زخمی ہونے کی جگہ سے ہی سٹریچر پر لانا پڑے گا۔کمپنی ایڈ پوسٹ پر بس تھوڑی سی سہولت موجود ہوتی ہے' وہاں زخمی کا زخم صاف کر کے پٹی لپیٹ دی جاتی ہے۔درد کم کرنے کا ٹیکہ لگایا جاتا ہے۔اگر اب بھی خون بہہ رہا ہو تو اسے روکنے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ٹورنی کیٹ کو کو زیادہ دیر ہوگئی ہو تو کھول کر دوبارہ باندھا جاتا ہے (موقع پر موجود ایمپائر نرسنگ سٹاف سے سوالات کر کے تسلی

کرتا ہے کہ انہیں تمام طریق کار سے واقفیت ہے یا نہیں) غرض ضروری خاطر مدارات کے بعد زخمی کو پیچھے روانہ کر دیا جاتا ہے۔ ایڈوانس ڈریسنگ سٹیشن یا مین ڈریسنگ سٹیشن پر پہنچتے ہی ایمپائر کی طرف سے دی گئی چٹ چیک کی جاتی ہے کہ آنے والا فرد کس وقت زخمی ہوا تھا اور آیا اس جگہ تک پہنچتے پہنچتے اس کا اتنا خون تو نہیں بہہ گیا کہ اس کا جانبر ہونا مشکل ہو۔

اب دیکھئے ''شہید'' ہونے والوں کے بارے میں کاروائی۔۔۔۔۔۔

جنگ کی شکل میں تو یہ ہوتا ہے کہ جب یونٹ کے کچھ افراد شہید ہو جاتے ہیں تو فوری طور پر بریگیڈ یا فارمیشن ہیڈکوارٹر کو اطلاع دی جاتی ہے۔فارمیشن ہیڈکوارٹر کے پاس افرادی قوت موجود ہو تو اس یونٹ کی کمی پوری کر دی جاتی ہے یا وہ متعلقہ سنٹر کو لکھتے ہیں کہ اتنے افراد فوری طور پر اس طرف روانہ کریں۔اس تمام کارروائی میں وقت لگتا ہے۔اسی وقت کے اندازے کے مطابق ایمپائر ''شہیدوں'' کو جلا بخشتے ہیں یعنی اتنی دیر بعد' جتنی دیر میں فارمیشن ہیڈکوارٹر سے کمک پہنچ سکے' شہیدوں کو پھر سے زندہ قرار دے دیا جاتا ہے۔اس دوران ''شہید'' کھاتے پیتے رہتے ہیں لیکن جس جھڑپ' لڑائی یا معرکے میں انہیں شہید قرار دیا گیا ہو اس میں وہ قطعاً حصہ نہیں لیتے۔ایسا بھی ہوا کہ ایک گاڑی ریت میں پھنس گئی' اسے نکالنے کے لیے ڈرائیور اور اس کا معاون زور لگا رہے ہیں۔اسی گاڑی میں لے جائے جانے والے ''شہید'' دانت نکال رہے ہیں لیکن ایمپائر موجود ہے وہ گاڑی نکالنے میں کوئی مدد نہیں کریں گے۔ تاوقتیکہ ایمپائر انہیں زندہ قرار نہ دے دے۔

اس سلسلے میں ہمارے صحافی بھائیوں کو بعض اوقات بڑے تلخ تجربے بھی ہوئے۔مختار حسن مرحوم بڑے سیماب صفت اور زندہ دل آدمی تھے۔ضرب مومن کی مشق کے دوران وہ ایک بریگیڈ کے ساتھ پیش قدمی کر رہے تھے۔پورے دن کے اعصاب شکن سفر کے بعد وہ ایک پل پر پہنچے۔انہیں بتایا گیا کہ پل کے پار ان کا ایڈوانس رک جائے گا اور دستوں کو تازہ دم ہونے کا موقع دیا جائے گا۔مختار صاحب کو چائے کی سخت طلب تھی۔انہوں نے دیکھا کہ پل کے پار ایک طرف ایک چھوٹا سا خستہ حال ہوٹل ہے' انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ہوٹل میں جا کر چائے پئیں لیکن جب وہ پل پر پہنچے تو انہیں بتایا گیا کہ فوکس لینڈ کے دستے پسپا ہوتے ہوئے پل کو ''تباہ'' کر گئے ہیں اس لیے وہ پل کراس نہیں کر سکتے۔مختار صاحب نے جو فوجی وردی میں ملبوس تھے' بتایا کہ وہ پکے فوجی نہیں ہیں' صحافی ہیں انہیں پل پار کرنے دیا جائے لیکن سنتری بدتمیزی پر اتر آیا اور اس نے ان کی راہ روک دی۔مختار صاحب نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔قریب سے ایک صوبیدار گزر رہے تھے' انہوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ سنتری کو سمجھائیں۔

''سر! میں تو کل کا ''شہید'' ہو چکا ہوں میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' صوبیدار صاحب نے عاجزی سے جواب دیا۔

گھنٹوں میں عارضی پل تیار ہوا۔ اس دوران ان کے بریگیڈ نے چائے تیار کی اور انہیں پیش کی لیکن ان کا دل ہوٹل کی چینکوں میں اٹکا رہا۔ پل تیار ہوا تو مختار صاحب کو یہ اعزاز بخشا گیا کہ سب سے پہلے وہ پل کراس کریں۔ مختار صاحب سیدھے ہوٹل گئے اور چائے پی کر چھوڑی۔ مختار صاحب کے جسم میں پارہ بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک منٹ کے لیے بھی ساکن نہ ہوتے تھے۔ زندگی کے آخری دنوں میں دل کے مریض ہونے کے باوجود سینکڑوں میل کا سفر طے کرتے۔ یوں بھی ہوا کہ گاڑی پر گھر سے نکلے۔ اسلام آباد جانے کے لئے انہیں کوئی کام یاد آیا اور وہ ملتان کے لیے روانہ ہو گئے۔ لاہور سے گھر فون کیا۔ ''میں ذرا ملتان جا رہا ہوں' صبح تک واپس آ جاؤں گا۔'' ایسے سیماب صفت آدمی کو ایک پل پار کرنے کے لیے اتنے طویل انتظار کی زحمت اٹھانی پڑے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان پر کیا گزری ہو گی۔

ضرب مومن مشق کے دوران صحافیوں کے ساتھ اور بھی بڑے لطیفے ہوئے۔ تمام صحافیوں کو وردیاں 'جیکٹیں' جوتے اور سلیپنگ سوٹ وغیرہ ایشو کئے گئے تھے اور وہ وردیوں ہی میں ملبوس رہتے تھے۔ بہت سے صحافی تو مختلف یونٹوں اور فارمیشن ہیڈ کوارٹروں کے ساتھ منسلک کئے گئے تھے لیکن ایک سنٹرل میڈیا ٹیم بھی ترتیب دی گئی تھی جو سینئر صحافیوں پر مشتمل تھی۔ یہ ٹیم ہمارے ذمے تھی جسے لے کر ہم صبح سویرے میدان جنگ میں نکل جاتے اور مختلف محاذوں پر گھومتے پھرتے۔ ایک شام باوثوق ذرائع سے اطلاع ملی کہ بلیو لینڈ کا فلاں بریگیڈ پیش قدمی کرتے ہوئے رنگ پور کینال تک پہنچ جائے گا اور امکان ہے کہ پہلے سے موجود پل کو فوکس لینڈ والے ''تباہ'' کر جائیں گے اور بلیو لینڈ کو رات کی تاریکی میں نیا پل بنانا پڑے گا۔ بڑا مزہ آئے گا۔ ہم نے سنٹرل میڈیا ٹیم کے ارکان سے بات کی۔ سب چلنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ ہم نے انہیں بریف کیا کہ راستے میں کوئی روکے تو آپ نے یہی کہنا ہے کہ ہم بلیو لینڈ کے سپاہی ہیں۔

دسمبر کی سرد اور اندھیری رات میں ایک ٹرک میں سفر کرتے ہوئے ہم اس جگہ پہنچے جہاں ہماری اطلاع کے مطابق بلیو لینڈ کا ایک بریگیڈ ہونا چاہیے تھا لیکن اس کا دور دور کچھ پتہ نہ تھا۔ ہم نہر کے ساتھ ساتھ جانے والے کچے رستے پر اتر گئے۔ چونکہ عین حالت جنگ میں تھے اس لیے بڑی روشنیاں بجھا رکھی تھیں اور چھوٹی روشنیوں میں سفر جاری تھا۔ اچانک درختوں کے جھنڈ سے کچھ ہیولے نمودار ہوئے۔ کسی نے ٹارچ کی لائٹ بار بار جلا بجھا کر ٹرک کو روکنے کا اشارہ کیا۔ ہم رک گئے۔ ایک فوجی ہمارے قریب آیا اور پوچھا

------کون؟

ہم نے بتایا کہ بلیو لینڈ کے افسر ہیں۔ اس نے شور مچا دیا۔------دشمن' دشمن۔

باقی فوجیوں نے ہمارے ڈرائیور کو قابو کر لیا' بتیاں بجھا دیں اور ٹرک کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ہمیں سختی سے نیچے اترنے کو کہا گیا۔ ہمیں فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ علاقہ ابھی تک فوکس لینڈ کے ''قبضے'' میں ہے اور بلیو لینڈ والے ابھی تک یہاں نہیں پہنچ سکے۔ ہمارے شناختی کارڈ فوکس لینڈ اور بلیو لینڈ سے بالکل الگ تھے۔ گویا ہماری حیثیت غیر جانبدار مبصروں کی سی تھی لیکن سوال جواب سے بچنے کے لیے علاقے کے لحاظ سے ہم بلیو لینڈ یا فوکس لینڈ کے سپاہی بن جاتے۔ لیکن آج معاملہ الٹ ہو گیا تھا۔ ہمیں نیچے اتارا گیا اور پوچھ گچھ شروع ہوئی تو ہم نے پینترا بدل لیا اور کہا کہ ہم فوکس لینڈ کے ہیں۔ سپاہیوں نے بڑا شور مچایا کہ سر ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ آپ بلیو لینڈ کے ہیں۔ ایک حوالدار نے انہیں کہا کہ وہ ہمیں نرغے میں لیے رکھیں اور خود پیچھے جا کر سٹین گنیں چھپائے ٹرک میں چڑھ گیا۔ پہلے اس نے تمام فوجیوں کو ہینڈز اپ کرایا پھر پوچھا کہ ان کا تعلق کس سے ہے۔

''بلیو لینڈ سے'' سب نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر میں تمام فوجیوں کو نیچے اتار لیا گیا اور حکم دیا گیا کہ سب ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں۔ سہمے سہمے صحافی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ کسی نے مجھے کہا بھی کہ ''سر انہیں سمجھائیں کہ ہم صحافی ہیں' تمیز سے بات کریں۔'' ہم نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا کہ فوکس لینڈ کے سپاہی اکٹھے دس جنگی قیدی افسر سمیت پکڑنے میں کامیاب ہوئے ہیں' خوشی سے پھولے نہیں سما رہے ہیں۔ ہم اچانک ان کی خوشیوں پر پانی پھیر دیتے تو وہ غصے میں آ کر کچھ بھی کر سکتے تھے۔ خاموشی ہی میں عافیت تھی۔ انہوں نے ہمیں قطار میں کھڑا کر کے ٹرک کی چھوٹی روشنیاں جلوائیں اور ایک ایک کو شناختی کارڈ کے ساتھ آگے آنے کو کہا۔ سب سے پہلے ہماری باری تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہمیں ضرب مومن میں بالکل آخر میں شامل کیا گیا تھا۔ بلکہ مشق شروع ہو چکی تھی اور ہم ابھی راولپنڈی ہی میں تشریف فرما تھے۔ غالباً تیسرے دن ہمیں کسی کام سے سرگودھا طلب کیا گیا تھا۔ ہماری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ''میدان جنگ'' سے جلد واپسی نہ ہو سکے گی۔ اس لیے ہم تیار ہو کر گئے تھے اور جو تیاریاں ہم نے کی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ صحافیوں کے لیے جو خصوصی شناختی کارڈ تیار کئے گئے تھے انہیں میں سے ایک کارڈ لے کر اس پر اپنی تصویر چسپاں فرمائی اور چونکہ شناختی کارڈ جاری کرنے والا افسر بھی محاذ پر جا چکا تھا' ہم نے خود ہی دستخط کئے اور محاذ پر پہنچ گئے۔ الحمدللہ کتابوں کے حوالے سے فوج میں کچھ لوگ ہمیں جانتے ہیں۔ کہیں کہیں اکا دکا شاگرد بھی مل جاتے ہیں۔ اب تک گزارہ ہوتا آیا تھا لیکن آج مشکل میں پھنس گئے۔ فوکس لینڈ کے فوجیوں نے ہمارے کارڈ کو جعلی قرار دے کر ہمیں ایک طرف کھڑا کر دیا۔ صحافی اور سہم گئے کہ اچھے بھلے افسر کے کارڈ کو جعلی قرار دے دیا گیا ہے تو ہمارا کیا بنے گا۔ دوسرے فوجی کو آگے آنے کو کہا۔ یہ ''نیوز'' کے موجودہ ایڈیٹر ایم اے نیازی تھے جو اس وقت نیشن میں کام

کرتے تھے۔ (یہ کاپی پریس جانے کے وقت وہ نیوز بھی چھوڑ چکے ہیں' عجب سیلانی آدمی ہے) نیازی صاحب نے اپنی شناخت کروانے کی بجائے ہماری وکالت کرنی شروع کر دی لیکن انہیں سختی سے کہا گیا کہ وہ اپنی بات کریں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ سنٹرل میڈیا ٹیم کے رکن ہیں اور ان کا تعلق ''نیشن'' سے ہے۔

''کس نیشن سے۔۔۔۔۔۔۔ بلیولینڈ سے یا فوکس لینڈ سے؟''

''بلیولینڈ سے'' نیازی صاحب نے ہماری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے رکتے رکتے کہا۔

''جسوس' جسوس'' ایک فوجی نے نعرہ لگایا اور ہماری ہنسی چھوٹ گئی۔

ہم نے صحافیوں کو سمجھایا کہ ہمارا پالا فوجیوں سے آ پڑا ہے' ان سے بحث لاحاصل ہے۔ انہیں اپنی کارروائی پوری کرنے دیں جب تک کسی افسر کے سامنے ''پیشی'' نہیں ہو جاتی' نجات کی کوئی صورت نہ تھی۔ تانی ہوئی سٹین گنوں کے نرغے میں ہمیں دوبارہ ٹرک پر سوار کروایا گیا اور تھوڑی دیر میں درختوں کے ایک جھنڈ میں قائم ایک کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ جس افسر کے سامنے ہمیں پیش کیا گیا' حسن اتفاق سے وہ ہمارے جاننے والے تھے لیکن یہ واقفیت صرف افسری تسلیم کروانے کے کام آئی۔ جنگی قیدیوں سے ہاتھ دھونے کے لیے وہ قطعاً تیار نہ تھے۔ لیکن افسری کی اصلیت ماننے کے بعد وہ باقی بات کیسے نہ مانتے۔ تھوڑی سی بحث کے بعد انہوں نے نہ صرف ہمیں ''رہا'' کر دیا بلکہ گرم گرم چائے بھی پلوائی۔

قید سے چھوٹ کر طویل سفر کے بعد ہم واپس کیمپ پہنچے تو صبح کا اجالا پھیل رہا تھا۔ اس دن صحافیوں نے جو خبریں بھجوائیں وہ اگلے دن اخبارات میں بڑے نمایاں انداز میں شائع ہوئیں۔

''فوکس لینڈ نے صحافیوں کو جنگی قیدی بنا لیا۔''

''غیر جانبدار صحافی فوکس لینڈ کے ہاتھوں گرفتار''

''فوکس لینڈ کے فوجیوں نے صحافیوں پر رائفلیں تان لیں۔''

غرض صحافیوں کی وجہ سے ضرب مومن میں خاصی رونق رہی۔ ایک دفعہ ہم نے تریموں ہیڈورکس کے قریب ایک فیلڈ کیمپ میں پاک فوج کے کوارٹر ماسٹر جنرل کو صحافیوں کے ساتھ ملوایا۔ انہوں نے مشق اور پاک فوج کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے حوالے سے بڑی پر مغز گفتگو کی۔ دوسرے دن ان کا انٹرویو شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا۔ پورے کیمپ میں ان کا انٹرویو موضوع گفتگو بنا ہوا تھا۔ فیلڈ میں ناشتے پر ان کے ہم رتبہ دوست چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھے۔ ہم قریب سے گزرے تو جنرل صاحب نے پکارا۔

''اوئے چھوٹے۔۔۔۔۔۔!'' ہم نے ٹھٹک کر ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اشارے سے قریب بلاتے ہوئے فقرہ مکمل کیا۔

''میں کردیاں گا تیرے ٹوٹے''

ہم سہمے سہمے قریب گئے' ناشتے کی میز پر تازہ اخبارات بکھرے ہوئے تھے جن میں انٹرویو کی سرخیاں نمایاں تھیں۔

''جی سر؟''

''یہ کیا انٹرویو ہے جس میں جنرل صاحب کی تصویر ہی نہیں چھپی۔'' ایک اور جنرل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''سر! یہ کمی پوری کئے دیتے ہیں۔''

''کیسے؟''

''سر! ان کی تصویر آج اخبارات کو جاری کر دیتے ہیں۔ کیپشن میں لکھ دیں گے کہ یہ ہیں وہ جنرل صاحب جن کا انٹرویو کل چھپا تھا۔''

''لیکن۔۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔۔۔ میں نے تو کوئی انٹرویو نہیں دیا۔'' کوارٹر ماسٹر جنرل نے موقع ملتے ہی وضاحت کی۔

''سر! میں نے خود آپ کو صحافیوں کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا۔'' ان کے ایک ساتھی جنرل نے کہا۔

''وہ تو میں یونہی گپ شپ لگا رہا تھا۔''

''سر! اخباری زبان میں اسے انٹرویو ہی کہتے ہیں۔'' ہم نے وضاحت کی۔

ایک اور جنرل نے نصیحت کی۔ ''سر! آپ کو نہیں پتہ' صحافی بالکل کھلے پھر رہے ہیں۔ پورا میدان جنگ ان سے اٹا پڑا ہے۔ آپ کو محتاط رہنا چاہیے تھا۔''

ضرب مومن پر گفتگو ائیر فورس کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گی۔

بمباری نہ کرنے کے باوجود جب جنگی جہاز مشق میں حصہ لیتے تو ان کی کارکردگی کا اندازہ کیوں کر لگایا جاتا ہے۔ یہ بات سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ بمباری سے پہلے اصل بات یہ ہے کہ جہاز ٹھیک اس جگہ پہنچ جائے جہاں اس کی ضرورت ہے اور اس ٹارگٹ کو سمجھ لے جس اسے بم گرانا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ پیش قدمی کرتے ہوئے دستے جب کسی ایسی شدید مزاحمت سے دوچار ہو جائیں کہ ان کی کوئی پیش نہ چلے تو وہ فضائی کمک (Close Air Support) کی درخواست کرتے ہیں۔ یہ درخواست بریگیڈ اور ڈویژن سے ہوتی ہوئی کور ہیڈ کوارٹر تک پہنچتی ہے۔ وہاں ایسی دوسری درخواستیں بھی موجود ہوتی ہیں۔ مجموعی صورت حال کا جائزہ لے کر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ کس سیکٹر میں فضائی کمک مہیا کی جائے۔ یہ فیصلہ فضائیہ کے متعلقہ اڈے تک پہنچایا جاتا ہے جہاں سے پائلٹ یا

پائلٹوں کونقشوں پر بریفنگ دے کر متعلقہ سیکٹر میں بھیج دیا جاتا ہے۔اب سینکڑوں میل دور سے اڑنے والے پائلٹ کے لیے یہ قطعی ممکن نہیں کہ وہ سیدھا ٹھیک اسی جگہ پہنچ جائے جہاں اس کی ضرورت ہے۔اس کے لیے ایک طریق کار ہے اور مشق کے دوران اسی طریق کار کا امتحان ہوتا ہے کہ کمک کی درخواست کے بعد کتنی جلدی جہاز متعلقہ جگہ پر پہنچتا ہے۔ پائلٹ کی رہنمائی ڈویژن یا برگیڈ کی سطح پر ہوتی ہے۔نقشوں کی مدد سے جہاز متعلقہ سیکٹر میں تو پہنچ جاتا ہے پھر اس کی رہنمائی کا فریضہ زمین پر موجود ائیر فورس کا کوئی افسر یا بری فوج کا اس معاملے میں تربیت یافتہ کوئی افسر کرتا ہے۔اس کی ٹیم فارورڈ ائیر کنٹرول ٹیم (FACT) کہلاتی ہے جو افسر وائرلیس کی مدد سے ایک متعین طریق کار کے ذریعے زمین پر موجود نشانات جیسے نہر' درختوں کے کسی جھنڈ' گاؤں کی عمارت یا کسی کھمبے وغیرہ کے حوالے سے پائلٹ کو ٹھیک وہ جگہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے جہاں دشمن کی کسی مشین گن کا مورچہ ہو یا جہاں سے مزاحمت ہو رہی ہو۔ ٹارگٹ کے بعد جہاز اس کے اوپر غوطہ لگاتا ہے اور اوپر اٹھ جاتا ہے۔اب اگر وہ بم نہ بھی گرائے تو اس پورے طریق کار کا امتحان تو ہو گیا جس سے گزر کر جہاز اپنے ٹارگٹ تک پہنچتا ہے۔

یہ سب طریق کار اپنی جگہ' ضرب مومن کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے پاک فوج کو ایک نیا اعتماد' نیا حوصلہ اور نیا عزم عطا کیا ہے۔فوج کے لیے اصل چیز فولادی عزائم ہی ہوتے ہیں۔ جب ٹینک رک جائے' توپ ناکارہ ہو جائے اور مشین گن خاموش ہو جائے تو دلوں کی دھڑکنیں جاری رہنی چاہئیں کہ فتح و شکست کا انحصار ساز و سامان پر نہیں' انسان کے عزم اور اس کے اس ایمان پر ہوتا ہے جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

◆◆◆

میرا نشانہ' دیکھے زمانہ............

(ایک قومی شوٹنگ چیمپئن شپ کا آنکھوں دیکھا حال)

ہم جب فوج میں شامل ہوئے تو شہروں میں اسلحہ اور فائرنگ اتنی عام نہیں تھی جتنی آج کل نظر آتی ہے۔رت بدلنے پر لاہور کا آسمان افق تا افق' ننھی منی گڈیوں' رنگ برنگے گڈوں' باوقار پھیپھڑوں' سدھ پتنگوں اور چست تکلوں سے بھر جاتا تھا اور اقبال کی زبان میں

نیلے نیلے' اودے اودے' پیلے پیلے پیرہن

کی تصویر بنا نظر آتا تھا۔تھوڑی تھوڑی دیر بعد کبھی اس منڈیر سے ''آئی بو'' کی صدا سنائی دیتی تو کبھی اس چھت سے ''بوکاٹا'' کے نعرے بلند ہوتے۔صوتی اثرات بڑھانے کے لیے بہت ہوا تو ڈھولک یا ٹین کے ڈبے بجائے جاتے۔کلاشنکوف یا اس جیسے آتشیں اور مہلک ہتھیاروں کی تڑتڑ کسی طور ان صداؤں میں شامل نہیں تھی۔ان دنوں تو حال یہ تھا کہ گلی محلوں میں کوئی چاقو بھی لہرا دیتا تو بڑی واردات کہلاتی۔ محلے کے بڑے' رفع شر کے لیے حرکت میں آ جاتے۔گراری والے چاقو کی دہشت تو اور بھی سوا ہوتی تھی۔

اس پس منظر کے ساتھ جب ہم پی ایم اے پہنچے اور ابتدائی تربیت کی تکمیل پر وہ مرحلہ آیا کہ ہمارے ساتھیوں میں کوئی ڈمی نہیں بلکہ سچ مچ کی باوقار جی تھری رائفل تھمادی گئی تو جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔سینہ فخر سے تن گیا اور ہم نے خود کو اس دن پکا فوجی محسوس کیا۔ یہ الگ بات کہ باقی عارضی دنیا کی طرح پی ایم اے کی خوشیاں بھی لمحاتی ہوتی ہیں۔ڈرل انسٹرکٹر نے اسے تھامنے کے طریقے کیا بتانے شروع کئے کہ ظلم و ستم کی ایک نئی داستان کا آغاز ہو گیا۔خیال تھا کہ ہتھیاروں کی سکھلائی کے پیریڈ میں ہمیں اس کا مناسب استعمال یعنی فائرنگ سکھائی جائے گی' لیکن وہاں بھی انسٹرکٹروں نے گراؤنڈ شیٹ نکلوائی۔ زمین پر بچھائی اور رائفل کھلونے جوڑنے کے طریقے سکھانے شروع کر دیئے۔غرض خدا خدا کر کے وہ دن آیا جب ہمیں یہ مژدہ جانفزا سنایا گیا کہ کل ہمیں فائرنگ رینج پر لے جایا جائے گا۔

پوری فوج میں فائرنگ کی ابتدائی مشق سو گز کے فاصلے سے ہوتی ہے۔فائرنگ پوائنٹ پر گراؤنڈ شیٹ بچھا دی جاتی ہے (مقصد جس کا فائرر کو آرام پہنچانا نہیں بلکہ رائفل کو گرد آلود ہونے سے بچانا ہوتا ہے) شیٹ کے آگے ریت کی ایک بوری پڑی ہوتی ہے۔

فائرشیٹ پر لیٹ کر بایاں ہاتھ ریت کی بوری پر رکھتے ہوئے رائفل کو تھامتا اور شست لے کر فائر کرتا ہے۔ اس کا ایک ساتھی اپنا سٹیل ہیلمٹ رائفل کے اس چیمبر کے بالمقابل رکھتا ہے جہاں سے کارتوس کا کھوکھا تڑک کر باہر نکلتا ہے۔ اگر کھوکھا ہیلمٹ میں نہ آئے تو گزوں دور جا گرتا ہے۔ اور فائرنگ کے بعد اس کی باقاعدہ تلاش ہوتی ہے۔ (جی ہاں' یہ کفایت شعاری ہے۔ یہ کھوکھا پیتل کا ہوتا ہے اور اسے بیچ کر یونٹ کی کئی چھوٹی موٹی ضروریات پوری کی جاتی ہیں) شست لیتے ہوئے ایک آنکھ بند کرنا پڑتی ہے۔ کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی ایک آنکھ بند نہیں ہوتی' چنانچہ وہ ایک آنکھ پر رومال باندھ لیتے ہیں۔ ٹارگٹ چار مربع فٹ کے قریب ہوتا ہے جس کے عین درمیان سیاہ رنگ کی آنکھ سی بنی ہوتی ہے جسے Bull's Eye کہتے ہیں۔ ہر فائرر کو پانچ گولیاں ملتی ہیں۔ اگر فائرر سیاہ آنکھ کے اردگرد چار انچ کے اندر اندر پانچوں گولیاں فائر کر دے تو اسے پورے نمبر ملتے ہیں۔ ان کا پھیلاؤ جتنا بڑھتا جاتا ہے' نمبر کم ہوتے جاتے ہیں۔ اگر ایک گولی بھی ٹارگٹ سے باہر چلی جائے یعنی چار مربع فٹ کے ٹارگٹ پر نہ لگے تو فائرر واش آؤٹ (Wash Out) کہلاتا ہے۔ اور اسے نمبر تو کوئی نہیں ملتا البتہ انسٹرکٹروں کی طرف سے ''بہت کچھ'' ملتا ہے۔ زبانی ڈانٹ ڈپٹ میں قوم کی خون پسینے کی کمائی ضائع کرنے پر فائرر کی سرزنش بھی ہوتی ہے' دفاع بجٹ کے حوالے سے بھی اور بین الاقوامی معاملات میں فوج کے کردار پر بحث وغیرہ بھی۔

ٹارگٹ کی چیکنگ کا طریقہ یہ تھا (بلکہ ابھی تک رائج ہے) کہ رائفل کو خالی کرنے اور اس کے تفصیلی معائنے کے بعد اسے زمین پر رکھا جاتا ہے اور فائرر بھاگتے ہوئے ٹارگٹ تک پہنچتا ہے' فائرر اپنے اپنے ٹارگٹ کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کی فائرنگ کا نتیجہ صورت یا شامت اعمال اس کے سامنے ہوتا ہے۔ کوئی افسر ایک طرف سے ٹارگٹ چیک کرنا شروع کرتا اور نتیجہ نوٹ کر کے فائرر کو واپس جانے کا حکم دیتا ہے۔ پھر بٹ پارٹی جو ٹارگٹ کے نیچے زمین دوز مورچوں میں چھپی ہوتی' برآمد ہوتی اور کاغذ کے ٹکڑوں اور لئی کی مدد سے ان سوراخوں کو بند کرتی جو گولیوں سے ٹارگٹ پر پڑے ہوتے۔ ٹارگٹوں کی مرمت مکمل ہوتی' تو بٹ پارٹی پھر مورچوں میں گھس جاتی اور بذریعہ فون فائرنگ پوائنٹ پر اطلاع دی جاتی کہ

جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

(یہاں دل ٹارگٹ کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے)

ہم نے یہاں تک جو کچھ لکھا' اس میں سویلین قارئین کے لیے تو شاید کوئی نئی بات ہو لیکن فوجی قارئین یقیناً جز بز ہو رہے ہوں گے کہ آخر اس میں ایسی کیا بات ہے جس پر اتنا طویل مضمون باندھا جا رہا ہے تو حضرات گرامی یہ سب کچھ اس لیے لکھا گیا ہے کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ مستقبل میں کوئی فائرنگ رینج رہائشی یا تعمیراتی سکیموں سے محفوظ رہ گئی تو اس مضمون کی مدد سے یہ

سمجھا جا سکے کہ ماضی میں اس کا استعمال کیا تھا۔ ہمیں تو یوں لگتا ہے کہ علامہ اقبال نے مستقبل میں جھانک کر جو پیشین گوئیاں کی تھیں ان میں فائرنگ کے طریقوں اور ٹارگٹوں میں ہونے والی تبدیلیاں شامل تھیں۔ انہی کے بارے میں فرمایا تھا۔

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

روایتی فائرنگ کے رینج قصہ پارینہ بننے والے ہیں۔ اس کے آثار گزشتہ دنوں دیکھنے میں آئے۔

بات ہے جہلم کی جہاں ساتویں قومی شوٹنگ چیمپئن شپ منعقد ہو رہی تھی۔ ہم فائرنگ کو صرف فوجیوں کے لیے مخصوص سمجھتے تھے اور فوجیوں کی ایک اپنی وضع قطع ہوتی ہے۔ وہ کسی لباس میں بھی ہوں الگ ہی پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں ہم نے دیکھا کہ بہت سے افراد جن کے بال بڑھے ہوئے جسم ڈھلکے ہوئے اور لباس رنگ برنگے تھے' رائفلیں اٹھائے پھرتے تھے۔ وہ تو بھلا ہوا ایک سپانسر کرنے والے بنک کا جس نے اکثریت کو ٹریک سوٹ مہیا کر دیئے تھے ورنہ پوری رینج پر بسنت کے رنگ بکھرے نظر آتے۔ کسی نے بتایا کہ بھائی یہ آرمی کی شوٹنگ نہیں بلکہ قومی شوٹنگ چیمپئن شپ ہے جس میں مسلح افواج کے علاوہ چاروں صوبوں' ریلوے' بنکوں اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی ٹیمیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ اور شوٹنگ پر کچھ فوج ہی کی اجارہ داری نہیں۔

ہم کچھ سمجھے کچھ نہ سمجھے اور چپ چاپ اس تقریب میں شامل ہو گئے جو اس قومی شوٹنگ چیمپئن شپ کے افتتاح کے حوالے سے برپا تھی۔ اسٹیج پر کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل ہمایوں خان بنگش براجمان تھے جو بربنائے عہدہ نیشنلز رائفلز ایسوسی ایشن آف پاکستان (NRAP) کے صدر ہیں۔ ان کے ساتھ تشریف فرما تھے' جناب خالد جاوید جو نراپ کے نائب صدر ہیں۔ خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے انہوں نے شوٹنگ گیم کے بارے میں بتایا کہ بین الاقوامی سطح پر یہ بہت مقبول ہو رہی ہے اور ہمارے پڑوسی ممالک میں سینکڑوں کلب قائم ہیں لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے ہمارے ملک میں یہ بالکل ابتدائی مراحل میں ہے۔ انہوں نے بتایا کہ پچھلے دو برصغیر مقابلوں میں پاکستان نے چند چھوٹی چھوٹی کامیابیاں حاصل تو کی ہیں لیکن آنے والے دنوں میں بین الاقوامی معیار تک پہنچنے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

لیفٹیننٹ جنرل ہمایوں بنگش نے چیمپئن شپ کے افتتاح کا اعلان کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ ان مقابلوں کا انعقاد مسلح افراد اور نشانہ بازی کی سول تنظیموں کو آپس میں مل بیٹھنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ باہمی رشتوں کو بھی مضبوط بنانے کا باعث بنے گا۔

اس مختصری تقریب کے بعد چائے کا وقفہ ہوا۔ ذہن میں بہت سے سوالات اٹھ رہے تھے۔ جو ایک دو جونیئر افسر ہمارے

سوالوں کے جواب دے سکتے تھے' سینئر افسروں کے اردگرد ان کی گردش طواف بہت تیز تھی۔ قہر درویش بر جان درویش ہم خود ہی چیمپئن شپ کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے چل نکلے۔ پاکستان میں پہلا موقع تھا کہ چیمپئن شپ بین الاقوامی معیار کے رینج پر منعقد ہو رہی تھی جن کی تعمیر کا سہرا پاکستان آرمی رائفلز ایسوسی ایشن کے سر ہے۔ چیمپئن شپ میں ایمپائرنگ کا معیار بھی بین الاقوامی رکھا گیا تھا۔ اب شوٹنگ یا فائرنگ کے حوالے سے ہم بجا طور پر فائرنگ رینج کی تلاش میں تھے لیکن رینج کے نام پر جس عمارت کی طرف ہماری رہنمائی کی گئی وہ رینج کم اور سینما ہال زیادہ لگتا تھا۔ اندر جا کر بھی جو صورت حال نظر آئی' وہ کسی سینما ہال ہی سے مشابہ تھی۔

روایتی رینجز کا فائرنگ پوائنٹ تین گیلریوں میں منقسم تھا۔ سب سے آگے شوٹرز گیلری میں قریب قریب شوٹنگ پوائنٹ تھے۔ سیمنٹ اور بجری کے بنے ہوئے زمین سے ذرا بلند پلیٹ فارم' جن پر کھردری گراؤنڈ شیٹ کی جگہ نرم و ملائم فوم کی شیٹیں بچھی تھیں۔ کسی غیر متعلقہ فرد کو یہاں آنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ گویا فائرنگ پوائنٹ نہ ہوا۔ جین فونڈا کا بیڈ روم ہو گیا۔ ٹارگٹ کو جانچنے کے لیے ہر شوٹر کے قریب ایک دوربین پڑی تھی۔ جو شوٹر آنکھ بند نہ کر سکے اس کے لیے ایسی عینکیں مہیا تھیں جن کی ایک آنکھ کھلی اور دوسری پر گہرا سیاہ شیشہ تھا اور جس کی سماعت پر فائر کا شور گراں گزرے اس کے لیے ائیر مف (Air Muff) مہیا تھے۔ یوں بہزار ناز و بصد ادا' جب کوئی شوٹر فائر کرتا تو بجائے ٹارگٹ تک جا کر اس کا معائنہ کرنے کے' بس ذرا گردن موڑ کر دوربین ہی سے اس کا جائزہ لے لیتا۔ ٹارگٹ نہ ہوا تصویر یار ہو گئی۔

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

شوٹرز کے پیچھے بیٹھے ہوئے سکورر بھی دوربین سے ٹارگٹ کا جائزہ لیتے اور اوپر ٹنگے ہوئے سکور بورڈ پر فائرر کا سکور درج کر دیتے۔ پیچھے بیٹھے ہوئے تماشائیوں کو یہ سکور بورڈ صاف نظر آتے اور وہ باآسانی اندازہ کر سکتے تھے کہ کس فائرر نے کتنی گولیاں فائر کی ہیں۔ اور پر ان کا رزلٹ کیا رہا۔

اب ٹارگٹ کی سنئے۔ ان کا فاصلہ بھی سمٹ گیا ہے اور خود ٹارگٹ بھی۔ یعنی فاصلہ تو سو گز سے کم ہو کر پچاس میٹر رہ گیا ہے جبکہ 4x4 مربع فٹ کے ٹارگٹ کا جانشین اب سینٹی میٹر میں ماپا جاتا ہے۔ یہ اہم مرکز دس دائروں پر مشتمل ہے۔ سب سے اندر والے دائرے کا قطر بمشکل ایک سنٹی میٹر ہوتا ہے۔ پھر ایک سنٹی میٹر سے بھی کم فاصلے پر دوسرا دائرہ ہوتا ہے' پھر تیسرا۔ سب سے اندر والے دائرہ میں نشانہ لگے تو پورے دس نمبر' اس سے باہر والے کے نو نمبر اور سب سے باہر والے دائرے میں نشانہ لگنے کا ایک نمبر۔ ٹارگٹ کے

یہ ٹارگٹ آٹومیٹک ٹارگٹ چینج مشینوں میں بھر دیئے جاتے ہیں۔ شوٹر فائر کر کے ٹارگٹ کا جائزہ لیتا اور اپنے پاس رکھے ریموٹ کنٹرول کا بٹن دباتا۔ زخمی ٹارگٹ نیچے چلا جاتا اور اوپر سے نیا ٹارگٹ فائرر کے سامنے آ جاتا۔ فائرنگ شروع ہونے سے پہلے جب ہم ان ٹارگٹوں کا معائنہ کر رہے تھے تو کیمرہ مین ندیم نے پوچھا کہ "سر! جو گولی ٹارگٹ پر نہیں لگتی اسے مشین پر لگنا چاہیے لیکن مشینوں پر ایک نشان بھی نہیں۔

"نئی مشینیں ہیں نا' آج پہلی مرتبہ استعمال ہو رہی ہیں۔" ہم نے ندیم کو تسلی کر دی۔ اس جواب میں یہ امکان پنہاں تھا کہ گولیاں اس ننھے منے ٹارگٹ سے ضرور باہر جائیں گی۔ جو چند سینٹی میٹروں پر مشتمل تھا۔ لیکن جب فائرنگ شروع ہوئی تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب دیکھا کہ زیادہ تر شوٹر ننھے منے ٹارگٹ کے عین درمیان والے دائرے میں نشانے لگا رہے تھے۔ کل ساٹھ راؤنڈ فائر کرنے تھے۔ سال بور انگلش میچ کے اس مقابلے میں پاکستان نیوی کے محمد اختر نے گولڈ میڈل اور کیپٹن ظفر الحق نے کانسی کا تمغہ حاصل کیا۔ مجموعی طور پر آرمی کی ٹیم اول نیوی کی دوم اور صوبہ سندھ کی ٹیم سوئم رہی۔

۲۲۲ رائفل سے تین حالتوں میں یعنی لیٹ کر' کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر فائر کرنا تھا۔ اس مقابلے میں پاکستان آرمی کے کیپٹن ظفر الحق نے نہ صرف گولڈ میڈل حاصل کیا بلکہ ۱۲۰۰ میں سے ۱۰۹۶ پوائنٹ لے کر نیا قومی ریکارڈ بھی قائم کیا۔ پاک آرمی کے سپاہی وسیم سجاد نے سلور میڈل اور نائیک عبدالحمید نے کانسی کا تمغہ حاصل کیا۔ مجموعی طور پر پاکستان آرمی اول' نیوی دوم اور صوبہ سندھ کی ٹیم سوم رہی۔

۲۲۲ رائفل اوپن سائٹ کے مقابلوں میں پاکستان آرمی کے محمد حیات اور طارق محمود نے گولڈ اور سلور میڈل جبکہ صوبہ سندھ کے عامر سعید نے کانسی کا تمغہ حاصل کیا۔ مجموعی طور پر پاکستان آرمی کی ٹیم اول' صوبہ سندھ کی دوم اور پاک بحریہ کی ٹیم سوم رہی۔ ایئر رائفل کے مقابلوں میں پاکستان آرمی کے وسیم سجاد نے گولڈ میڈل' کیپٹن ظفر الحق نے سلور میڈل اور رحمٰن شہزاد نے برونز میڈل حاصل کیا۔ مجموعی طور پر آرمی کی ٹیم اول بحریہ کی دوم اور صوبہ سندھ کی ٹیم سوم رہی۔

پستول کی فائرنگ رائفل سے بھی زیادہ حیران کن تھی۔ یہاں فاصلے اور ٹارگٹ اور بھی سمٹ گئے تھے۔ ٹارگٹ چیک کرنے کے لیے دوربین کی ضرورت بھی نہ پڑتی تھی۔ ٹارگٹ ان ڈوریوں پر سفر کرتا خود چل کر آپ کے پاس حاضر۔ اسے دیکھ کر ہمیں فارسی کا شعر یاد آ گیا۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف
بہ امید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

(یعنی صحرا کے تمام ہرن اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھے اس امید میں ہیں کہ شاید کسی دن وہ شکار کے لیے آ نکلے)

ائیر پسٹل کے مقابلے میں صوبہ سرحد کے ڈاکٹر انعام الحق خان نے گولڈ میڈل جب کہ پاکستان آرمی کے نائیک ساجد اقبال اور نائیک محمد عباس نے سلور اور برونز میڈل حاصل کئے۔ مجموعی طور پر پاکستان آرمی کی ٹیم اول' صوبہ سرحد کی دوم اور بحریہ کی سوم رہی۔

فری پسٹل مقابلوں میں پاکستان آرمی کے ساجد اقبال نے گولڈ میڈل' صوبہ سرحد کے ڈاکٹر انعام اللہ خان نے سلور میڈل اور آرمی کے رستم خان نے برونز میڈل حاصل کیا۔ مجموعی طور پر بری فوج کی ٹیم اول' بحریہ کی دوم اور صوبہ سرحد کی سوم رہی۔

سکیٹ (Skeet) اور ٹریپ (Trap) شوٹنگ سے ملتے جلتے مناظر ہم نے انگریزی فلموں میں تو دیکھے تھے' لیکن براہ راست مشاہدے کا پہلی مرتبہ موقع ملا۔ سکیٹ اصل میں ایک مشین ہے جسے ایک طرح کی چھوٹی منجنیق سمجھ لیجئے۔ سکیٹ رینج کے دونوں جانب کمرے بنے ہوتے ہیں۔ دایاں والا کمرہ گراؤنڈ فلور پر ہوتا ہے جبکہ بائیں طرف والا قدرے بلندی پر ہوتا ہے اور ہائی ہاؤس کہلاتا ہے۔ دونوں گھروں کا درمیانی فاصلہ تقریباً ۳۶ میٹر ہوتا ہے۔ ان کے کوڈ نام مارک (Mark) اور پل (Pull) ہوتے ہیں۔ دونوں گھر میں ایک ایک سکیٹ مشین رکھی ہوتی ہے جو ریموٹ کنٹرول ہوتا ہے۔ شوٹر جب فائرنگ کے لیے تیار ہو تو پکارتا ہے ''مارک'' ریفری نیچی کھڑکی والے گھر میں رکھی سکیٹ مشین کا بٹن دباتا ہے' مشین فائر کرتی ہے اور مٹی کی ایک تھالی زن سے کھڑکی سے نکلتی ہے اور قوس کی شکل میں اڑتی ہوئی دور جا گرتی ہے۔ اسے اصطلاحاً Clay Pigeon کہتے ہیں۔

جب یہ تھالی دونوں گھروں کے درمیان فاصلے میں محو پرواز ہو تو شوٹر کو اس پر فائر کرنا ہوتا ہے۔ اگر نشانہ لگ جائے تو تھالی کے پرخچے اڑ جاتے ہیں' ورنہ وہ صحیح سلامت دور جا گرتی ہے۔ دونوں کھڑکیوں سے ایک ایک شوٹ لینے کے بعد وہ مرحلہ آتا ہے۔ جب دونوں کھڑکیوں سے بیک وقت تھالیاں نکلتی ہیں اور ایک دوسرے کی مخالف سمت میں سفر کرتی ہیں' شوٹر کو اپنی ڈبل بیرل بندوق کے ذریعے دونوں پر فائر کرنا ہوتا ہے۔ جب وہ ایک کو نشانہ بناتا ہے تو دوسری مخالف سمت میں کہیں کی کہیں جا چکی ہوتی ہے۔ لیکن اچھے شوٹر زمین پر گرنے سے پہلے ہی اس کے بھی پرخچے اڑا دیتے ہیں۔

اس مقابلے میں پاک فوج کے لیفٹیننٹ کرنل ناصر الدین نے گولڈ میڈل' صوبہ سندھ کے جناب خرم انعام نے سلور میڈل اور پنجاب کے تہور علی نے کانسی کا تمغہ حاصل کیا۔ ٹیموں کی کارکردگی بھی اسی لحاظ سے رہی۔

ٹریپ شوٹنگ دراصل اس کھیل کی جانشین ہے جس میں پرندوں کو ایک ڈربے میں بند کر دیا جاتا تھا' دروازہ کھول کر ایک یا ایک سے زائد پرندوں کو اڑنے دیا جاتا اور شکاری ان اڑتے ہوئے پرندوں کو نشانہ بناتا۔ اگر یہ مشق ستم پرندوں پر ہی جاری رکھی جاتی تو

آج صفحہ ہستی سے ان کا وجود ناپید ہو چکا ہوتا۔ بھلا ہو سکیٹ مشین ایجاد کرنے والے کا کہ اس کی بدولت پرندوں کی کئی نسلیں بچ گئیں۔ اب ہوتا یوں ہے کہ ایک طویل سے ڈربے میں پانچ چھ سکیٹ مشینیں رکھی ہوتی ہیں جن میں مٹی کی تھالیاں (یعنی Clay Pigeon) بھری ہوتی ہیں' شوٹر کمرے کے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے پیچھے ریفری کھڑا ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں تمام مشینوں کا ریموٹ کنٹرول ہوتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے کسی بھی سکیٹ مشین سے Clay Pigeon کا فائر کرتا ہے۔ شوٹر کو اڑتی ہوئی تھالی پر فائر کرنا ہوتا ہے۔ ان مقابلوں میں صوبہ سندھ کے نوید جویری نے گولڈ میڈل حاصل کیا۔ انہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ کل ۱۲۵ میں سے ۱۰۳ پوائنٹ لے کر انہوں نے ایک نیا قومی ریکارڈ قائم کیا۔ صوبہ سندھ ہی کے محمود سلطان نے سلور میڈل اور پاک فوج کے لیفٹیننٹ کرنل جاوید عمر نے کانسی کا تمغہ حاصل کیا۔ مجموعی طور پر صوبہ سندھ اول' پاک فوج دوئم اور صوبہ بلوچستان کی ٹیم سوئم رہی۔

اس دوران ہم چلتے پھرتے مختلف صوبوں میں رائفلز ایسوی ایشن کے کوائف معلوم کرتے رہے کہ مفاد عامہ کے لیے شائع کئے جا سکیں۔ بلوچستان میں ایسوی ایشن کے سیکرٹری جناب مشاق حسین ہیں۔ کوئٹہ شہر میں شاہین آرمز جناح روڈ پر ان کا دفتر ہے۔ صوبہ سرحد میں اس کے ٹیم کیپٹن ڈاکٹر انعام اللہ خان ہیں جو میونسپل کمیٹی میں ہیلتھ آفیسر ہیں۔ دفتر قلعہ بالا حصار میں قائم ہے۔ صوبہ سندھ میں رائفلز ایسوی ایشن کا دفتر کراچی میں نیشنل اسٹیڈیم کے قریب واقع ہے۔ پرویز عباسی صوبائی معاملات کی دیکھ بھال بھی کرتے ہیں اور پاکستان سطح پر سیکرٹری جنرل بھی ہیں۔ پنجاب میں ایسوی ایشن کے سیکرٹری ڈاکٹر خلیل احمد ہیں' جن کا پتہ یہ ہے۔

96-B عمر دین روڈ' وسن پورہ لاہور۔ 54900

نیشنل شوٹنگ چیمپئن شپ کی اختتامی تقریب رائفل رینج میں منعقد ہوئی۔ گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال (ریٹائرڈ) مہمان خصوصی تھے۔ نیشنل رائفلز ایسوی ایشن آف پاکستان کے سیکرٹری جنرل جناب پرویز عباسی نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے بڑے پتے کی بات کہی۔ ''شوٹنگ ہے تو مہنگا کھیل لیکن بین الاقوامی اور اولمپک مقابلوں میں حصہ لینے والے ممالک کی تعداد کے لحاظ سے یہ تیسرے نمبر پر ہے۔ زیادہ تر ممالک اس میں اس لیے دلچسپی لیتے ہیں کہ مقابلے انفرادی سطح پر ہوتے ہیں۔ اور محض ایک شخص اپنی بہتر کارکردگی کی وجہ سے نہ صرف اپنے لیے گولڈ میڈل حاصل کرتا ہے بلکہ اپنے ملک کے لیے بھی گولڈ میڈل جیت لیتا ہے۔ جب کہ وہ کھیلیں جن میں بارہ سے سولہ افراد کی ایک ٹیم حصہ لیتی ہے نہ صرف کئی دنوں تک جاری رہتے ہیں بلکہ بعض اوقات کسی ایک فرد کی غلطی کا خمیازہ بھی پوری ٹیم کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کئی دنوں کی جدوجہد کے بعد کامیابی ملتی بھی ہے تو مجموعی طور پر ملک کے حصے میں صرف ایک میڈل ہی آتا ہے۔ جبکہ شوٹنگ میں ۸ مقابلے ایسے ہوتے ہیں جن میں کھلاڑی انفرادی طور پر حصہ لیتے ہیں اور اپنے

ملک کے لیے میڈل جیت سکتے ہیں۔

نراپ کے صدر لیفٹیننٹ جنرل ہمایوں خان بنگش نے چیمپئن شپ کے دوران نظم وضبط قائم رکھنے پر شرکاء کو مبارکباد پیش کی اور اس توقع کا اظہار کیا کہ اس طرح کے مقابلوں میں کارکردگی کے نئے معیار قائم ہوں گے۔

مہمان خصوصی گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل محمد اقبال (ریٹائرڈ) نے اپنے خطاب میں زور دیا کہ شوٹنگ کو سکولوں اور کالجوں کی سطح پر بھی متعارف کروایا جائے تاکہ انتخاب کی بنیاد وسیع ہو سکے اور ہمیں اس فیلڈ میں بہتر سے بہتر افراد مل سکیں۔ انہوں نے یقین دلایا کہ وہ اس کھیل کے فروغ کے لیے حتی الوسع تعاون کریں گے۔ انہوں نے مختلف پوزیشن حاصل کرنے والوں میں میڈل بھی تقسیم کیے۔ چیمپئن شپ ٹرافی پاکستان آرمی نے حاصل کی۔ جبکہ صوبہ سندھ کی ٹیم رنرز اپ رہی۔ پاکستان آرمی کے کیپٹن ظفر الحق کو چیمپئن شپ کا بہترین نشانہ باز قرار دیا گیا اور روایتی طور پر انہیں ایک ایسی کرسی پر بٹھایا گیا جس پر افقی طور پر ڈنڈے لگے ہوئے تھے۔ ان کی مدد سے انہیں کندھوں پر اٹھایا گیا۔ چیمپئن شپ کے شرکاء کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ اس جلوس نے پورے پنڈال کا چکر لگایا۔ آگے آگے آرمی بینڈ موسیقی کی دھنیں بکھیر رہا تھا۔ اس خوبصورت روایت کے ساتھ ہی چیمپئن شپ کی تقریبات اختتام کو پہنچیں۔

◆◆◆

فیکا پہلوان + پیجا جراح x آرتھوپیڈک سرجن

(آرمی میڈیکل کالج میں ہونے والے ایک سیمینار کی رپورٹ)

ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جوڑنے اور عمل جراحی کے بارے میں اب تک ہمارا علم "فیکے پہلوان" اور "پیجے جراح" کی ان سرگرمیوں تک محدود تھا جن کا مشاہدہ ہم بچپن میں کرتے رہے تھے۔ فیکے پہلوان کا تھیا' فتے کے تندور کے عین سامنے تھا۔ جبکہ پیجا جراح بڑے بازار میں ایک دکان کا مالک تھا۔ جس کے دروازوں پر شیشے لگے ہوئے تھے اور ماتھے پر ایک بڑا سا بورڈ' جس پر جلی حروف میں لکھا تھا "پیرس ہیئر کٹنگ سیلون" اس بورڈ کے ساتھ ہی ایک چھوٹا بورڈ بھی تھا جس پر یہ عبارت درج تھی۔ "یہاں دیگ پکوائی اور ختنوں کا اعلیٰ انتظام ہے"

فیکا پہلوان ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے جوڑ بٹھانے اور پیجا جراح کچے پھوڑوں کو پکانے اور انہیں چیرا دینے کے لیے مشہور تھا۔

ایک ڈاکٹر کا کلینک بھی موجود تھا' لیکن اس کی شہرت کچھ اتنی اچھی نہ تھی۔ ایک تو اس کا بورڈ انگریزی میں تھا جسے پڑھنے والے محلے میں بہت کم کم تھے۔ دوسرے ایک دو واقعات ایسے ہو چکے تھے جن سے اس ڈاکٹر کی "نالائقی" پر مہر تصدیق ثبت ہو چکی تھی۔ چھیمے حلوائی کا بیٹا جب پتنگ لوٹتے ہوئے چھجے سے گرا تھا تو فیکا پہلوان کسی مریض کو دیکھنے گیا ہوا تھا اور پیجا جراح کسی شادی میں دیگیں پکوا رہا تھا۔ جب مجبوراً مریض کو ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا تو اس نے لکڑی کی دو چار کھپچیاں پٹی کی مدد سے بازو کے اردگرد لپیٹ دی تھیں اور کہا تھا کہ اسے فوراً ہسپتال لے جاؤ۔ پہلے بھی ایک دو واقعات ایسے ہو چکے تھے۔ محلے میں کئی دن چہ میگوئیاں ہوتی رہیں کہ ہر مریض کو ہسپتال ہی بھیجنا ہوتا ہے تو ڈاکٹر نے یہاں کلینک کس لیے کھول رکھا ہے۔

ہم دور دراز کے کسی گاؤں کا نہیں' اچھے بھلے شہر کے ایک بھرے پرے محلے کا ذکر کر رہے ہیں۔ فیکا پہلوان تو چند سال پہلے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اب اس کے بیٹے ٹنڈو پہلوان نے باپ کا تھیہ سنبھال لیا ہے۔ جب کہ پیجے جراح کے "پیرس ہیئر کٹنگ سیلون" کی جگہ اب چوڑیوں اور خواتین کے بناؤ سنگھار کی اور دیگر اشیاء کی ایک دکان کھل گئی ہے۔ جس کے ساتھ ہی ایک نیا بورڈ لگا ہوا ہے۔ "یہاں ناک اور کان جرمن مشین سے بغیر درد کے چھید دیے جاتے ہیں۔" گویا جراحی کا تسلسل کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔

ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ فیلیے پہلوان کے جوڑ توڑ اور بیچ جراح کے چیروں کے عینی شاہد رہے ہیں۔ گزشتہ دنوں جب کمبائنڈ ملٹری ہسپتال کے زیر اہتمام آرمڈ فورسز میڈیکل کالج کے فاروقی آڈیٹوریم میں ہڈیوں کے علاج کے متعلق ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی تو ہم بھی وہاں جا پہنچے کہ دیکھیں سائنس نے کتنی ترقی کر لی ہے۔ مجلس مذاکرہ صبح آٹھ بجے شروع ہوئی اور دوپہر تک جاری رہی۔ جہاں تک شرکاء کا تعلق ہے تو یہ سمجھیں کہ کالج میں سرجنوں کی ایک بارات اتر آئی تھی۔

تلاوت قرآن حکیم کے بعد مسلح افواج کے ڈائریکٹر جنرل سرجری' میجر جنرل مظفر حسین اندرابی نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ بتایا' امن کے دنوں میں سرجیکل وارڈوں کے تیس فیصد بستروں پر ایسے مریض ہوتے ہیں جو ہڈیوں کے علاج کے لیے آئے ہوتے ہیں۔ جنگ کے دنوں میں ایسے مریضوں کی تعداد نوے فیصد تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر تجویز کیا گیا ہے کہ لاجسٹک ایریا کے ہسپتالوں میں ہڈیوں کے ماہر سرجن موجود ہوں۔ آئندہ چھ سات سالوں میں اس تجویز پر عمل درآمد کے روشن امکانات ہیں۔ انہوں نے ''آرمڈ فورسز انسٹی ٹیوٹ آف ٹراما اینڈ آرتھوپیڈکس'' کے قیام کی تجویز بھی پیش کی' جہاں ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے علاج کا اعلیٰ معیار قائم کیا جا سکے۔

جنرل اندرابی کے بعد مہمان خصوصی ڈائریکٹر جنرل میڈیکل سروسز' سرجن جنرل لیفٹیننٹ جنرل منظور احمد کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے تقریب کے منتظمین کی کوششوں کو سراہا اور امید ظاہر کی کہ اس طرح کی کانفرنسوں کے ذریعے ایک دوسرے کے تجربات سے استفادہ کرنے اور دکھی انسانیت کی خدمت کی نئی راہیں کھلیں گی۔ انہوں نے نوجوان سرجنوں پر زور دیا کہ وہ اکیسویں صدی میں داخلے کے لیے اپنی پیشہ وارانہ مہارت بڑھائیں اور آنے والے وقت میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے تیار رہیں۔ انہوں نے ایک ریسرچ کونسل کے قیام کا اعلان کرتے ہوئے نوجوان ڈاکٹروں کو دعوت دی کہ وہ اپنی صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے نئے منصوبوں پر تحقیق کریں۔ انشاء اللہ ذرائع کی کمی ان کی راہوں کی رکاوٹ نہیں بنے گی۔

مجلس مذاکرہ کے پہلے سیشن کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ مجلس کے منتظم اعلیٰ بریگیڈیئر منیر احمد چیمہ نے چیئرمینوں کے پینل کا اعلان کیا تو پتہ چلا کہ ڈاکٹروں میں ادب کے جراثیم جنرل شفیق الرحمٰن کی ریٹائرمنٹ کے ساتھ رخصت نہیں ہوئے' باقی ہیں بلکہ پھل پھول رہے ہیں۔ کاش انہیں اظہار کی راہ بھی ملے۔ بریگیڈیئر چیمہ نے کہا۔ ''ایک اچھا سرجن بننے کے لیے عقاب کی نظر' چیتے کا جگر اور نرم دل خاتون کے ہاتھ ضروری ہیں اور لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ملک شوکت حسین میں یہ تینوں خاصیتیں موجود ہیں۔ وہ بلاشبہ ہیں تو مرد لیکن ان کے ہاتھوں شفا پانے والے ہزاروں مریض گواہ ہیں کہ ان کے ہاتھ کس نرمی اور ملائمت سے مسیحائی کا عمل انجام دیتے رہے ہیں۔

دوسرے چیئرمین تھے پروفیسر نصیر محمود اختر جو میو ہسپتال لاہور میں آرتھوپیڈکس شعبے کے سربراہ ہیں اور ہڈیوں کے جراحی اور ان کے علاج میں اتھارٹی مانے جاتے ہیں۔ میجر جنرل سید مظفر حسین اندرابی نے ماڈریٹر کے فرائض سنبھالے۔ یہ بات قابل تحسین تھی کہ زیادہ تر مقررین نے دیئے گئے وقت میں اپنی بات مکمل کر لی۔ اگر کبھی کبھار تاخیر ہوئی بھی تو اس کی وجہ بجلی بنی یا سلائیڈ پروجیکٹر کے آپریٹر کی گھبراہٹ۔ ویسے آپریٹر کی گھبراہٹ بجا تھی کہ کچھ مقررین کے ہاں سلائیڈ بدلنے کی رفتار جہاز سے چھلانگ لگانے والے چھاتہ برداروں سے بھی تیز تھی۔ مقررہ شرح تو ایک سیکنڈ میں تین ہیں' لیکن عملاً دیکھا گیا ہے کہ پانچ سے چھ پیراٹروپر ایک سیکنڈ میں جہاز چھوڑ جاتے ہیں۔ اتنی تیز رفتاری سے سلائیڈیں بدلنے والے مقررین کی تقریروں سے ''نیکسٹ سلائیڈ پلیز'' (Next Slide Please) کے جملے نکال دیے جائیں تو باقی جو کچھ بچتا تھا (اور یہ شاید ان کی کل گفتگو کا دس فیصد کے قریب بنتا ہوگا) وہ سرجنوں کی سمجھ میں آیا ہو تو آیا ہو' ہم جیسے ناواقفوں کے پلے کچھ نہیں پڑا۔

خیر یہ سیمینار پڑھے لکھے سرجنوں کے لیے تھا اور زیادہ تر مقررین نہ صرف پڑھے لکھے تھے بلکہ برسوں کا تجربہ بھی رکھتے تھے۔ ان کی گفتگو دلچسپ بھی تھی اور معلومات سے بھرپور بھی۔

پہلے مقرر تھے' میجر سہیل۔ ان کی گفتگو رانوں کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں (Neck of Femur Fracture) کے علاج سے متعلق تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے جدید ترین طریق علاج Dynamic Hip Screw کے بارے میں اپنے مشاہدات بیان کیے۔ وہ اب تک بیس مریضوں پر یہ طریقہ علاج استعمال کر چکے ہیں۔ جن میں سے انیس مریض توحسب توقع صحت یاب ہو گئے' صرف ایک مریض کے بارے میں کچھ پیچیدگیاں پیدا ہوئیں لیکن انہیں بھی مختلف دواؤں کے استعمال سے کنٹرول کر لیا گیا۔ کولہے کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے علاج کے لیے آج کل یہ دنیا بھر میں محفوظ ترین طریقہ سمجھا جاتا ہے۔

دوسرے مقرر تھے بریگیڈیئر محمد تاجر۔۔۔۔۔۔۔ وہ ایبٹ آباد میں سرجیکل سپیشلسٹ ہیں۔ انہیں یہ منفرد اعزاز حاصل ہے کہ ایک طرف تو ان کے پاس انفنٹری سنٹروں میں تربیت حاصل کرنے والے رنگروٹ مریض آتے ہیں' دوسری طرف پاکستان ملٹری اکیڈمی سے جنٹلمین کیڈٹ۔ انہوں نے کچھ عرصے سے اپنے پاس آنے والے مریضوں کا تجزیہ شروع کیا تو بڑے دلچسپ نتائج حاصل ہوئے۔ انہوں نے بتایا۔ ''سنٹروں میں آنے والے رنگروٹ زیادہ تر دیہات سے آتے ہیں جہاں زندگی شہروں کے مقابلے میں کٹھن ہوتی ہے۔ نوجوانوں کو میلوں پیدل چلنا پڑتا ہے۔ بہت سے کام ہاتھ سے کرنے پڑتے ہیں' جن کی وجہ سے وہ سخت جان ہوتے ہیں۔ خاص طور پر پیدل چلنے کی وجہ سے ان کی ٹانگیں مضبوط ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سنٹروں میں تربیت کے دوران ان

ہڈیوں کے کھچاؤ (Stress Fracture) کے کیس بہت کم پائے گئے۔ اس کے مقابلے میں شہروں سے آنے والے کیڈٹ تن تنہا آسان ہوتے ہیں۔ اکیڈمی میں نازل ہوتے ہی انہیں جس طرح بھگایا دوڑایا جاتا ہے ان کے عضلات اسے برداشت نہیں کر پاتے اور ان میں ہڈیوں کا کھچاؤ کے کیس زیادہ ہوتے ہیں۔'' انہوں نے مسلح افواج کے تربیتی اداروں میں شمولیت اختیار کرنے والوں کو تلقین کی کہ وہ وہاں جانے سے قبل خود کو بتدریج جسمانی مشقتوں کا عادی بنائیں۔

ہڈیوں کے کھچاؤ کا تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے بتایا ''مسابقت کی دوڑ نے کھیلوں اور فوجی زندگی کو یکساں طور پر متاثر کیا ہے۔ آگے بڑھنے کا شوق، تھکن کے باوجود مزید محنت پر اکساتا ہے جبکہ عضلات تھکنے کے بعد مزید بوجھ برداشت نہیں کر سکتے اور یہ بوجھ ہڈیوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لگاتار جسمانی مشقت سے بالآخر ہڈیوں پر کھچاؤ پڑتا ہے جس سے مریض کو درد تو محسوس ہوتا ہے لیکن ریڈیوگرافی سے اس کی تشخیص ممکن نہیں ہوتی۔ اس کے لیے ہڈیوں کو دیکھنے کے لیے ایک اور مشین استعمال کی جاتی ہے جو پاکستان میں صرف سی ایم ایچ میں میسر ہے۔''

کیپٹن نوید نے بچوں کی رانوں کے علاج کے بارے میں اپنے مشاہدات پیش کئے۔ اگرچہ بچوں میں ران کی ہڈی ٹوٹنے کے واقعات کم کم ہوتے ہیں، لیکن خدانخواستہ ہو جائیں تو بروقت علاج نہ ہونے کی صورت میں بچہ پوری زندگی کے لیے معذور ہو سکتا ہے۔ اس کے علاج کے لیے تین پنوں والی سٹیل پلیٹ استعمال کی جاتی ہے۔

اگلے مقرر تھے ڈاکٹر سید محمد اویس، وہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں آرتھوپیڈکس کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ انہوں نے کولہے کی ہڈی کے علاج کے بارے میں اپنے مشاہدات پیش کئے۔ کولہے کی ہڈی ایک پیالے نما ہڈی کے اوپر گھومتی ہے اور باوجود اس کے کہ انسانی جسم کی حرکات وسکنات میں یہ پیالہ نما ہڈی (Acetabulum) بنیادی کردار ادا کرتی ہے، بنانے والے نے اسے اتنا نازک بنایا ہے کہ خدانخواستہ اگر یہ ٹوٹ جائے تو پھر انڈے کے چھلکے کی طرح ٹوٹتی ہے اور اس کا علاج بہت مشکل سے ہوتا ہے۔ کولہے کی ہڈی کا نقصان ویسے بھی خطرناک ہوتا ہے اور انسان کو زندگی بھر کے لیے اپاہج کر سکتا ہے لیکن وہ پیالے نما ہڈی جس پر کولہے کی ہڈی گردش کرتی ہے، ٹوٹ جائے تو خطرات کے امکانات اور بھی بڑھ جاتے ہیں۔ پروفیسر اویس نے میو ہسپتال میں آنے والے ایسے مریضوں کے علاج کے بارے میں اپنے مشاہدات پیش کئے۔

ان کے بعد دعوت خطاب دی گئی بریگیڈیئر منیر احمد چیمہ کو جو اس سیمینار کے چیف آرگنائزر بھی تھے، کمبائنڈ ملٹری ہسپتال میں آرتھوپیڈکس یعنی ہڈیوں کے امراض کے بارے میں مشیر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا ''کولہے کی

ہڈی کی تبدیلی (Hip Arthroplasty)۔ کولہے میں بہت سی ہڈیاں آ کر ملتی ہیں۔ اگر کسی جوڑ میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے۔ طویل بیماری کے بعد ارد گرد کی ہڈیاں سنبھالنے کے قابل نہ رہے تو جدید جراحی میں ایسے جوڑوں کو بدلنے کی سہولت موجود ہے۔ اس کے لیے مختلف دھاتوں کے آمیزے سے ایسے جوڑ تیار کئے گئے ہیں جو برسوں انسانی جسم میں رہنے کے باوجود اپنی اصلی حالت برقرار رکھتے ہیں اور انسانی جسم بھی انہیں قبول کئے رکھتا ہے۔ چند برس پہلے یہ حالت تھی کہ کسی ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑنے کے لیے کوئی سٹیل پلیٹ ڈالی گئی اور کچھ عرصے کے بعد وہ زنگ آلود ہو گئی۔ بریگیڈیئر منیر احمد چیمہ نے بتایا کہ گزشتہ کچھ عرصے میں سی ایم ایچ میں ۷۵ مریضوں کی کولہے کی ہڈیوں کے جوڑ تبدیل کئے گئے۔ انہوں نے سلائیڈوں کی مدد سے مختلف جوڑوں کی کیس ہسٹری بیان کی گئی۔

ان کے بعد دعوت سخن دی گئی بریگیڈیئر اسد محمود ملک کو۔ ان کی گفتگو کا موضوع تھا ''گھٹنے کے جوڑ میں خرابی کا علاج'' گھٹنے انسانی حرکات وسکنات میں یکساں اہمیت کے حامل ہیں اور ذرا سی خرابی انسان کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں چھوڑتی۔ بریگیڈیئر ملک نے سلائیڈوں کی مدد سے مختلف کیس دکھائے اور اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کیا۔

پہلے سیشن کے آخری مقرر تھے پروفیسر اسلم پراچہ۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز (PIMS) اسلام آباد میں آرتھوپیڈکس ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ ہیں۔ ان کی تقریر سے یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جوڑنے کے لیے پلاسٹر کا استعمال متروک ہو چکا ہے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ ٹوٹی ہوئی ہڈی کو کھینچ تان کر اپنی جگہ بٹھا دیا جاتا تھا اور اس پر پلاسٹر چڑھا کر مریض کو چھ سے آٹھ ہفتوں اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ عرصے کے لیے بستر کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ پلاسٹر اتنا بھاری ہوتا تھا کہ مریض ہلنے جلنے تک سے عاجز ہوتا تھا۔ بستر پر پڑے پڑے کمر میں چھالے پڑ جاتے تھے۔ لیکن اب یہ طریقہ ضروری نہیں رہا۔ پروفیسر اسلم پراچہ نے بتایا کہ اب آپریشن کے ذریعے ہڈی کے کھوکھلے حصے میں سوراخ کر کے ایک سلاخ ڈال دی جاتی ہے۔ جو پیچوں کی مدد سے کس دی جاتی ہے۔ جبکہ ٹوٹی ہوئی ہڈی کے فالتو ریزے یا حصے جسم میں ہی چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ اس پورے عمل کو ایک خاص مشین کے ذریعے سکرین پر مسلسل دیکھا جا سکتا ہے۔ کچھ عرصے بعد ٹوٹی ہوئی ہڈی آپس میں جڑ جاتی ہے۔ جبکہ فالتو حصوں کو معمولی چیرا دے کر باہر نکال لیا جاتا ہے۔ اس طریق علاج کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ مریض چوبیس سے اڑتالیس گھنٹوں کے اندر اندر نہ صرف حرکت کر سکتا ہے بلکہ تین چار دنوں ہی میں چلنے پھرنے لگتا ہے۔

پہلے سیشن کے بعد وقفہ ہوا تو ہمیں یوں لگا جیسے کسی بائیسکوپ سینما سے باہر آ گئے ہوں۔ ہمیں پتہ ہی نہ چلا کہ پورے تین گھنٹوں تک سیمینار کے منتظمین ہمیں ایک اندھیرے ہال میں محبوس کئے ہوئے تھے۔ مقرر بدلنے پر تھوڑی دیر کو روشنی ہوتی اور پھر وہی گھپ

اندھیرا۔ سکرین پر سلائیڈیں چلتیں اور ملگجی روشنی میں مقررین ان کی وضاحت کرتے۔ عجیب سیمینار تھا۔ جتنی دیر میں اس کے منتظمین نے ہمیں ایک سیشن سنوایا' اتنی دیر میں تو ہم سلطان راہی اور مصطفی قریشی کی کوئی فلم دیکھ سکتے تھے جس میں ڈانس بھی ہوتے اور سحر آفرینیاں بھی۔ ویسے ہمیں اس سائنسی سیمینار اور پنجابی فلموں میں بڑی مماثلت نظر آئی۔ پنجابی فلموں میں جب ڈانگ سوٹے اور گنڈاسے چلتے ہیں تو شریف آدمی لرزنے لگتا ہے۔ اس سیمینار میں انسانی جسم کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں اور پاش پاش جسم دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ بس فرق یہ تھا کہ پنجابی فلموں میں ہڈیاں توڑنے کے طریقے دکھائے جاتے ہیں اور اس سیمینار میں ہڈیاں جوڑنے کے طریقے بتائے جا رہے تھے۔ ہوا نا سیمینار اور پنجابی فلموں میں چولی دامن کا ساتھ!

باہر آئے تو ایک شامیانے تلے خاطر تواضع کا زبردست انتظام تھا۔ چائے کے ساتھ ساتھ تین چار طرح کے کیک اور بسکٹ۔ جانے ہمیں کیوں پیجا جراح یاد آ گیا۔ اس کے ہاں بھی عمل جراحی کے ساتھ ساتھ دیگوں کی پکوائی کا اعلیٰ انتظام ہوتا تھا۔

وقفے کے بعد دوسرے سیشن کا آغاز ہوا۔ اس کے چیئرمین تھے' لیفٹیننٹ (ریٹائرڈ) محمود الحسن اور پروفیسر اسلم پراچہ۔ بریگیڈیئر منیر احمد چیمہ نے آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلے سیشن میں آپ نے کارپینٹروں کی سی کاریگری دیکھی اور سنی اور اب ملاحظہ فرمائیں' سناروں کی سی صناعی اور باریک بینیاں۔'' انہوں نے کارروائی میجر جنرل سی ایم رفیع کے سپرد کر دی۔ جنہوں نے سب سے پہلے دعوت خطاب دی ڈاکٹر تحسین چیمہ کو۔ وہ پاکستان میں ہاتھ کے سرجنوں کی ایسوسی ایشن کے صدر ہیں۔ سیاچن میں پاک فوج کے جن غازیوں کے ہاتھوں کے سرجنوں کی ایسوسی ایشن کے صدر ہیں۔ سیاچن میں پاک فوج کے جن غازیوں کے ہاتھوں کی انگلیاں یا انگوٹھے فراسٹ بائٹ (Frost Bite) کا شکار ہوئے' ڈاکٹر چیمہ کو ان کے علاج اور کئی مرتبہ کٹے ہوئے انگوٹھے کی جگہ کسی دوسری انگلی کی پور کی بچی ہوئی ہڈی جوڑنے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس لحاظ سے وہ سیاچن کے غازیوں ہی کے نہیں' قوم کے بھی محسن ہیں۔ اور بلا شبہ خود بھی سیاچن محاذ کے غازی کہ جو جہاد میں شریک ہونے والوں کی خدمت میں مصروف ہے وہ خود بھی حالت جہاد میں ہے۔ حسن نیت شرط ہے۔۔۔۔۔۔۔ سر کٹانے کی تمنا ہی انسان کو سرفراز رکھتی ہے۔

ڈاکٹر تحسین پراچہ نے بتایا کہ ہاتھوں کی سرجری میں سب سے زیادہ اہمیت انگوٹھے کو حاصل ہے۔ ہاتھ کی کارکردگی میں پچاس فیصد سے زائد حصہ انگوٹھے کا ہوتا ہے کہ ایک چھوٹی سی پن سے لے کر بھاری چیزوں کے اٹھانے تک انگوٹھے کے بغیر' ہاتھ کی گرفت مکمل نہیں ہوتی۔ کوئی انگلی انگوٹھے کی مدد کے بغیر کوئی کام سرانجام نہیں دیتی۔ انگوٹھا انگلیوں کے ساتھ انفرادی طور پر یا مجموعی طور پر مل کر کام کرتا ہے۔ انگوٹھے کا نقصان چاروں انگلیوں کا نقصان ہے۔ جیسے چار بیویوں کا کوئی شوہر انتقال فرما جائے۔ انگوٹھے کی اسی

اہمیت کے پیش نظر ہاتھ کی سرجری میں انگوٹھے پر سب سے زیادہ توجہ دی جاتی ہے اور اگر کسی حادثے میں انگوٹھا یا انگلیاں ضائع ہو جائیں تو کٹی ہوئی انگلیوں کی بچی کھچی ہڈیوں سے انگوٹھے کی تشکیل نو کی کوشش کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر تحسین نے سلائیڈوں کی مدد سے بہت سے ایسے کیس بیان کئے' جن کے انگوٹھے از سر نو تشکیل دیئے گئے تھے اور اب وہ مطمئن زندگی بسر کر رہے تھے۔ میجر ایم ایچ جعفری کے مقالے کا عنوان بھی اس موضوع سے متعلق تھا۔ انہوں نے اس سلسلے میں اپنے تجربات بیان کئے۔

ڈاکٹر سلیم ملک پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز اسلام آباد میں پلاسٹک سرجن ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ بجلی کی ننگی تاروں کو چھو لینے سے انسانی ہاتھ کس طرح' کس حد تک زخمی ہوتے ہیں اور ان کا تسلی بخش علاج کیونکر ممکن ہے۔ میجر اعتزاز نے ان وریدوں اور شریانوں کا ذکر کیا جو ہاتھ زخمی ہونے کی شکل میں متاثر ہو سکتی ہیں اور جن کے نقصان سے پورے ہاتھ کی کارکردگی بری طرح متاثر ہو سکتی ہے۔ انہوں نے ان وریدوں اور شریانوں کے علاج سے متعلق اپنے مشاہدات بیان کئے۔

بریگیڈیئر نجم خان نے پاؤں کے ناخن گوشت کی طرف بڑھ جانے سے پیدا ہونے والے مسائل اور ان کے علاج کے بارے میں گفتگو کی۔ جبکہ میجر مامون نے جسم کے ایک حصے کے ریشے' کھال یا ہڈیوں کا حصہ بوقت ضرورت دوسرے حصے پر لگانے کے بارے میں اپنے تجربات و مشاہدات بیان کئے۔ میو ہسپتال لاہور کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر طارق سہیل نے گھٹنے کی ہڈی کے علاج کے بارے میں مختلف تدابیر پر اپنے تجربات کی روشنی میں بحث کی۔ یوں یہ سیشن دوپہر تک جاری رہا۔

صاحبو! اس کانفرنس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ پاکستان سائنس خاص طور پر طبی سائنس کے میدان میں الحمدللہ بہت آگے نکل چکا ہے اور دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں ہڈیاں جوڑنے یا ہڈیوں کے امراض کے علاج کے بارے میں جو سہولتیں حاصل ہیں وہ پاکستان میں بھی موجود ہیں۔ لیکن اس کا کیا کیجئے کہ اچھے بھلے شہروں میں فیکے پہلوان اور پیجے جراح نہ صرف موجود ہیں بلکہ ٹنڈو پہلوان ان کی جگہ لیتے جا رہے ہیں۔

ماہرین نے بتایا کہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کا علاج چوبیس گھنٹے کے اندر اندر شروع ہو جانا چاہیے۔ ناگزیر حالات میں دو تین دن کی تاخیر تو قابل برداشت ہے ورنہ اس کے بعد مریض کے ساتھ وہی کچھ ہوتا ہے جو میجر گل بادشاہ کے ایک مریض کے ساتھ ہوا تھا۔

میجر گل بادشاہ ماشاءاللہ آج کل بریگیڈیئر ہیں اور نیورو سرجن کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اب سے بہت پہلے وہ گلگت ایجنسی میں سرجن تھے۔ ان کے پاس ایک ایسا مریض لایا گیا جس کی ران کی ہڈی چار پانچ مہینے پہلے ٹوٹی تھی۔ وہ کسی ''فیکے پہلوان'' سے مالش کرواتا رہا اور درد سے کراہتا رہا۔ جب میجر گل بادشاہ نے اس کا ایکسرے کروایا تو پتہ چلا کہ ٹوٹی ہوئی ہڈی کے دونوں سرے اپنی اپنی جگہ کئی کئی انچ بڑھ چکے ہیں۔ تب میجر گل بادشاہ نے مریض کو آپریشن ٹیبل پر لٹایا' بڑھی ہوئی ہڈی کو آری سے کاٹا (جی ہاں' آری

سے)اور ران کی ہڈی کو اس کی جگہ بٹھا کر دونوں حصوں میں برمے سے سوراخ کئے اور پیچوں کی مدد سے ایک سٹیل پلیٹ ہڈی پر کس دی۔مریض مہینوں بعد چین کی نیند سویا۔

ہر مریض نہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اتنے طویل آپریشن کی صعوبت برداشت کر سکے نہ یہ ممکن ہے کہ ہر مریض کو میجر گل بادشاہ کے ماہر ہاتھ میسر آ جائیں۔

◆◆◆

ہم نے ڈھونڈی تھی اک فرار کی راہ

صاحبو۔۔۔۔۔۔۔!

پڑھنے پڑھانے کے کچھ دن ہوتے ہیں جیسے کھیلنے کھانے کے۔ ہمارے نزدیک یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری عطا ہونا گویا اس بات کی سند ہے کہ حامل رقعہ ہذا کے پڑھنے پڑھانے کے دن ختم ہوئے۔بعض دانشور کالج اور یونیورسٹی لائف کو زندگی کا سنہری دور قرار دیتے ہوئے اس بات کے قائل ہیں کہ اس عمر میں زندگی کو کوئی روگ نہیں لگانا چاہیے۔اس بات کی حکمت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ہم خود اعتدال کی راہوں کے قائل ہیں چنانچہ غیر نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ پڑھنے کی فکر ہمیشہ خود پر "طاری" رکھنے کی مسلسل کوشش کی۔کالج اور یونیورسٹی لائف میں ہر سال باقاعدہ ڈائریاں خریدنا اور مختلف مضامین کی پڑھائی کے پروگرام پوری سنجیدگی سے ترتیب دینا ہمارا مشغلہ رہا۔اب یہ الگ بات کہ ہر ڈائری کے شروع یا آخر میں فون نمبروں اور دوست احباب کے پتے نوٹ کرنے کی جگہ حروف تہجی کے اعتبار سے اتنی خوبصورتی سے ترتیب دی جاتی ہے کہ نئے دوست بنانا اور ان کے پتے اور فون نمبر نوٹ کرنا خود بخود ایک مشغلہ بن جاتا ہے۔کچی عمروں کے اس دور میں ویسے بھی فون پر باتیں کرتے رہنا اچھا لگتا ہے۔

پھر یونیورسٹی میں صرف پڑھائی ہی تو نہیں ہوتی نا۔۔۔۔۔۔۔نوجوان طلبہ کی خوابیدہ صلاحیتوں کے اظہار کے اور بہت سے مواقع ہوتے ہیں اور ان مواقع سے فائدہ نہ اٹھانا کور ذوقی ہے' سر پھرے طلبہ کا ایک طبقہ جانے کب سے خواتین کی ایک الگ یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہے۔سمجھدار طلبہ نے ہمیشہ اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔بھلا یہ کوئی بات ہے؟ یونیورسٹیوں سے رنگین آنچل رخصت ہو جائیں تو گھنے درختوں کے سائے کتنے ویران ویران سے لگنے لگیں۔کلاسوں کی ویرانیاں تو برداشت کی جا سکتی ہیں کہ اس کا دکھ ہوتا بھی ہے تو ان چند طلبہ کو جو مسکراتی جوانیاں سنجیدگی کے حوالے کر بیٹھتے ہیں یا پھر ان اساتذہ کو جو طلبہ کو مستقبل کا معمار قرار دیتے ہوئے ان کے "حال" میں بھی انہیں مزدوروں کی طرح کام کرنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔لیکن یونیورسٹیوں میں گھنے درختوں کے سائے ویران ہو جائیں تو گویا:

چاپا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارے جانے" "گا

رسوائیوں کا یہ عالم۔۔۔۔۔۔الاماں! چنانچہ سمجھدار طلبہ "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" پر عمل کرتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہہ چکے ہیں ہم ہمیشہ سے اعتدال کی راہوں کے قائل رہے اور غیر نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ پڑھائی کی فکر خود پر طاری رکھنے کی کوشش کی۔ اس کا کیا کیا جائے کہ جب ہم نے خود کو پڑھائی میں بھرپور دلچسپی کے لیے آمادہ کیا تو یونیورسٹی نے ڈگری ہمارے ہاتھ میں تھما دی۔ اور لائبریرین خواتین و حضرات اور ان کی زیر نگرانی بے شمار کتابیں ہماری باریک بین نظروں سے صاف بچ گئیں۔ ہم نے بھی اطمینان کا سانس لیا کہ مصنفین کی روحیں اطمینان سے رہیں گی ورنہ ہم ہر بات تنقید و تنقیح کے معیار پر پرکھنے کے قائل ہیں۔ تھوڑے بہت مطالعے سے ہی ہماری نظر میں اتنی باریک بینی اور ذہن میں اتنی وسعت آ گئی تھی کہ اچھی بھلی تھیوریوں میں جھول نظر آتے تھے۔ مثلاً کشش ثقل کی جو یہ تھیوری آئن سٹائن یا نیوٹن یا شاید ونسٹن ۔۔۔۔۔۔ اصل میں انگریزی میں ایجاد کو Invention کہتے ہیں جس کے آخر میں "ن" آتا ہے چنانچہ زیادہ تر سائنس دانوں (اردو میں بھی سائنس دان کے آخر میں "ن" آتا ہے) نے اپنے ناموں کے ساتھ "ن" کا استعمال ضروری سمجھا ہے حالانکہ اس کے بغیر بھی انہیں موجد مانا جا سکتا تھا۔

تو ہم کہہ رہے تھے کہ یہ جو کشش ثقل کی تھیوری مندرجہ بالا سائنس دانوں میں سے کسی نے پیش کی ہے (دراصل مطالعے کو محدود رکھنے کی کوشش کے باوجود ہم اتنا کچھ پڑھ گئے ہیں کہ بعض اوقات بہت سے نام آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں اور علم نفسیات کے مطابق بھلانا تو ہے ہی انسانی فطرت) اس سلسلے میں یہ مثال کہ اگر کسی پتھر کو آسمان کی طرف اچھالا جائے تو وہ ہمیشہ زمین کی طرف گرتا ہے ہمارے نزدیک نظر ثانی کی محتاج ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق پتھر کو آسمان کی طرف اچھالنا قطعی غیر ضروری فعل ہے۔ ہتھیلی کا رخ زمین کی طرف کر کے پتھر کو چھوڑ دیا جائے تب بھی وہ بے چارہ زمین ہی پر گرتا ہے اور گرنے کا یہ فعل بے جان پتھروں تک ہی محدود نہیں ہے' اچھے بھلے لوگ بھی منہ کے بل زمین پر گر جاتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ اور کچھ چیزیں زمین پر نہیں گرتیں۔

حالات کے قدموں پہ قلندر نہیں گرتا
ٹوٹے بھی جو تارا تو زمیں پر نہیں گرتا

اس طرح جغرافیہ کی کتابوں میں سمتیں بتانے کے طریقوں میں ابھی تک یہ بات لکھی جا رہی ہے کہ نکلتے ہوئے سورج کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ' تمہارے سامنے مشرق' پیچھے مغرب' دائیں شمال اور بائیں جنوب ہوگا۔ ہمارے نزدیک یہ طریقہ اکثریت کے لیے ناقابل عمل اور شہروں میں عدم واقفیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ محض سمتیں معلوم کرنے کے لیے طلوع ہوتے ہوئے سورج کے سامنے کھڑا ہونا طبیعت پر سخت گراں گزر سکتا ہے۔ پھر صبح سویرے نرم نرم بستر چھوڑ کر کسی ایسی جگہ پہنچنا جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہوا نظر آ سکے' بذات خود ایک مشقت طلب کام ہے جس سے دن کی ابتدا ہو جائے تو دن بھر کے لیے بوریت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس

تگ ودو میں یہ بھی ممکن ہے کہ سورج کچھ بلند ہو چکا ہو تو اس سورج کی طرف دیکھنا آنکھوں کے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔

ہماری تحقیق کے مطابق ڈوبتے ہوئے سورج سے بھی سمتیں معلوم کی جا سکتی ہیں۔ اگر ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف منہ کر کے کھڑا ہوا جائے تو سامنے کی طرف مغرب' پیچھے کی طرف مشرق' دائیں اور بائیں میں سے ایک طرف شمال اور ایک طرف جنوب ہوگا۔ اس طریقے کو رواج دیا جائے تو نہ صرف طلبہ اس سے مستفید ہو سکتے ہیں بلکہ کارخانوں سے لوٹتے ہوئے مزدور' پرائیویٹ کمپنیوں سے کام کر کے واپس آتے ہوئے کلرک' کھیتوں میں کام ختم کرتے ہوئے کسان اور دریا یا سمندر کے کنارے پکنک مناتے ہوئے آسودہ حال اچھے لوگ' سبھی یکساں طور پر اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن افسوس! یہ ہوتا آیا ہے کہ ماضی میں تعلیم کو چند لوگوں تک محدود رکھنے اور اسے مشکل سے مشکل تر بنانے کی باقاعدہ شعوری کوشش کی جاتی رہی ہیں۔ بس اس وجہ سے تعلیم سے ہمارا دل اچاٹ ہو گیا۔ ویسے بھی یونیورسٹی سے ڈگری تو ہم لے ہی چکے تھے۔

ڈگری لینے کے بعد کچھ دن کوچہ صحافت کی خاک چھانی۔ یہ پیشہ بھی ایسا ہے جہاں اور پڑھنے پڑھانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ہم نے اسے خیرباد کہا اور فوج میں آ دھمکے۔ جس میں ایک دفعہ آ نا تو آسان جانا ذرا مشکل ۔۔۔۔۔۔ اور یہ بات ہم اس لیے کر رہے ہیں کہ ہمیں یہ جان کر بہت مایوسی ہوئی کہ فوج میں لکھنے پڑھنے کا خاصا اہتمام ہے۔ فوج کے بارے میں جو عام تاثر تھے' ان سے یہ بات کسی طور پر بھی لگا نہیں کھاتی کہ یہاں قدم قدم پر امتحان ہیں اور جگہ جگہ آرمی سکول اور لائبریریاں۔ گو ہم خود آرمی ایجوکیشن کور کے لیے سلیکٹ ہوئے تھے۔ لیکن اس کور کے بارے میں بہت پہلے سے یہ بات ہمارے علم میں تھی کہ اس کی تشکیل میں کرنل محمد خان کا شروع سے ہاتھ رہا ہے۔ "بجنگ آمد" کے حوالے سے ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ جیسے ہلکی پھلکی کتاب انہوں نے لکھی تھی ویسی ہلکی پھلکی کور کی تشکیل انہوں نے کی ہوگی۔ لیکن فوج میں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ بعد میں آنے والوں نے اس کور کے "بوجھل پن" میں بہت اضافہ کیا۔ پہلے شاید ایم اے ہونا باعث افتخار رہتا ہو تو اب تو پی ایچ ڈی ڈاکٹروں اور ایم فل افسروں کی وہ فراوانی ہے کہ اپنی کوالیفیکیشن محض ایم اے بتاتے ہوئے بنجر بنجر اور بانجھ بانجھ سے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہمیں کالج آف آرمی ایجوکیشن میں پوسٹ کر دیا گیا جہاں افسروں کی تو بات ہی کیا' جونیئر کمیشنڈ افسروں سے ملتے ہوئے اوسان خطا ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں سوشل ہونے کی کوشش میں ہم نے تعارف حاصل کرنے کی ہمت کی۔ یہ تعارف بھی روگ بن گیا کہ ہر تیسرا چوتھا جے سی او ایم اے نہیں بلکہ ڈبل ایم اے ہے' ایم اے' ایل ایل بی ہے یا اور کچھ نہیں تو ایم اے' بی ایڈ۔

تعارف روگ بن جائے تو اس کو بھولنا بہتر

کالج آف آرمی ایجوکیشن اپرٹوپہ میں واقع ہے جو کوہسار مری سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔ ہر سال پوری آرمی سے سینکڑوں طالب علم یہاں آتے ہیں۔ ان میں آفیسرز بھی ہوتے ہیں' جونیئر کمیشنڈ آفیسرز بھی' نان کمیشنڈ بھی اور سیدھے سادے سپاہی بھی۔ ان کی آمد پر یہاں درس وتدریس کی محفلیں سجتی ہیں۔ تعلیم وتعلم کے ہفت خواں طے کئے جاتے ہیں۔ اور کورس مکمل ہونے پر طلباء سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ اپنی اپنی یونٹوں میں جا کر علم کی شمعیں روشن کریں گے۔

ہم جب سے یہاں آئے اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ معلوم کریں کہ یہ جو اتنے بہت سے لوگ ہنستے مسکراتے یہاں چلے آتے ہیں۔ علم کی تلاش میں آتے ہیں یا مری اور گردونواح کے خوبصورت نظاروں کی کشش انہیں کھینچ لاتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ہمیں اس الجھن کو سلجھانے کا موقع ملا۔ ویسے تو جب سے ہم نے وردی پہنی ہے طرح طرح کی صدارتیں ہیں کہ ہمارے تعاقب میں ہیں۔ کمیشن ملنے کے فوراً بعد ہمیں کئی تحقیقی عدالتوں (Courts of Eoquirry) کی صدارت ملی' جس کے ناطے ہمیں یہ یونٹ سے غیر حاضر ہونے والے افراد کے بارے میں چھان بین کرنا ہوتی تھی یا ڈسپلن کی خلاف ورزی پر کسی فرد کے خلاف انضباطی کارروائی مقصود ہوتی تھی۔ کچھ سینئر ہوئے تو جائزہ بورڈوں (Stock Taking Boards) کی صدارتیں ملیں۔ اس بورڈ کا کام کسی ادارے کی تمام اشیاء کی گنتی اور جائزہ ہوتا ہے اور بھی کئی طرح کی صدارتیں ہوتی ہیں جو کہ فوجیوں کو سنبھالنی پڑتی ہیں۔ مثلاً صدارت کورٹ مارشل' صدارت امتحانات اور۔۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔۔عقلمند را اشارہ کافی است!

تو پچھلے دنوں ایک امتحانی بورڈ کی صدارت ہمارے ہاتھ لگی۔ طلباء کی تعداد ڈھائی سو کے لگ بھگ تھی جو کہ پوری آرمی کی نمائندگی کر رہے تھے۔ تقریباً ہر ڈویژن اور ہر کور کے طلباء اس میں موجود تھے۔ کالج آف آرمی ایجوکیشن میں تین چار ماہ گزار چکے تھے۔ ہم نے موقع غنیمت جانا اور مناسب سمجھا کہ فوج کے مختلف گوشوں سے آئے ہوئے ان طلباء سے پوچھا جائے کہ فوج میں آ کر بھی علم کی خاطر کالج آف آرمی ایجوکیشن میں آنا انہیں کیسا لگا۔ چنانچہ اردو کا پرچہ امتحان مرتب کرتے ہوئے ایک سوال ہم نے ''کالج آف آرمی ایجوکیشن'' کے بارے میں شامل سوالات کیا اور منتظر ہوئے کہ کیا جوابات آتے ہیں۔

ہمیں امید یہ تھی کہ فوج کے یہ نمائندے اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کرتے ہوئے کالج آف آرمی ایجوکیشن کو کھری کھری سنائیں گے اور برملا اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہیں گے کہ بھلا ہم فوجیوں کا پڑھنے لکھنے سے کیا کام۔ کالج کو بند کیا جائے اور ہمیں پڑھنے پڑھانے کی اس اذیت سے نجات دی جائے۔ ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ سینکڑوں طلباء کی ان مبنی حقیقت آراء کو خوبصورتی سے ترتیب دے کر چیف آف آرمی سٹاف اور دیگر کارپردازان کی خدمت میں پیش کرتے اور فوج میں ''ایجوکیشن'' کے نام پر ایک کالج

کے قیام کے جواز اور عدم جواز پر سیر حاصل بحث کرتے۔ امکان تھا کہ اس طرح مختلف کلاسوں میں لیکچر دینے کے لیے ہمیں جو خواہ مخواہ موٹی موٹی کتابیں پڑھنا پڑتی ہیں' انسائیکلو پیڈیا دیکھنے پڑتے ہیں اور لائبریریوں میں مغز کھپانا پڑتا ہے' اس سے نجات مل جائے گی۔۔۔۔۔۔لیکن

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ان کم عقلوں کے جوابات پڑھ کر ہم نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ گئی۔ ہمیں ان سے غیر معمولی ادبی جوابات کی توقع تو خیر پہلے بھی نہیں تھی۔ لیکن سادہ سپاٹ اور بے ساختہ فقروں میں بھی انہوں نے جو کچھ لکھا ہے۔ ان سے کسی طرح بھی ہم اپنے مطلب کے نتائج نہیں نکال سکتے۔ حالانکہ صحافت میں ایم اے ہونے کے دعویدار ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے کالج آف آرمی ایجوکیشن کے بارے میں فوج کے مختلف افراد کے تاثرات۔

کالج آف آرمی ایجوکیشن

☆ اس کی شان میں جتنا کچھ کہا جائے کم ہے۔۔۔۔۔۔۔کیونکہ اس ادارے میں حیوان کو انسان کے روپ میں بدلا جاتا ہے۔ یہاں علم ودانش کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اور ہر سال سینکڑوں متوالے اس میں آ کر غوطے لگاتے ہیں۔ (نائیک محمد ریاض' ۵۴ بلوچ رجمنٹ)

☆ ایک حیوان بھی اس سکول میں داخل ہو جائے تو میرے خیال میں انسان بن کر نکلے گا۔ جس سے بھی پوچھا اس نے یہی کہا کہ جس نے یہاں کچھ نہیں سیکھا وہ دنیا کے کسی کونے میں بھی کچھ نہیں سیکھتا۔ (نائیک محمد ریاض' ۱۰۳ انجینئرز بٹالین)

☆ یہاں تعلیم کا سمندر موجزن ہے۔ یہاں سے جتنی تعلیم حاصل کی جائے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم سب چڑیا کوے ہوں اور سمندر سے پانی پی رہے ہوں۔

☆ جو بھی اس اسکول میں داخل ہوتا ہے گویا سونے کی کان میں داخل ہوتا ہے۔ باہر نکلتا ہے تو خود بھی سونے کی طرح چمکتا ہے۔ (نائیک داد علی شاہ' ناردرن لائٹ انفنٹری سنٹر بونجی)

☆ جو بھی یہاں آ جاتا ہے وہ آرمی لیول تک جہاں بھی جائے اس سکول کے گیت گاتا رہتا ہے۔ (نائیک محمد اشرف' ۴۰۶ مارٹر بیٹری)

☆ بچپن میں مجھے علم کی اہمیت سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس لیے پڑھائی میں دلچسپی نہیں لی۔ اب فوج میں آ کر تعلیم کی اہمیت سمجھ میں آئی تو خیال تھا کہ فوج کو ہماری تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔ لیکن یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ تعلیم کے لیے باقاعدہ ایک کالج

قائم ہے۔ بڑی منتوں سماجتوں اور دعاؤں کے بعد یہاں آنا نصیب ہوا۔ (لانس دفعدار کاظم حسین' ۲۴ کیولری)

☆ یہ کالج فوج میں واحد جگہ ہے جہاں ایک فوجی کو تہذیب یافتہ بنایا جاتا ہے۔ (نائیک واحد شاہ' ۵ ۳ ملٹری پولیس یونٹ)

☆ فوج کے باقی سکول جسمانی نشوونما کرتے ہیں' یہ سکول ذہنی نشوونما کرتا ہے۔ (لانس دفعدار محمد نواز' ۲۸ کیولری)

اس کالج کے قریب مری شہر واقع ہے۔ جہاں لوگ ہزاروں روپے خرچ کر کے موسم گرما سے فائدہ اٹھانے آتے ہیں لیکن ہم لوگ کورس پر آ کر یہاں مفت رہتے ہیں اور تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں۔ اس سکول کی مثال اس آم کی سی ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ (لانس نائیک غلام رسول' ۵۳ فیلڈ کمپنی انجینئرز)

☆ سب سے اعلیٰ چیز یہ ہے کہ باقی آرمی سکولوں کے کورس اور کلاسیں دوران سروس کام دیتے ہیں' لیکن اس کالج سے کیا ہوا کورس سپاہی کے لیے سروس کے بعد بھی کام دیتا ہے۔ (لانس دفعدار محمد نواز' ۲۸ کیولری)

☆ کالج کے اردگرد سین اتنے خوبصورت ہیں اور ماحول اتنا اچھا ہے کہ جی یہ چاہتا ہے کہ پوری سروس ادھر ہی گزار دیں۔ لیکن ہم نے کالج میں علم کی شمع سے جو روشنی حاصل کی ہے اس کی مدد سے واپس یونٹ میں جا کر کوئی نہ کوئی موم بتی تو جلانا ہی پڑے گی۔ (حوالدار محمد ارشاد' ۸۳ الائٹ انٹی ایئر کرافٹ بیٹری)

☆ یہ کالج پریشان حال لوگوں کا سہارا ہے۔ (لانس نائیک ارمان بیگ' ۱۰ ناردرن لائٹ انفنٹری)

☆ ______

یہی ہے شہر روز افزوں ترقی کا
اسی چشمے سے دیکھو گے کہ اک دریا رواں ہو گا

(لانس نائیک محمد اسلام' جنرل ہیڈکوارٹرز راولپنڈی)

☆ یہ واحد ادارہ جو انسان کو انسانی قدریں سکھاتا ہے۔ کالج آف آرمی ایجوکیشن پوری فوج کے لیے روحانی باپ کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ کالج پاکستان آرمی کی جڑ ہے۔ جس طرح درخت کی جڑ کے ذریعے پتوں تک خوراک پہنچائی جاتی ہے اسی طرح پاکستانی آرمی کو اسی جڑ سے تعلیم دی جاتی ہے۔ (لانس نائیک محمد عثمان' ۸ ۳ فیلڈ آرٹلری)

اساتذہ کے بارے میں بیان

☆ یہ درس و تدریس کا واحد عسکری ادارہ ہے جس میں مٹی اور زنگ آلود ہیروں کو تراش کر چمک دار اور بڑے ہی قیمتی ہیرے کی شکل

دے کر نکالا جاتا ہے۔ (لانس نائیک محمد عبداللہ' انجینئر انچیف برانچ' جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمپنی ہیڈکوارٹرز راولپنڈی)

یارب یارائے سخن گوئی نہ دعوئ زباں دانی

☆ میں اتنا علم نہیں رکھتا کہ اس گہوارہ علم کے بارے میں رائے زنی کروں' لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ فوج میں ہوتے ہوئے اتنے مہذب اور شائستہ لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ (لانس دفعدار کاظم حسین' ۲۴ کیولری)

☆ یہاں کے استاد تعلیمی استعداد پر مبنی آراء موتی کی مانند بکھیرتے ہیں۔ اور اپنے شاگردوں کو یہ موتی مفت چننے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ (نائیک داد علی شاہ' ناردرن لائٹ انفنٹری سنٹر)

☆ ایسے استاد اگر زندگی میں نہیں تو فوج میں ضرور پہلی بار دیکھے ہیں۔ (نائیک فلک شیر' ۵ ۷ ۴ آرمی انجینئرز گروپ)

یہاں کے استادوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ پوری دنیا کی تعلیم انہی کے پاس موجود ہے۔ (سپاہی محمد طاہر' ۸ میڈیم رجمنٹ آرٹلری)

☆ سردیوں کے موسم میں جو جاندار یہاں رہ جاتے ہیں ان میں استاد صاحبان' بندر اور کوے قابل ذکر ہیں۔ بندر خوراک کی تلاش میں آتے ہیں' کوے تھکے تھکے سے لگتے ہیں' لیکن استاد صاحبان خوش اخلاق اور باوقار ہی رہتے ہیں۔ (نائک طفیل احمد' ۲۰ پنجاب رجمنٹ)

☆ جے سی اوز میس قابل دید مقامات میں سے ہے۔ یہاں جے سی اوز رہتے ہیں جو ڈگریوں سے مالا مال ہیں اور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ (دفعدار محمد امیر' ۲۳ کیولری)

☆ یہاں کے استاد ایم اے اور بی ایڈ ڈگریوں کے مالک ہونے کے باوجود ہمیں کبھی گرے ہوئے نام سے نہیں بلاتے۔ میرا خیال ہے پاکستان آرمی کی دو تہائی خوش اخلاقی صرف اس کالج کے اساتذہ کے پاس ہے۔ (لانس نائیک حق نواز' ۶۲ ے کنسٹرکشن کمپنی انجینئرز)

متفرقات

☆ میں اس بات سے متفق ہوں کہ یہاں رمضان المبارک کی تراویح کی نماز زبردستی پڑھائی جاتی ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ (سپاہی شفیع' ۱۹۰ ورکشاپ کمپنی' پشاور)

☆ یہاں ایک کنٹین کا بندوبست بھی ہے' جہاں سے ضرورت کی چیزیں خریدنے پر طلبہ کا قیمتی وقت بچ جاتا ہے۔ (اے ایل ڈی

مقصوداحمد' ۱۲ کیولری)

☆یہاں کی زندگی کسی خوش نصیب ہی کونصیب ہوتی ہے۔(حوالدار بشیر احمد' ہیڈکوارٹرز سپیشل سروسز گروپ)

☆یہاں کے کمانڈنٹ ایک بریگیڈیئر ہیں جو کہ سکندر ہال میں آ کر اوپننگ ایڈریس کرتے ہیں۔(لانس نائیک محمد علی' ۳۹۹ سگنل کمپنی)

(معلوم نہیں مضمون نگار کا تبصرہ سکندر ہال کے استعمال پر ہے یا کمانڈنٹ کی کارکردگی پر' ویسے ہماری معلومات کی حد تک سکندر ہال اور بہت سے کاموں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح کمانڈنٹ اوپننگ ایڈریس کے علاوہ بھی اور بہت کچھ کرتے ہیں)

☆وقت کی پابندی اتنی زیادہ ہے کہ استاد چاہے چیف انسٹرکٹر کرنل ہو یا عام نائب صوبیدار' جب پیریڈ شروع ہوتا ہے تو وہ کلاس کے دروازے کے باہر ہی کھڑا مل جاتا ہے۔(نائک حاکم خان' بلوچ رجمنٹ)

(کچھ اندازہ نہیں ہوسکا کہ اس بیان میں تعریف کا پہلو ہے یا احتجاج کی جھلک)

☆نظم وضبط اور وقت کی پابندی کا یہ عالم ہے کہ تراویح کی نماز کے لیے ایک گھنٹہ مقرر ہے۔ادھر منٹوں کی سوئی بارہ پر پہنچتی ادھر مولوی صاحب کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔''السلام علیکم ورحمۃ اللہ''(حوالدار محمد ارشاد' ایف ایف رجمنٹ)

صاحبو۔۔۔۔۔۔!

ان تمام تبصروں کے جواب میں ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا ان مضمون نگاروں کی آراء سے متفق ہونا قطعی ضروری نہیں۔

◆◆◆

عالمگیرین کی ملن تقریب

جی ٹی روڈ کی رواں دواں ٹریفک میں دریائے جہلم کے اس پار اچانک ایک بس کی عقبی بتیاں روشن ہوتی ہیں۔بس سڑک سے ہٹ کر ایک طرف کھڑی ہوتی ہے۔اس سے دو صاحبان برآمد ہوتے ہیں اور ملٹری کالج گیٹ کی طرف بڑھتے ہیں جس کے اوپر آویزاں ایک بینر آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہا ہے۔دو چاق و چوبند کیڈٹ آگے بڑھتے ہیں اور آنے والے کے ہاتھوں سے اٹیچی کیس تھام کر انہیں استقبالیے میں لے جاتے ہیں۔انہیں کرسیوں پر بٹھایا جاتا ہے۔کیڈٹ اعجاز ایک رجسٹر سنبھالے بڑے ادب سے سوال کرتا ہے۔

''سر! آپ کا اسم گرامی؟''

دوسرے صاحب کے چہرے پر شرارتیں پھوٹ پڑتی ہیں وہ باآواز بلند چلاتے ہیں۔''ڈبو گھوڑا''

فضا میں قہقہے بکھر جاتے ہیں۔کیڈٹ دوسرے صاحب سے مخاطب ہوتا ہے۔''سر آپ کا نام؟''

اب پہلے کی باری ہے۔وہ آگے بڑھ کر میز پر مکہ مارتے ہوئے کہتے ہیں۔''کھٹا آلو''

ایک بار پھر سب لوگ کشت زعفران بن جاتے ہیں۔

یہ ملٹری کالج جہلم کے سابق طلبہ' عالمگیرین کی ملن تقریبات کا پہلا دن ہے۔پورا پاکستان بلکہ غیر ممالک سے بھی سابق طلبہ کھچے چلے آرہے ہیں۔ان میں حاضر سروس جنرل بھی ہیں' بریگیڈیئر بھی۔ہماری فضائیہ کے محافظ بھی ہیں اور سمندروں کے نگہبان بھی۔شہری زندگی کے ممتاز لوگ بھی ہیں اور وہ بھی کہ معاشی دوڑ میں پیچھے رہ گئے لیکن مادر علمی نے اتنے سالوں بعد آواز دی تو سب لوگ سراپا شوق چلے آئے۔کالج کے گیٹ سے داخل ہوتے ہی زندگی کئی سال پیچھے لوٹ گئی۔حسین بچپنا' معصوم قہقہے' بے ساختہ شرارتیں اور عمر رفتہ کی وہی بے فکری لوٹ آئی ہے جو کبھی زندگی کا وطیرہ ہوا کرتی تھی۔سنجیدگی کے نقاب کالج سے باہر پھینک دیئے گئے ہیں۔

عالمگیرین کی چوتھی ملن تقریبات کا پہلا دن ملنے ملانے' عمر رفتہ کو آواز دینے سے شروع ہوا۔جانے کب سورج مغرب میں روپوش ہوگیا۔مسجد سے تکبیر بلند ہوئی۔۔۔۔۔۔''اللہ اکبر' اللہ اکبر' اللہ اکبر' اللہ اکبر'' اور عالمگیرین میں کھلبلی مچ گئی۔کالج کا پرانا دستور چلا آتا ہے کہ نماز مغرب تمام کیڈٹ لازماً مسجد میں باجماعت ادا کرتے ہیں۔مسجد نئے اور پرانے عالمگیرین سے کھچا کھچ بھر

گئی۔امام صاحب کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"ایاک نعبدو ایاک نستعین اھدنا الصراط المستقیم"

''اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں' ہمیں سیدھا رستہ دکھا۔''

نماز سے فارغ ہو کر شرکاء رات کے کھانے کے لیے میس گئے۔ آٹھ بجے سب لوگ موئی ہال میں جمع ہوئے۔ طارق احسان کی تلاوت قرآن کے بعد کالج کے کمانڈنٹ بریگیڈیئر عبدالستار نے آنے والوں کو خوش آمدید کہا اور توقع ظاہر کی کہ کالج میں ان کا قیام خوشگوار ہوگا۔ مختصر خطاب کے بعد کمانڈنٹ نے پرانے عالمگیرین کو موجودہ طلبہ کی ڈرامیٹک سوسائٹی کے سپرد کر دیا۔ دبیز سرخ پردوں سے نمودار ہوئے کیڈٹ احمد سلیمان۔۔۔۔۔۔انہوں نے سوسائٹی کی طرف سے معزز مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور پروگرام کی ابتدا کے لیے کیڈٹ اعجاز ناصر اور اقبال برکی کو اسٹیج پر بلایا۔ تینوں نے مل کر ایک ملی نغمہ پیش کیا۔

اے وطن پیارے وطن پاک وطن
پاک وطن اے میرے پیارے وطن
تو دل افروز بہاروں کا تر و تازہ چمن
تو مہکتے ہوئے پھولوں کا سہانا گلشن
تو نوا ریز عنادل کا بہاری مسکن
رنگ و آہن سے معمور تیرے کوہ و دمن
اے میرے پیارے وطن!

نغمے کے بعد آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے ''خوبصورت بلا'' سے ایک مکالمہ پیش کیا گیا۔ جونیئر کیڈٹ جے سی ندیم نے شمسہ کا روپ دھار رکھا تھا' کیڈٹ خرم ہمدانی توفیق بنے ہوئے تھے اور باقی کرداروں کی نمائندگی کر رہے تھے' کیڈٹ عاطف' ندیم رضا اور عرفان۔ پورے مکالمے میں عرفان نے ایک لفظ بھی نہیں بولا لیکن عجیب وغریب میک اپ' چہرے کے تاثرات اور اپنی مختصر حرکات و سکنات سے انہوں نے وہ سماں باندھا کہ ڈرامے کے بعد تعارفی مرحلے پر ان کے سامنے آنے پر دیر تک ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔

''خوبصورت بلا'' کے بعد ایک اور نغمہ پیش کیا گیا۔

''اے نگار وطن تو سلامت رہے''

جونیئر کیڈٹ وقار حبیب اجمل اور ملک اعجاز بھی پہلے تین کیڈٹوں کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ نغمے کے بعد آغا حشر کے ڈرامے ''خواب ہستی'' سے ایک مزاحیہ مکالمہ پیش کیا گیا۔

جونیئر کیڈٹ طارق بھٹی ''فضیحتے'' کے روپ میں ایک تھانیدار (کیڈٹ طاہر اکبر) سے مخاطب تھے۔ ''زبان سنبھال کرورنہ ابھی موت کی ٹرین پر سوار کرکے قبرستان کے سٹیشن بھیج دیا جائے گا۔''

تھانیدار گرج کر بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں تیرے خیال کے انجن میں غرور کی سٹیم کچھ بڑھ گئی ہے جو زبان کی ریل آدمیت کی پٹڑی سے اتر گئی ہے۔''

فضیحتہ: جا بھئی جا! مقابلے کے پلیٹ فارم سے ہٹ جا' موت وحیات کے جنکشن سے سرک جا ورنہ ابھی بقا کی لائن سے فنا کی لائن پر بھیج دیا جائے گا۔

تھانیدار: تیری زبان تو شیخیوں کا دھواں اڑاتی ہے اور آنکھوں کی لالی دہشت کا سگنل دکھاتی ہے۔

فضیحتہ: جا بھئی جا' خاکساری کے ویٹنگ روم میں جا کر سو جا۔

تھانیدار: بس' اب زبان کی ڈاک گاڑی کو ٹھہرا دو۔

فضیحتہ: اے اوخدا گنج کے پسنجر' کیا سچ مچ موت کا ٹکٹ لے لیا ہے؟

تھانیدار: میں نے جواب لائن کلیئر دیا تو سمجھ لینا کہ موت کا پیغام دیا۔

فضیحتہ: تجھے لائن کلیئر دینے کی کیا مجال۔۔۔۔۔۔کانٹا بدلنے سے پہلے ہی تیری پٹڑی اکھاڑ دی جائے گی۔

تھانیدار: تیری اوقات تو ریل کا روالی ہے اور تو خیبر میل بنا پھرتا ہے۔

فضیحتہ: بس' اب زبان کی زنجیر کھینچ' کیا تجھے عقل کا گارڈ سامنے کھڑا دکھائی نہیں دیتا جو تجھے لال جھنڈی دکھا رہا ہے۔

ریلوے کی اصطلاحوں سے بھرپور یہ مکالمہ کانسٹیبلوں (کیڈٹ فخر سلطان اور کیڈٹ امجد علی) کی آمد پر ختم ہوا جو فضیحتے کو گرفتار کر کے لے گئے۔ دیر تک ہال قہقہوں اور تالیوں سے گونجتا رہا۔

آخر میں عصمت چغتائی کا لکھا ایک ایکٹ کا ڈرامہ ''شامت اعمال'' پیش کیا گیا۔

ایک شریف شہری مسٹر عباس (کیڈٹ اللہ نواز) کو سرراہ ایک بٹوہ پڑا ملتا ہے۔ دیانت کے تقاضے ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے وہ اخبار میں اشتہار دے دیتا ہے کہ ایک بٹوہ ملا ہے جس صاحب یا صاحبہ کو ہو نشانی بتا کر لے جائیں۔ بس مسٹر عباس کی شامت آجاتی ہے۔

ابتدا گھر ہی سے ہوتی ہے۔بیگم ریحانہ (کیڈٹ ندیم عامر) بپھری ہوئی ہیں۔''بٹوہ میرا ہے'وہی جو میرے بھائی نے پیرس سے بھجوایا تھا'چمڑے کا۔۔۔۔۔۔نہیں تو وہ جس پر ہاتھی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔۔وگرنہ پھر وہ۔۔۔۔۔۔''

بیگم ناراض ہو کر جاتی ہیں تو بندو (کیڈٹ سرفراز سیٹھی) ایک ایڈیٹر صاحب (جونیئر کیڈٹ فاروق) کو پیش کرتا ہے جو عباس صاحب کے مضامین اپنے اخبار میں چھاپنے کو عین سعادت قرار دیتے ہیں لیکن نشانی بتائے بغیر بٹوہ نہ ملنے پر پیر پٹختے چلے جاتے ہیں۔جاتے جاتے وہ ایک خاتون (کیڈٹ فصیح الرحمٰن) سے ٹکرا جاتے ہیں۔مسٹر عباس اس خاتون سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔

کیوں نہ ہوں۔۔۔۔۔۔۔خاتون اپنا تعارف ہی اتنے افسانوی انداز سے کرواتی ہے۔

''گو میری پرورش افسانوی دنیا میں ہوئی ہے اور میں موسم گرما کی حسین اور مہکتی ہوئی ہواؤں میں پلی ہوں لیکن پھر بھی مجھے ان لوگوں سے سخت نفرت ہے جو ابل کر پانی بھی نہیں پیتے۔میری عمر زعفران اور سوسن کے پودوں کے درمیان گزری ہے لیکن پھر بھی برسوں میرے ہونٹ متبسم نہیں ہوئے۔''

لیکن جب وہ اپنے محبوب کا پہلا تحفہ ''بٹوہ'' طلب کرتی ہیں تو عباس صاحب پھر سر پیٹ کر رہ جاتے ہیں۔جب ان سے بٹوے کا رنگ پوچھا جاتا ہے تو جواب ملتا ہے۔''میرا بچپن گل مہر کے پھولوں کے سائے میں گزرا ہے اسی وجہ سے کلر بلائنڈ ہوں۔'' خاتون جاتے جاتے ان کا قلم چوری کر لیتی ہے۔پھر تو بٹوے کے ''مالکوں'' کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ایک شاعر آتے ہیں (کیڈٹ محمود) ایک غنڈہ آتا ہے (جے سی ناصر ایوب) اور تو اور بندو کی نانی (کیڈٹ زاہد محمود) ہاتھ میں تسبیح لیے آتی ہے اور بٹوے ہی کی بات کرتی ہے۔پھر گھر کے باہر ایک ہجوم اکٹھا ہو جاتا ہے جس کا ہر فرد ''بٹوے کا مالک'' ہے۔پولیس کو فون کیا جاتا ہے۔پولیس انسپکٹر (جونیئر کیڈٹ طاہر محمود اکبر) دو کانسٹیبلوں (کیڈٹ فخر سلطان اور اصغر) سمیت آتا ہے اور بٹوے کا معائنہ کرتا ہے تو اس سے صرف پانچ آنے تین پیسے اور کان کی بالی برآمد ہوتی ہے اور بندو کی نانی اس بٹوے کی مالک ٹھہرتی ہے جس بے چاری کی بات کسی نے سنی ہی نہیں تھی۔

پروفیسر عین الدین علوی صاحب کی اس پیش کش کو دل کھول کر سراہا گیا۔ایک کپتان صاحب بھی ناظرین سے داد وصول کرتے پائے گئے کہ وہ معاون پروڈیوسر تھے۔

اس کامیڈی کے اختتام پر پروفیسر علوی صاحب نے بتایا کہ یہی ڈرامہ ۱۹۵۸ء میں بھی پیش کیا گیا تھا اور اس وقت جن کیڈٹوں نے مختلف کردار ادا کیے تھے وہ ملن کی تقریبات میں شامل ہیں۔ان سے درخواست کی گئی کہ وہ اسٹیج پر تشریف لائیں۔تالیوں کی

زبردست گونج میں جناب جلیل اے خان' جناب ارشد رانا اور رسول خان صاحب اسٹیج پر آئے۔موجودہ ''ریحانہ'' نے سابقہ ''ریحانہ'' کو آداب کیا۔سال رواں کے شاعر پرانے شاعر کے سامنے کورنش بجا لائے اور جدید ''غنڈے'' نے اپنے پیش رو سے ''ست پنجہ'' کیا۔

دسمبر کی پہلی صبح نمودار ہوئی تو کالج میں ہر سو آفتاب بکھرے ہوئے تھے۔آسمانوں کے سورج نے شرما کر بادلوں کی نقاب اوڑھ لی تھی۔تمام دن بوندا باندی کا سماں رہا۔یار لوگوں کو نئے سوٹوں اور شیروانیوں کی چمک دمک دکھانے کا خوب موقع ملا۔ساڑھے نو بجے کے قریب کالج کے پرانے طالب علم' چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی اور عالمگیرین ایسوسی ایشن کے صدر جنرل محمد اقبال خان تشریف لائے۔وہ بڑے سخت گیر منتظم ہیں اور کام کے معاملے میں کسی رو رعایت کے قائل نہیں۔غالباً کام کی زیادتی اور ذمہ داریوں کے بوجھ نے ان کے چہرے سے مسکراہٹیں اچک لی ہیں لیکن وہ کالج آئے تو مسرتیں ان کی پیشانی سے پھوٹی پڑتی تھیں۔وہ ہنس ہنس کر پرانے دوستوں سے ملے اور ٹوٹ کر ملے۔ان کے معاون پرسنل سٹاف آفیسر کمانڈر اعجاز رسول چوہدری حیران ہو ہو کر کبھی اپنے جنرل کا منہ تکتے' کبھی کالج کی دیواروں کو تاکتے۔

یہ کون سی جگہ ہے' آئے ہیں ہم کہاں پہ

ساڑھے دس بجے جنرل اقبال خان نے کالج کی نو تعمیر شدہ لائبریری کا افتتاح کیا۔پہلے اللہ رب العزت سے خیر و برکت کی دعا مانگی پھر کالج کے طلبہ سے خطاب کیا۔وہ کہہ رہے تھے۔''صحیح راستوں پر چلنے کے لیے ہم آپ کو روشنی تو مہیا کر سکتے ہیں لیکن قدم بڑھانا اور منزلوں کی طرف مستقل مزاجی سے چلتے رہنا آپ کے اپنے عزم پر منحصر ہے۔کتابیں نور ہیں' رہنمائی ہیں' بہترین ساتھی ہیں اور لائبریری کے قیام سے آپ کی دیرینہ ضروری پوری ہو گئی ہے۔''

ان سے پہلے کالج کے کمانڈنٹ بریگیڈیئر عبدالستار نے جنرل اقبال کا لائبریری کی تعمیر اور کتابوں کے بھرپور عطیے پر شکریہ ادا کیا اور امید ظاہر کی کہ کالج کو آئندہ بھی ان کی سرپرستی حاصل رہے گی۔

لائبریری کے افتتاح کے بعد عالمگیرین ایسوسی ایشن کی جنرل باڈی کا اجلاس موئی ہال میں منعقد ہوا۔جنرل اقبال خان نے اجلاس کی صدارت کی۔ایسوسی ایشن کے سیکرٹری پروفیسر عین الدین علوی نے سالانہ رپورٹ پڑھی۔پھر بحث مباحثے کی طویل نشست ہوئی جس میں ایسوسی ایشن کو مزید فعال بنانے' ضرورت مند عالمگیرین کی امداد اور کالج کی دیکھ بھال کے لیے متعدد فیصلے کیے گئے۔اس موقع پر ایسوسی ایشن کے نئے انتخابات بھی ہوئے۔جنرل اقبال خان کو آئندہ چار سالوں کے لیے دوسری بار بلا مقابلہ صدر

منتخب کرلیا گیا۔

اجلاس کے بعد موسیٰ ہال کے برآمدوں میں بڑا کھانا نوش کیا گیا۔ اس کے بعد پرانے عالمگیرین کالج کے چاروں طرف بکھر گئے۔ پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے گئے دنوں کی خوشگوار باتیں جمع کرنے کے لیے۔ کالج میوزیم توجہ کا مرکز تھا۔ یہاں کالج کے شہید طلبہ کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ میجر محمد اکرم شہید نشان حیدر کی انگریزی کی نوٹ بک تھی' لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید ستارۂ جرات (دوبار) کی یونیفارم تھی۔ وہ شیلڈیں تھیں جو کالج جیتتا رہا ہے اور وہ پتھر تھے جو مختلف موقعوں پر مختلف جگہوں پر نصب ہوتے رہے۔ جنرل محمد اقبال خان کی طرف سے پیش کی گئی تصویروں کی ایک البم بھی تھی جس میں خود ان کی بطور کیڈٹ تصویریں بھی موجود تھیں۔

رات گئے موسیٰ ہال میں پھر ورائٹی پروگرام کا اہتمام تھا۔ لیکن آج باگ ڈور پرانے عالمگیرین کے ہاتھوں میں تھی۔ سٹیج سیکرٹری تھے جناب ظہور شوکت جنجوعہ صاحب اور لیفٹیننٹ کرنل عبدالرحیم' بعد میں لیفٹیننٹ کرنل رب نواز نے بھی ان کا ساتھ دیا اور پرانے عالمگیرین کو تاک تاک کر اسٹیج پر لایا گیا۔

یونس کیانی صاحب نے جو آج کل واہ فیکٹری میں ہیں' اقبال کی نظم سنائی۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں

شاہد احمد نواز نے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مل کر علامہ اقبال کے کلام سے جبریل و ابلیس کا ایک مکالمہ پیش کیا۔ لیفٹیننٹ کرنل ولی احمد خان نے حاضرین کو ہنسنے کے لیے مختلف انداز بتائے لیکن سب لوگ ایک ہی انداز سے قہقہے برساتے رہے۔ جناب چوہدری خادم حسین نے مترنم آواز میں غزل پیش کی۔

تم سے تمہارے گاؤں میں
پہلے ملن کی چھاؤں میں
آنکھیں تھیں چار کیوں
یہ نہ بتا سکوں گا میں
دل کو ہے تم سے پیار کیوں
یہ نہ بتا سکوں گا میں

بریگیڈیئر محمد حیات (ریٹائرڈ) ستارۂ جرات نے پشتو میں ایک نعت سنائی۔ خوشحال خان خٹک کا کلام سنایا اور پنجابی کے لطیفے ------میجر ساجد بھٹی نے ایک گیت پیش کیا۔

یہ راتیں یہ موسم یہ ہنسنا ہنسانا
انہیں بھول جانا' ہمیں نہ بھلانا

نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز کے ڈائریکٹر بریگیڈیئر محمد سعید کھوکھر جو ملٹری کالج کے کمانڈنٹ بھی رہے ہیں' اسٹیج پر آئے اور ذاتی تاثرات اتنی شگفتگی سے بیان کئے کہ ہر طرف مسکراہٹیں بکھر گئیں۔ انسٹیٹیوٹ کے طلبہ وطالبات کو یہ بات شاید مبالغہ نظر آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ کالج میں آ کر بریگیڈیئر سعید کھوکھر کا رویہ انتہائی حیران کن حد تک شگفتہ تھا۔

ایک اور سابق کمانڈنٹ ریٹائرڈ لیفٹیننٹ کرنل سید فیاض حسین زیدی نے کالج پر ایک نظم سنائی۔ راقم الحروف نے اس موقع پر ''پرانے عالمگیرین کے تاثرات'' کے عنوان سے ایک نظم پیش کی۔

پھر لیفٹیننٹ کرنل رب نواز نے مختلف افراد کو اسٹیج پر بلایا۔ لیفٹیننٹ کرنل محمد افسر کو بلا کر ان کے بال سفید ہونے کی وجہ دریافت کی گئی۔ بتایا ''میں شمالی علاقوں میں متعین تھا۔ برف پڑی تو سر پر بھی پڑ گئے' آج تک نہیں پگھلی۔''

سابقہ طالب علم امام دین کو بلایا گیا۔ وہ کالج میں تھے تو بہترین باکسر تھے اور اس دن وہی کالج بلیزر پہن رکھا جو وہ کالج کے دنوں میں پہنا کرتے تھے۔ انہوں نے خوشگوار یادیں مختصراً بیان کیں اور آخر میں اسٹیج سے اعلان کیا گیا کہ وہ طالب علم سٹیج پر آئے جس کا قیام سب سے زیادہ رہا ہو۔ بولی پانچ سال سے شروع ہوئی۔ کئی ہاتھ اٹھے۔ ''چھ سال'' کچھ ہاتھ نیچے رہ گئے۔ ''سات سال'' ------''آٹھ سال'' ------''نو سال'' ------صرف دو ہاتھ بلند تھے۔ ''دس سال'' صرف ایک ہاتھ باقی رہ گیا۔ انہیں اسٹیج پر بلایا گیا' یہ تھے میجر رفیق۔ انہوں نے ذاتی تجربات بیان کئے وہ ہاکی کے کلر ہولڈر تھے' فٹ بال کے بھی ------باکسر بھی رہے تھے جمناسٹ بھی' مباحثوں میں بھی حصہ لیتے رہے اور ------''تعلیمی حالت کیا تھی؟'' طلبہ نے نعرے لگائے۔ میجر رفیق گول کر گئے۔ ''دس سال تک کالج میں کیسے رہے؟'' لیکن انہوں نے مختلف باتوں میں الجھائے رکھا۔ یہ بات سربستہ راز ہی رہی کیونکہ جو لڑکا فیل ہو جائے وہ گھر بھیج دیا جاتا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پہلے کالج پانچویں جماعت سے شروع ہوتا تھا۔ پانچویں سے بارہویں تک آٹھ سال تو لگتے ہیں۔ دو سال کا عرصہ پھر بھی ناقابل فہم ہی رہا۔

رات گئے اس تقریب کا اختتام ہوا۔

ملن تقریبات کے آخری دن کالج کی سرگرمیاں عروج پر پہنچ گئیں کہ دو دسمبر کو یوم والدین بھی تھا۔ نئے اور پرانے عالمگیرین کے علاوہ طلبہ کے والدین' بہن بھائی اور دوسرے اعزا و اقارب بھی کثیر تعداد میں آئے تھے اور کالج کی رونق دوبالا ہو گئی تھی۔ سورج سے رہا نہ گیا اور وہ بادلوں کی دبیز تہیں ہٹا کر بہ نفس نفیس جلوہ فگن ہوا۔ سورج کی چمکیلی شعاعوں میں ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ سب لوگوں نے کالج گراونڈ میں نشستیں سنبھال لیں۔

دس بجے بگل بجے اور مہمان خصوصی جنرل محمد اقبال خان میدان میں آئے۔ پہلے کالج سٹاف سے ان کا تعارف کرایا گیا پھر جب انہوں نے سلامی کے چبوترے پر اپنی جگہ سنبھال لی تو گراونڈ میں ترتیب سے کھڑے کیڈٹوں نے بینڈ کی دھنوں پر کالج ترانہ پیش کیا۔

ملٹری کالج جہلم' زندہ تابندہ پائندہ باد

ترانے کے بعد پریڈ کمانڈر جونیئر امیر مختار نے مہمان خصوصی کو رپورٹ دی کہ پریڈ برائے معائنہ حاضر ہے۔ معائنے کے بعد جونیئر کیڈٹوں نے آہستہ مارچ میں سلامی دی۔ بعد ازاں پورے کالج میں کے طلبہ مارچ پاسٹ کرتے ہوئے ڈائس کے سامنے سے گزرے۔ سکول ونگ کی قیادت کر رہے تھے' کیڈٹ طارق محمود خان اور اناؤنسر بوتھ سے جناب مشتاق صاحب اقبال کے شعروں سے مزین کمنٹری کر رہے تھے۔

”یہ ان غازیوں کے بیٹے ہیں جنہوں نے باطل کو نیچا دکھایا اور حق کو سر بلند کیا۔ یہ ان شہیدوں کے جگر گوشے ہیں جنہوں نے اپنے خون سے شجر اسلام کی آبیاری کی۔

زمانہ لے کے جنہیں آفتاب کرتا ہے
انہی کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

سامنے بابر ہاؤس کے کیڈٹ گزر رہے تھے جن کی قیادت کر رہے تھے کیڈٹ عامر جاوید' محمود غزنوی ہاؤس کے قائد تھے۔ کیڈٹ شفیق الرحمٰن اور ڈرل میں اول آنے والے ہاؤس شیر شاہ کے کیڈٹ سینہ تانے رواں دواں تھے۔ کیڈٹ امجد علی کی قیادت میں اور مشتاق صاحب کہہ رہے تھے۔

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مارچ پاسٹ کے بعد کالج کی جوڈو کراٹے ٹیم نے اس فن کا مظاہرہ پیش کیا اس کی ابتدا میں ایک سو سال پہلے ۱۸۸۳ء میں ٹوکیو سے ہوئی تھی۔ اس کا بانی جائی گورو کانو تھا۔ ۱۹۶۴ء میں اس کھیل کو پہلی مرتبہ ٹوکیو اولمپکس میں شامل کیا گیا۔ پاکستان آرمی کے اسپیشل سروس گروپ کے حوالدار غلام احمد' لانس نائیک محمد نصیر اور لانس نائیک عبدالمجید نے دن رات کی محنت کے بعد کالج کی ٹیم کو اتنا مشاق اور ماہر بنا دیا کہ ان میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہاتھ کی مدد سے اینٹ توڑ سکتے تھے۔ کیڈٹ سلمان ناصر نے ایک سیکنڈ میں مکے' کہنی اور ہتھیلی کے کنارے کی مدد سے تین اطراف میں رکھے لکڑی کے بورڈ توڑے۔

اس کے بعد کالج کی جمناسٹک ٹیم نے طاقت و ہمت' لوچ و لچک اور حرکت و عمل کے بہترین مظاہرے پیش کئے۔ آخر میں ایک رکاوٹ کے اوپر ایک رنگ رکھا گیا جس پر کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ اس کپڑے پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ جمناسٹک کی پوری ٹیم ایک ایک کر کے اس رنگ سے گزر گئی۔

مجھے سزا کے لیے بھی نہیں قبول وہ آگ
کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بے باک

کیڈٹ عثمان خلیل اور جونیئر کیڈٹ عبدالقیوم کو بہترین جمناسٹ قرار دیا گیا۔

کالج کی رائڈنگ ٹیم میدان میں آئی تو حاضرین نے تالیاں بجا کر ان کا استقبال کیا۔ کیڈٹوں نے پہلے میدان کے چکر لگائے پھر ایک جلتے ہوئے فائرنگ رنگ سے گھوڑوں سمیت گزرے۔ بعد ازاں کیڈٹ سیف اللہ اور شجاع ڈوگر نے اونچی اونچی رکاوٹیں عبور کرنے کا دلچسپ مظاہرہ پیش کیا۔ آخر میں کیڈٹ عبدالحکیم' بابر کیانی' احمد سعید اور سیف اللہ ملک نے نیزہ بازی کا مظاہرہ کیا۔ اس ٹیم کو تیار کرنے کا سہرا لانس نائیک نثار احمد کے سر بندھتا ہے۔ کیڈٹ زاہد اسحاق کو بہترین شہ سوار قرار دیا گیا۔

جسمانی تربیت کے ان مظاہروں کے بعد کالج کی ذہنی و اخلاقی سرگرمیوں کی ایک جھلک پیش کی گئی۔ کیڈٹ محمد صغیر نے نہایت خوش الحانی سے تلاوت کی۔ کیڈٹ حبیب اعظم' عمر مرزا' آصف اسحاق اور علی رضا علاقائی لباسوں میں ملبوس تھے۔ چاروں نے ”میں پاکستان سے کیوں محبت کرتا ہوں“ کے موضوع پر مختصر تقاریر کیں۔ پھر کیڈٹ زاہد محمود نے ”شاد باد منزل مراد“ کے عنوان پر خوبصورت تقریر کی۔ بعد ازاں سب نے مل کر قومی نغمہ پیش کیا۔ ”یہ تیرا پاکستان ہے' یہ میرا پاکستان ہے“

اس کے بعد کالج کے کمانڈنٹ بریگیڈیئر عبدالستار نے سالانہ رپورٹ پیش کی۔ حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے بریگیڈیئر عبدالستار نے کہا۔ ”اس مبارک تقریب کے موقعہ پر میں یہ بتانے میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ اس سال اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک غیر

معمولی امتیاز اور اعزاز سے نوازا اور وہ یہ کہ اس سال ہمارے تین سابق طلبہ نے پینسٹھویں اور چھیاسٹھویں پی ایم اے کورس اور پی اے ایف ایروناٹیکل انجینئرنگ کالج میں تین اعزازی تلواریں حاصل کیں۔ نہ صرف یہ بلکہ چھیاسٹھویں پی ایم اے کورس میں صدر کا طلائی تمغہ پی اے ایف ایروناٹیکل کالج کی چیف آف ایئر سٹاف ٹرافی اور آرمی سکول آف ایوی ایشن کی حالیہ پاسنگ آؤٹ پریڈ پر صدر کی ٹرافی بھی عالمگیریز ہی کو عطا ہوئی۔ یہ اعزازات اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ آرمی نے کالج کو جو وسائل مہیا کئے ہیں اور جو ذمہ داریاں سونپی ہیں الحمدللہ اس ادارہ نے ان سے پورا انصاف کیا ہے اور کر رہا ہے۔"

کسی تعلیمی ادارے کی کارکردگی کا ایک معیار اس کے امتحانی نتائج بھی ہوتے ہیں۔ اس سال میٹرک کے ۷۵ طلبہ میں سے ۴۷ نے A گریڈ نمبر لیے اور مجموعی طور پر نتیجہ ۹۹ فیصد رہا۔ اسی طرح انٹرمیڈیٹ کا نتیجہ ۸۷ فیصد رہا۔

تعلیمی لحاظ سے نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والے

۱۔ بارھویں جماعت (سائنس)۔۔۔۔۔۔۔اول۔۔۔۔۔۔کیڈٹ انیس الدین علوی۔۔۔۔۔۔ٹیپو سلطان ہاؤس

۲۔ بارھویں جماعت (آرٹس)۔۔۔۔۔۔۔اول۔۔۔۔۔۔کیڈٹ حبیب احمد۔۔۔۔۔۔۔محمود غزنوی ہاؤس

۳۔ جے سی۔ ۱۲۔۔۔۔۔۔۔پہلی ٹرم میں اول۔۔۔۔۔۔۔۔جے سی نسیم حسن۔۔۔۔۔۔ٹیپو سلطان ہاؤس

۴۔ جے سی۔ ۱۲۔۔۔۔۔۔۔دوسری ٹرم میں اول۔۔۔۔۔۔۔۔جے سی نسیم حسن۔۔۔۔۔۔ٹیپو سلطان ہاؤس

۵۔ جے سی۔ ۱۲۔۔۔۔۔۔۔پہلی ٹرم میں اول۔۔۔۔۔۔۔۔جے سی امجد محمود۔۔۔۔۔۔۔ٹیپو سلطان ہاؤس

۶۔ دسویں جماعت (بورڈ)۔۔۔۔۔۔۔اول۔۔۔۔۔۔کیڈٹ سہیل اطہر صدیقی۔۔۔۔۔۔۔بابر ہاؤس

۷۔ نویں جماعت۔۔۔۔۔۔۔اول۔۔۔۔۔۔کیڈٹ ساجد شکور۔۔۔۔۔۔۔شیر شاہ ہاؤس

۸۔ آٹھویں جماعت۔۔۔۔۔۔۔اول۔۔۔۔۔۔کیڈٹ محمد زبیر۔۔۔۔۔۔۔شیر شاہ ہاؤس

میڈل حاصل کرنے والے طلباء

۱۔ بارھویں جماعت (بورڈ) کے امتحان میں کالج میں اول آنے پر کمانڈنٹس میڈل' کیڈٹ انیس الدین علوی' ٹیپو سلطان ہاؤس۔

۲۔ دسویں جماعت (بورڈ) کے امتحان میں چوتھی پوزیشن حاصل کرنے اور کالج میں اول آنے پر کمانڈنٹس میڈل' کیڈٹ سہیل اطہر صدیقی' بابر ہاؤس۔

شیلڈیں اور ٹرافیاں

*مباحثے:

۱۔ انٹر ہاؤس انگریزی' مباحثہ اول' محمود غزنوی ہاؤس' مقررین' احمد سلمان اور ندیم عامر

۲۔ انٹر ہاؤس انگریزی' برجستہ مباحثہ (اول)' محمود غزنوی ہاؤس' مقررین' ذکاء اللہ اور فواد علی

۳۔ انٹر ہاؤس انگریزی' اردو مباحثہ (اول)' محمود غزنوی ہاؤس' مقررین' عمر قریشی اور مسعود احمد

۴۔ انٹر ہاؤس انگریزی' برجستہ (اول)' شیر شاہ ہاؤس' مقررین' اظہار شاہ اور زاہد محمود

☆کھیلیں:

۵۔ انٹر ہاؤس تیراکی کا مقابلہ' اول' شیر شاہ ہاؤس

۶۔ انٹر ہاؤس ہاکی' اول' محمود غزنوی ہاؤس

۷۔ انٹر ہاؤس فٹ بال' اول' محمود غزنوی ہاؤس

۸۔ انٹر ہاؤس کرکٹ' اول' محمود غزنوی ہاؤس

۹۔ انٹر ہاؤس باسکٹ بال' اول' شیر شاہ ہاؤس

۱۰۔ انٹر ہاؤس اتھلیٹکس' اول' محمود غزنوی ہاؤس

۱۱۔ انٹر ہاؤس ڈرل' اول' شیر شاہ ہاؤس

۱۲۔ انٹر ہاؤس باکسنگ' اول' محمود غزنوی ہاؤس

۱۳۔ انٹر ہاؤس پی ای ٹیسٹ' اول' بابر ہاؤس

۱۴۔ انٹر ہاؤس شوٹنگ (نشانہ بازی)' اول' شیر شاہ ہاؤس

۱۵۔ انٹر ہاؤس کراس کنٹری' اول' بابر ہاؤس (یہ شیلڈ ۲۳ کمانڈو نے عطا کی)

۱۶۔ انٹر ہاؤس ٹیبل ٹینس' اول' محمود غزنوی ہاؤس (یہ ٹرافی کالج کے ایک سابق طالب علم احمد علی نے عنایت کی۔

☆ون کور شیلڈ:

۱۷۔ مقابلہ خطابت' اول' بابر ہاؤس

☆اکیڈمیکس شیلڈ:

یہ شیلڈ بورڈ میں اور کالج کے داخلی امتحانات میں بہترین کارکردگی کی بنا پر دی جاتی ہے۔
تعلیمی معیار تعلیمی لحاظ سے اول بابر ہاؤس (یہ شیلڈ ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن کور نے عطا کی) کیڈٹ عثمان نے وصول کی۔

☆انٹر ہاؤس سپورٹس ٹرافی: محمود غزنوی ہاؤس (یہ شیلڈ دوران سال کھیلوں میں بہترین کارکردگی پر دی جاتی ہے۔ (یہ شیلڈ چیئرمین جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی نے عطا کی) کیڈٹ وقار شاہ نے وصول کی۔

☆سی او اے ایس شیلڈ: محمود غزنوی ہاؤس (کیڈٹ شاہد اکبر باجوہ نے وصول کی۔

مہمان خصوصی جنرل محمد اقبال خان نے اس موقع پر دو گولڈ میڈل دینے کا اعلان کیا۔ ایک چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی کہلائے گا اور بورڈ کے امتحان میں مطالعہ پاکستان میں اول آنے والے کیڈٹ کو دیا جائے گا جبکہ دوسرا میڈل سائنس کے مضامین میں بہترین کارکردگی پر عطا کیا جائے گا۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"یہ امر باعث اطمینان ہے کہ کالج میں تدریسی سرگرمیوں اور امتحانات کے اچھے نتائج کے ساتھ ساتھ ان مختلف مشغلوں پر بھی پوری توجہ دی جا رہی ہے جنہیں تعلیم کا جوہر اصلی کہنا چاہیے اور جو شخصیت کے پھلنے پھولنے میں مدد دیتی ہیں۔ میں اس موقع پر ایک ایسی حقیقت کی یاددہانی بھی کرانا چاہوں گا جسے بار بار دہرانا غیر موزوں نہیں ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ قوم کی سب سے بڑی ضرورت نصب العین کا شعور ہے اور اس کے بعد ڈسپلن۔ ہمارا نصب العین ہے اچھے پاکستانی اور اچھے مسلمان تیار کرنا۔ مجھے امید ہے کہ کالج اس نصب العین کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے گا اور یہاں ڈسپلن کی وہ مثالی تربیت بھی ملتی رہے گی جو فوج ہی کے لیے نہیں بلکہ قومی زندگی کے ہر شعبے میں استحکام پیدا کرتی ہے۔

انہوں نے طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔" یاد رکھئے زندگی میں کامیابی کا راز محنت، مسلسل محنت ہے۔ دنیا میں محنت کا کوئی بدل نہیں۔ اپنی تعلیمی سرگرمیاں پوری تندہی کے ساتھ جاری رکھئے۔ اگر طالب علم کی حیثیت سے آپ اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے رہیں گے تو آئندہ زندگی کے ہر مرحلے کو جرات اور اعتماد کے ساتھ طے کریں گے اور پاکستان کی ترقی میں اپنا حصہ ادا کر سکیں گے۔"

مہمان خصوصی کے خطاب کے بعد تمام حاضرین کی چائے اور دیگر لوازمات سے تواضع کی گئی اور یوں دوپہر کے قریب عالمگیرین کی ملن تقریبات اور یوم والدین کی سالانہ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

◆◆◆

چھاؤنی، میلہ اور عوام

یہ کھیل پہلی مرتبہ ہم نے فوجی میلوں میں ہی دیکھا، کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ کھیل ہماری قوم کے مجموعی مزاج سے بہت ملتا جلتا ہے۔ پہلے دیکھتے ہیں، کھیل کیا ہے۔۔۔۔۔۔

دشمن کے سپاہی کا ایک پتلا فوجی وردی میں کھڑا ہے۔ سر پر سٹیل ہیلمٹ ہے۔ اس سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر ایک لکیر ہے۔ دشمن کے سپاہی کو مارنے کا خواہش مند کھیل کے منتظمین کو ایک روپیہ ادا کرتا ہے اور اس لکیر پر آ کھڑا ہوتا ہے۔ اسے ایک ٹوپی پہنائی جاتی ہے جو اس کے پورے چہرے کو ڈھانپ لیتی ہے۔ پھر اسے گھما دیا جاتا ہے تاکہ ٹارگٹ کی سمت کا تعین مشکل ہو جائے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھمایا جاتا ہے۔ اب وہ اندازے سے ٹارگٹ کی سمت چلنا شروع کرتا ہے۔ میدان کے چاروں طرف کھڑے تماشائی چیخ چیخ کر اس کی "رہنمائی" کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"دائیں، بائیں، سجے، کھبے، آگے، پیچھے"

جوں جوں وہ ٹارگٹ کے قریب ہوتا ہے، تماشائیوں کا شور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ منتظمین میں سے ایک شخص وسل لیے "حملہ آور" کے اردگرد سیٹی بجاتا رہتا ہے کہ وہ تماشائیوں کے مشورے نہ سن سکے۔ اس سارے شور شرابے میں اگر وہ ٹارگٹ کے قریب پہنچ کر اس کے سر پر ڈنڈا رسید کر دے تو کامیاب۔ اسے ایک کے بدلے پانچ روپے مل جاتے ہیں لیکن اگر ٹارگٹ کے دائیں بائیں سے آگے نکل جائے یا ڈنڈا چلائے لیکن ٹارگٹ کو نہ لگے تو ناکام۔

ملکی سطح پر منصوبہ بندی کی بھی یہی حالت ہے۔ بنیادی اعداد و شمار ہی میسر نہیں۔ انکل پچو سے کام چلاتے ہیں۔ اندازے سے کوئی ٹارگٹ مقرر کر کے اس طرف بڑھتے ہیں تو مشیروں اور خیر خواہوں کی طرف سے بیان بازی کا ایک شور اٹھتا ہے۔ نتیجہ ہم سب کے سامنے ہے۔

یہ کھیل بنوں عاقل چھاؤنی میں لگنے والے فوجی میلے کا مقبول ترین کھیل تھا۔ جیسے دیہات میں فصلوں کی کٹائی کے بعد کسی نہ کسی میلے، مقابلے اور اکٹھ کا اہتمام ہوتا ہے اسی طرح فوج میں موسم سرما کی اجتماعی مشقوں کے بعد کسی ایسی تقریب کا اہتمام ہوتا ہے جو محنت و مشقت کی تھکن اتار کر طبیعت میں بشاشت پیدا کر دے۔ بنوں عاقل چھاؤنی میں لگنے والا یہ میلہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

چند سال پہلے جب پنوں عاقل چھاؤنی قائم کی گئی تو سندھ کے کچھ وڈیروں اور جاگیرداروں کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ ان کے ایماء پر سکھر' پنوں عاقل اور دوسرے شہروں میں جلسے کئے گئے' جلوس نکالے گئے اور بھولے بھالے عوام کو ورغلانے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ میلے میں آنے والے ایک صحافی نے بتایا کہ ان دنوں ان کے اخبار کی طرف سے ان کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ عوام میں گھوم پھر کر ایک سروے کریں اور لوگوں سے پوچھیں کہ انہیں چھاؤنی کے قیام پر کیا اعتراض ہے۔ انہوں نے چھاؤنی کے خلاف نکلنے والے ایک جلوس کے شرکاء سے پوچھا تو بیشتر کا جواب یہ تھا کہ "سائیں ہمیں نہیں پتہ کہ چھاؤنی کا فیدہ یا نسکان کیا ہے' ہمیں تو وڈے سائیں نے کہا ہے کہ جلوس نکالو۔۔۔۔۔۔۔ تو ہم نکال رہے ہیں۔"

لیکن جب چھاؤنی قائم ہو گئی تو لوگوں کو پتہ چلا کہ اس میں ان کا سراسر فائدہ ہی فائدہ تھا' نقصان کچھ نہ تھا۔ ہاں ان لوگوں کا نقصان ضرور ہوا ہے جنہوں نے سادہ لوح لوگوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا اور جو چند ہزار روپے قرض دے کر پورے کے پورے خاندان کو گروی رکھ لیتے تھے۔ خاندان بھر کی عورتیں' بچے' مرد' جوان اور بوڑھے وڈے سائیں کی زمینوں پر' بھٹوں پر سالہا سال کام کرتے تھے اور سود تک ادا نہ ہوتا تھا۔ اصل زر تو اپنی جگہ قائم رہتا تھا۔ فوج نے بلاشبہ لوگوں کو عزت سے زندگی گزارنے کا شعور بخشا ہے۔

چھاؤنی میں رہنے والے تمام فوجیوں کی ضروریات اردگرد کے علاقوں سے پوری ہوتی ہیں۔ دودھ' گوشت' انڈے' سبزیاں اور دیگر اشیاء اردگرد کے علاقوں سے مہیا ہوتی ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف دیہات کے لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہوا ہے بلکہ سکھر شہر کی معیشت پر بھی بڑے مثبت اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ پھر شمالی علاقوں کی طرف سندھ میں مقیم فوجی یونٹوں کو بھی ہدایات ہیں کہ وہ جہاں بھی مشقوں کے لیے باہر جائیں' مفت طبی کیمپ قائم کریں اور اردگرد کے لوگوں کو علاج معالجے کی سہولت مہیا کریں اور دواؤں کی فراہمی یقینی بنائیں۔ اس طرح دیہات کے لاکھوں افراد اب تک فوج کے طبی کیمپوں سے مستفید ہو چکے ہیں۔

چھاؤنی کا سب سے بڑا فائدہ تعلیمی میدان میں ہوا ہے۔ ظاہر ہے فوج کے اپنے اسکول اور کالج ہیں۔ جن میں کوئی ہڑتال ہوتی ہے' نہ دنگا فساد' کلاسیں معطل ہوتی ہیں نہ لڑائی جھگڑا۔۔۔۔۔۔۔ اسی وجہ سے ان اداروں میں تعلیم کا معیار بہتر ہوتا ہے۔ اور سول حضرات کی بجا طور پر خواہش ہوتی ہے کہ اپنے بچوں کو فوجی سکولوں میں داخل کرائیں۔ پنوں عاقل چھاؤنی میں ایف جی سکولوں میں شہری طلبہ کا تناسب ۶۵ فیصد جبکہ فوجیوں کے بچوں کا ۳۵ فیصد ہے۔ آرمی پبلک سکول میں بھی شہریوں کے بچوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ حال ہی میں سکھر کے شہریوں کے پرزور اصرار پر دریائے سندھ کے عین کنارے "بکھر آئی لینڈ" میں ایک آرمی پبلک سکول کھولا گیا ہے جہاں شہریوں کے بچوں کی تعداد ۸۰ فیصد ہے۔ شہریوں کے حق میں داخلوں کے اس تناسب کے باوجود ہر سال بہت

سے شہریوں کو شکایت رہ جاتی ہے کہ ان کے بچوں کو فوجی سکولوں میں داخلہ کیوں نہیں ملا۔

یہ تو تھے چھاؤنی کے قیام سے اردگرد کے علاقوں کے لوگوں کے لیے فائدے۔ خود چھاؤنی کے باسیوں کو بہت سی مشکلات کا سامنا ہے۔ کسی نے چھٹی جانا ہو تو وہ ایک عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ عام طور پر چھٹی منظور ایسے ہوتی ہے کہ صرف ایک آدھ دن پہلے چھٹی کی منظوری کا پتہ چلتا ہے۔ بعض اوقات تو اتنی مہلت بھی نہیں ملتی۔ اب زیادہ تر گاڑیاں پنوں عاقل ریلوے اسٹیشن پر رکتی ہی نہیں ہیں۔ ان میں بیٹھنے کے لیے سکھر جانا پڑتا ہے اور وہیں سے بکنگ بھی کروانی پڑتی ہے۔ اگرچہ حال میں اس مسئلے کا تھوڑا بہت حل نکالا گیا ہے کہ پنجاب کی طرف جانے والی بسوں کے مالکان نے فوجیوں کے لیے مخصوص کوٹے مقرر کر دیئے ہیں۔ طویل سفر پر جانے والوں کے گاڑیوں میں تحفظ نشست کا مسئلہ اپنی جگہ ہے۔

جیسے ہم نے ہم نے پہلے ذکر کیا کہ چھاؤنی میں ضروریات زندگی اردگرد کے علاقوں سے فراہم ہوتی ہیں۔ اس سے بہت سے لوگوں نے ناجائز فائدہ بھی اٹھانے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سبزیاں اور گوشت کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ پنوں عاقل چھاؤنی کے موجودہ جی او سی میجر جنرل احسان الحق (ہمارے پریس جانے تک وہ جی ایچ کیو میں تعینات ہو چکے ہیں) نے اس مسئلے کا ایسا تسلی بخش حل نکالا ہے جو لاثانی بھی ہے' قابل داد بلکہ کہنا چاہیے قابل تقلید بھی۔ انہوں نے چھاؤنی کی تمام وہ زمین جو ابھی تک بے کار پڑی تھی' یونٹوں میں تقسیم کر دی گئی اور ہدایات جاری کیں کہ شام کو کھیلوں کے پیریڈ کی بجائے کھدائی' بیجائی' نلائی اور گوڈی ہوا کرے گی۔۔۔۔۔۔۔ بنجر زمین کو لہلہاتی فصلوں میں تبدیل کرنے کے مقابلے ہوں گے۔ کوشش رنگ لائیں۔ اس سے نہ صرف چھاؤنی کی خوبصورتی میں اضافہ ہوا بلکہ چھاؤنی کے باسیوں کو سستی سبزیاں بھی میسر آئی ہیں۔ چھاؤنی میں اگنے والی تمام سبزیاں فوجیوں کو بلا امتیاز ایک روپیہ فی کلو فراہم کی جاتی ہیں۔ دوسری چھاؤنیوں کے لیے بلاشبہ یہ ایک کھلا چیلنج ہے۔ دیکھیں کون مقابلے پر آتا ہے۔

گوشت کی سستے داموں فراہمی کے لیے بھی اقدامات کئے جا رہے ہیں اور عنقریب یہاں کے باسیوں کو اس سلسلے میں بھی جلد خوشخبری ملے گی۔

تو بات پنوں عاقل میں ہونے والے فوجی میلے کی ہو رہی تھی۔ چھاؤنی کے دروازے عوام کے لیے کھول دیئے گئے تھے۔ داخلے کی کوئی فیس نہیں رکھی گئی تھی۔ سکھر سے صحافیوں کی ایک ٹیم کو بطور خاص میلے میں شرکت کی دعوت دی گئی اور ان کے لانے لے جانے کا خاص اہتمام کیا گیا۔ چند صحافیوں کی فرمائش پر دوسرے دن ان کے اہل خانہ کے لیے بھی یہ انتظامات کئے گئے۔

میلے کا افتتاح کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل محمد افضل جنجوعہ نے کیا۔ (وہ بھی آج کل جی ایچ کیو میں تعینات ہیں) اس موقع پر سول حکام کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی۔ سندھ کے سابق کور کمانڈر لیفٹیننٹ جہاں داد خان صاحب خاص طور پر اس تقریب میں شرکت کے لیے تشریف لائے۔ جی او سی پنوں عاقل میجر جنرل احسان الحق نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقع پر جی او سی حیدر آباد میجر جنرل مینک کیزاد سپاری والا بھی موجود تھے۔ افتتاح کے بعد کور کمانڈر معزز مہمانوں کی معیت میں مختلف سٹالوں پر گئے۔ میلے کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں میڈیکل بٹالین کی طرف سے ایک کیمپ لگایا گیا تھا جس میں ہر طرح کے مریضوں کے معائنے اور دواؤں کی مفت فراہمی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ میلے سے پہلے بھی اس میڈیکل بٹالین کی طرف سے سندھ کے مختلف دیہات میں بھی کیمپ لگائے گئے تھے جہاں ہزاروں افراد کا معائنہ کیا گیا اور انہیں بلا معاوضہ دوائیں فراہم کی گئیں۔ میلے کے دوران بھی سینکڑوں افراد نے اس سہولت سے فائدہ اٹھایا۔

آرمی سلیکشن اینڈ ریکروٹمنٹ سنٹر کی طرف سے بھی ایک سٹال لگایا گیا تھا جہاں آرمی کے کیلنڈر اور سٹکرز قیمتاً دستیاب تھے۔ لوگوں نے سینکڑوں کی تعداد میں یہ کیلنڈر اور سٹکرز خریدے جس سے ان کی فوج میں دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ میلے میں میٹرک پاس جوانوں کی بھرتی کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ حال ہی میں سندھی جوانوں کے لیے انفنٹری میں بھرتی ہونے کے لیے قد کا معیار پانچ فٹ چھ انچ سے کم کر کے پانچ فٹ چار انچ کر دیا گیا تھا۔ سندھ کے دور دراز گوشوں سے جوان بھرتی ہونے کے لیے آئے اور جو تعلیمی اور جسمانی معیار پر پورے اترے انہیں بھرتی کر لیا گیا۔

اس موقع پر ملٹری پولیس کی طرف سے کمالات دکھانے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ ہاتھ چھوڑ کر موٹر سائیکل چلانے کا کرتب تو آج کل عام جوان بھی دکھا لیتے ہیں لیکن اس مظاہرے میں ملٹری پولیس کے جوانوں نے سر کے بل کھڑے ہو کر موٹر سائیکل چلائی۔ خدشہ ہے کہ کہیں نوجوان لوگ بھی اس کی نقل کرتے ہوئے سڑکوں پر کرتب دکھانا شروع نہ کر دیں اور پھر سینہ پھیلا کر فخر سے کہیں۔

میں کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

ملٹری پولیس کے جوانوں نے پچھلی نشست پر سیڑھی رکھ کر اس پر چڑھنے اترنے کا مظاہرہ کیا۔ ایک موٹر سائیکل پر بارہ جوان سوار ہوئے جس پر ملٹری پولیس ہی کے ایک فرض شناس سپاہی نے ان کا ”چالان“ کر دیا۔

اس مظاہرے کے بعد مہمانوں کی چائے اور دیگر لوازمات سے خاطر تواضع کی گئی۔ مہمان خصوصی اس کے بعد واپس چلے گئے۔

میلہ تین دن جاری رہا۔ سول آبادی کے لوگوں کے لیے یہ ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ راقم الحروف نے میلے میں آنے والے بہت

سے لوگوں کے انٹرویو کیے تو پتہ چلا کہ پنوں عاقل جیسی دور دراز جگہ پر لوگ صاف ستھری تفریح کو ترسے ہوئے ہیں۔ اس جائزے سے یہ بھی پتہ چلا کہ سندھ کے عام لوگ مذہبی روایات کے کس قدر پابند ہیں۔ میلے میں آئے ایک شخص نے بتایا کہ اس کے گاؤں کی پچاس فیصد آبادی قرآن کے حافظوں پر مشتمل ہے' گاؤں میں تمبا کو نوشی نہ صرف منع ہے بلکہ اس سے سخت نفرت کی جاتی ہے۔ پورے گاؤں میں سگریٹ کا کوئی کھوکا یا دکان نہیں ہے۔ کوئی سگریٹ نوش مہمان آ جائے اور سگریٹ طلب کرے تو بادل نخواستہ کسی کو بھیج کر ساتھ والے گاؤں سے سگریٹ کے پیکٹ منگوائے جاتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ گاؤں کا آدمی سگریٹ کے پیکٹ کو نجس سمجھتے ہوئے ہاتھ تک نہیں لگاتا بلکہ پیکٹ کسی کپڑے میں لپیٹ کر لاتا ہے۔ اس ماحول میں کوئی سگریٹ نوش کتنے دن اس گاؤں میں مہمان رہ سکتا ہے اور اس گاؤں کا کوئی فرد سگریٹ نوشی کی طرف کیونکر مائل ہو سکتا ہے۔

سندھ اسمبلی کے ایک سابق رکن اپنے بال بچوں سمیت میلے میں آئے ہوئے تھے' ان سے مل کر خوشگوار حیرت ہوئی کیونکہ سندھ میں بڑے گھرانوں کے لوگ اپنی بیٹیوں کے ساتھ عوام میں گھلنے ملنے کو پسند نہیں کرتے لیکن انہوں نے بتایا کہ فوجی میلے میں صاف ستھری تفریح میسر ہے جس سے اہل خانہ کے ساتھ لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔

میلے میں ہمیں سندھ کے ایک دینی مدرسے سے آئے ہوئے طلبہ کا ایک پورا غول ملا۔ طلبہ سٹالوں سے دور دور رہ کر حسرت سے فوجی ساز و سامان کو تکتے تھے۔ جب ان سے پوچھا کہ وہ قریب کیوں نہیں جاتے تو پتہ چلا کہ ان کے استاد نے ازراہ احتیاط انہیں قریب جانے سے روکا ہوا ہے۔ انہیں بتایا گیا کہ ساز و سامان کی نمائش انہی کے لیے ہے۔ وہ بلا جھجک قریب جائیں۔ توپ کے اوپر چڑھیں' ٹینک کے اندر بیٹھیں۔ انہیں اجازت ملی تو وہ گولی کی طرف بھاگے اور مختلف سٹالوں کے ہجوم میں مدغم ہو گئے۔ ان کے استاد میرے پاس آئے اور بڑی تشویش سے بولے۔ ”سائیں! میں نے انہیں بڑی مشکلوں سے روکا ہوا تھا۔ آپ کو نہیں پتہ یہ کتنے شرارتی بچے ہیں۔ کوئی توپ شوپ چل گئی تو قیامت آ جائے گی۔“

ایک پڑھے لکھے استاد کا یہ حال تھا تو عام آدمی کی جھجک کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن بہر حال تین دنوں کا یہ میلہ اس جھجک کو دور کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہا اور امکان ہے کہ آئندہ کسی ایسی تقریب کا اہتمام ہوا تو شہریوں کی تعداد میں اور اضافہ ہوگا۔

◆◆◆

یوم فضائیہ

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ پاکستان میں ۷ ستمبر یوم فضائیہ کے طور پر منایا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاک فضائیہ نے اپنی جارحانہ کارروائیوں کا آغاز ۷ ستمبر کو کیا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے پہلے پاک فضائیہ خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔اس کے شاہین چوکس بھی تھے اور جذبہ جہاد سے سرشار اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے مستعد بھی۔ بلکہ یکم ستمبر کو چھمب جوڑیاں سیکٹر میں جب دشمن کے ویمپائر طیاروں نے ہماری بڑھتی ہوئی زمینی افواج کی راہ روکنے کی کوشش کی تھی تو فلائٹ لیفٹیننٹ رفیقی اور فلائٹ لیفٹیننٹ بھٹی نے دشمن کے دو دو طیارے گرا کر بھارتی فضائیہ سے حساب کھول لیا تھا اور اس سے بھی پہلے اگست میں جب بھارت نے کشمیر میں جنگ بندی لائن پر واقع پاکستانی چوکی کارگل پر قبضہ کر کے اوڑی' پونچھ اور درہ حاجی پیر کی طرف پیش قدمی شروع کی تھی تو ہماری بری فوج کا ایک دستہ دشمن کے نرغے میں آ کر مکمل طور پر گھر گیا تھا۔ ان کے بچاؤ کی صرف یہی ایک صورت تھی کہ فضائیہ کے ذریعے انہیں رسد مہیا کی جاتی۔ مشن کی اہمیت کے پیش نظر اس وقت کے فضائیہ کے کمانڈر انچیف ایئر مارشل نور خان نے خود اس مہم پر جانے کا فیصلہ کیا۔ سینئر افسروں نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کہا۔

''میرے خیال میں میرا جانا ضروری ہے' کسی کے بغیر کام نہیں رکتے۔''

ان کے فیصلے میں اپنے مقدر پر ایمان کی جھلک تھی اور وقت نے ثابت کر دیا کہ اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان رکھنے والوں کے قدم چومنے کے لیے خود فتح و نصرت بے تاب رہتی ہے۔ رات کی تاریکی میں چھبیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے اس C-130 طیارے کا مشن کامیاب و کامران رہا اور اس نے یہ بھی ثابت کر دیا۔

ملے گا منزل مقصود کا اسی کو سراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

بات ہو رہی تھی ۷ ستمبر کی۔۔۔۔۔۔یہ وہ دن تھا جب فضائی جنگوں کی تاریخ کا ایک نیا باب لکھا گیا اور یہ سعادت پاک فضائیہ کے ایک مرد مجاہد کے حصے میں آئی کہ وہ فوجی ہوابازی کی تاریخ کا وہ روشن باب رقم کرے کہ جس کی تابانی آنے والے دنوں میں پاک فضائیہ کے لیے روشنی فراہم کرتی رہے۔

سرگودھا کا ہوائی اڈہ تھا' سکواڈرن لیڈر ایم ایم عالم اپنے F-86 طیارے میں اپنے ونگ مین کے ساتھ اڈے کے جنوب مشرق میں محو پرواز تھے' جب انہیں دشمن کے ہنٹر طیاروں کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ ایم ایم عالم نے دو منٹ سے بھی کم وقت میں دشمن کے پانچ ہنٹر طیارے مار گرائے۔

اس واقعے نے پاک فضائیہ میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس سے پہلے دبے دبے لفظوں میں پاکستان اور بھارت کی فضائیہ کا موازنہ کیا جاتا تھا۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستان کے پاس صرف ۱۴۲ لڑاکا ہوائی جہاز تھے جس کے مقابلے میں بھارت کے پاس پانچ سو جنگی طیارے تھے' یعنی تین گنا سے بھی زیادہ۔۔۔۔۔۔لیکن صرف اعداد و شمار ہی کسی فوج کی طاقت کا مظہر نہیں ہوتے۔ تربیت کا معیار اور جذبے بھی جنگ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بھارتی فضائیہ تعداد اور ساز و سامان کے اعتبار سے پاک فضائیہ پر برتری رکھتی تھی' اس کے طیارے پاکستانی طیاروں کے مقابلے میں تیز رفتار بھی تھے اور بہتر استعداد کے حامل بھی' لیکن علامہ اقبال نے کہا تھا۔

فضائے بدر پیدا کر' فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

فضائے بدر کیا تھی؟

اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل ایمان اور بھروسہ' اپنا سب کچھ اس کے راستے میں لٹا دینے کی تمنا' شوق شہادت' رضائے الٰہی کے حصول کی آرزو۔

ستمبر ۶۵ء کی جنگ فضائے بدر کا نمونہ تھی۔ ہمارے شاہین فضائی معرکوں میں کودنے کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ اس وقت کے کمانڈر انچیف نے جنگ کے دوران ایک پریس انٹرویو کے دوران کہا۔ ''میری مشکل یہ نہیں کہ اپنے پائلٹوں کو جنگ میں کیسے دھکیلوں بلکہ یہ ہے کہ انہیں میدان جنگ میں جانے سے کیسے روکوں۔''

اس جنگ کا ذکر ہے۔۔۔۔۔۔پاک فضائیہ کا ایک مایہ ناز پائلٹ فلائٹ لیفٹیننٹ سید شمس الدین احمد گردوں کے ناقابل برداشت درد میں مبتلا تھا۔ ۴ ستمبر کو اس کے پیشاب سے خون آ رہا تھا۔ وہ بار بار فوجی ہسپتال میں داخل ہونے کا ارادہ کرتا تھا لیکن احساس فرض اور دلی جذبات اس کی راہ روک لیتے۔ اسے یہ گوارہ نہیں تھا کہ جب قوم پر آزمائش کا وقت آیا تھا وہ ہسپتال میں پڑا رہے۔ دوسری طرف کسی بھی مشن پر جانے کی صورت میں وہ زبردست خطرہ مول لے رہا تھا جو خود اس کے لیے اور نیوی گیٹر کے لیے

جان لیوا ہو سکتا تھا اور ایک قیمتی ہوائی جہاز کی تباہی و بربادی کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد پر کلی اعتماد کرتے ہوئے اس نے اپنے کمانڈنگ آفیسر کو اپنی علالت کی اطلاع نہ دی کیونکہ وہ اسے فوراً ہی ہسپتال بھیج دیتا۔ اس نے آپریشن روم میں ایک متین اور سنجیدہ سکواڈرن لیڈر شعیب عالم سے جو ایک نیوی گیٹر تھا' سے اپنا راز دل کہا اور پوچھا کہ کیا وہ اس کے نیوی گیٹر کی حیثیت سے اس کے ساتھ پرواز کرنے کو تیار ہے۔

سکواڈرن لیڈر شعیب نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے ساتھ پرواز میں خطرات زیادہ اور کامیابی کے امکانات کم تھے' اس کے فولادی عزم اور شرکت جہاد کی مقدس تمناؤں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

اس کے بعد سے لڑائی ختم ہونے تک دونوں بہادر ساتھی ہر رات مختلف مہموں پر روانہ ہوتے رہے۔ دشمن کے علاقوں میں گھس کر اہم فوجی مراکز پر تباہی بن کر ٹوٹتے رہے لیکن شمس نے کبھی درد گردہ کی شکایت نہ کی۔ نیوی گیٹر سکواڈن لیڈر شعیب کا بیان ہے کہ شمس کراہتا ہوا ہوائی جہاز تک آتا تھا لیکن کاک پٹ میں بیٹھتے ہی نارمل ہو جاتا تھا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد فلائیٹ لیفٹیننٹ شمس کو فوجی ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ اپریشن ہوا تو اس کے گردوں سے اٹھائیس پتھریاں نکالی گئیں۔ شمس اور اس کے جاں باز ساتھی سکواڈرن لیڈر شعیب عالم کو ستارۂ جرات کے اعزازات سے نوازا گیا۔

یہ صرف ایک مثال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاک فضائیہ کے ایک ایک فرد نے ایثار و قربانی کی روشن مثالیں قائم کیں۔ آیئے باری تعالیٰ سے دعا کریں کہ آئندہ بھی ہمیں وہ اسی جوش و جذبے اور خلوص کے ساتھ دفاع وطن کا فریضہ سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

◆◆◆

ابتدائی معرکے

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی رات ۱۲ بجے لاہور ریڈیو اسٹیشن سے مصطفیٰ علی ہمدانی کی آواز گونجی۔ ''یہ ریڈیو پاکستان ہے۔'' قیام پاکستان کے پہلے لمحے گونجنے والی یہ آواز کروڑوں مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن اور ان کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ اسلامی کیلنڈر کے مطابق یہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا اور ستائیسویں کی پر فضیلت شب۔ لوگ آنکھوں میں خوشی کے آنسو لیے بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز تھے۔ بے سروسامانی کا عالم تھا۔ جشن آزادی میں پھلجھڑیاں تھیں نہ تزک و احتشام ۔۔۔۔۔۔ صبر و شکر کے پہلو نمایاں تھے۔

سادگی اور وقار کے ساتھ جب پاکستان میں جشن آزادی منایا جا رہا تھا' دور شمال میں دریائے جہلم اور نیلم کی وادیوں میں اور نانگا پربت کے پار' گلگت بلتستان میں خوف کے سائے لہراتے تھے۔

۱۸۴۶ء کے معاہدہ امرتسر کے مطابق کشمیر کو انگریزوں نے پچھتر لاکھ نانک شاہی (پاکستانی پچاس لاکھ روپے) کے عوض ڈوگرہ مہاراجہ گلاب سنگھ کو فروخت کر دیا تھا۔ اس رقم کو اس وقت کی آبادی پر تقسیم کیا جائے تو گویا کشمیریوں کو سات روپے فی کس کے حساب سے بیچا گیا تھا۔ علامہ اقبال نے اسی معاہدے کے بارے میں کہا تھا۔

دہقان و کشت و جو و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

(انہوں نے دہقان' کھیتیاں' ندیاں اور باغ (غرضیکہ) پوری قوم بیچ دی اور کتنی سستی)

۱۹۴۷ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ کا پڑپوتا ہری سنگھ کشمیر کا مہاراجہ تھا۔ تقسیم ہند کے طے شدہ اصولوں کے مطابق ۸۶ فیصد مسلم اکثریت والی اس ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ کشمیر میں مسلمانوں کے نمائندہ جماعت آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس تھی اور اس کی نمائندہ حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۶ء میں ریاستی اسمبلی میں مسلمانوں کے لیے مختص اکیس میں سے سولہ نشستیں مسلم کانفرنس کے امیدواروں نے جیتی تھیں (باقی پانچ نشستوں پر ان کے امیدواروں کے کاغذات فنی اعتراضات کی بنا پر مسترد کر دیئے گئے تھے) تو مسلمانوں کی اس نمائندہ جماعت نے ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء کو اپنے ایک اجلاس میں

پاکستان کے ساتھ الحاق کا مطالبہ کیا تھا۔

لیکن مہاراجہ شش و پنج میں مبتلا تھا۔ اس نے اپنے ایک رشتہ دار گھنسارا سنگھ کو گلگت بلتستان کا گورنر بنا کر سری نگر سے گلگت روانہ کر دیا تھا۔

جب ۱۴ اگست کی تاریخ بھی الحاق کے اعلان کے بغیر گزر گئی تو اسلامیان کشمیر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انہوں نے آزادی کی جدوجہد جو کئی برس سے جاری تھی' تیز کر دی اور آٹھ ہفتوں کے مختصر عرصے میں ریاست کا بڑا حصہ آزاد کروا کے ۲۴ اکتوبر کو آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر کے نام سے ایک باقاعدہ حکومت کی بنیاد ڈالی۔

گلگت میں ناردرن سکاؤٹس کے صوبیدار میجر (بعد ازاں اعزازی کیپٹن) بابر نے گورنر گھنسارا سنگھ کو گرفتار کر کے بیرکوں میں قید کر لیا۔ بونجی چھاؤنی میں تعینات چھٹی جموں و کشمیر رائفل بٹالین کے مسلمان فوجیوں نے آزادی کا پرچم بلند کیا اور ایک انقلابی کونسل قائم کر کے شمالی علاقہ جات کو آزاد کروانے کے لیے جانیں ہتھیلی پر رکھے میدان میں نکل آئے۔ اس وقت پاک فوج خود کسمپرسی کی حالت میں تھی۔ جی ایچ کیو کی طرف سے صرف دو افسر مہیا کئے جا سکے۔ ایک میجر اسلم' دوسرے میجر انور خان۔ میجر اسلم کو ناردرن سکاؤٹس کا کمانڈنٹ مقرر کیا گیا اور میجر انور کو (جو پاک فضائیہ کے سابق سربراہ ائیر مارشل اصغر خان اور میجر اسلم کے چھوٹے بھائی تھے) کوارٹر ماسٹر۔۔۔۔۔۔۔انہوں نے سابق ہندوستانی فوج کے مسلمان فوجیوں' رضا کاروں اور مجاہدوں پر مشتمل مختلف دستے منظم کئے۔ ان دستوں کی بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ کسی کے پاس سویٹر تھا تو جوتے نہیں تھے' وردی تھی تو جرابیں نہیں تھیں' رائفل تھی تو گولیاں ندارد اور مارٹر تھی تو گولے ناپید۔۔۔۔۔۔۔ ایک جذبہ جہاد تھا اور اللہ کا نام۔

یہ تھا مختصراً وہ پس منظر جس میں پاک فضائیہ کو پہلی بار مدد کے لیے پکارا گیا۔ اس وقت تک فضائیہ اپنے پیروں پر کھڑی بھی نہیں ہوئی تھی۔ تقسیم کے وقت پاکستان کی ساڑھے سات کروڑ آبادی میں پاک فضائیہ کی افرادی قوت صرف ۲۳۳۲ افراد پر مشتمل تھی' جس میں افسروں کی تعداد صرف ۲۲۲ تھی۔ ان میں پائلٹوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ جو پائلٹ پاکستان کے حصے میں آئے ان میں سینئر ترین محمد خان جنجوعہ' حیدر رضا' مقبول رب اور عبدالرحمٰن تھے۔ دوسرے پائلٹوں میں اصغر خان' نور خان' محمد اختر' یوسف' رحیم خان' ظفر چوہدری' مسرور حسین اور ایف حسین شامل تھے۔

فلائنگ کی تربیت کے لیے پاکستان میں کوئی ادارہ نہ تھا۔ پاکستانی اور ہندوستانی فضائیہ کے سربراہ انگریز تھے۔ یہ طے پایا کہ پاکستان جانے والے زیر تربیت کیڈٹ ہندوستان ہی میں تربیت مکمل کریں گے۔ چنانچہ پائلٹوں کا پہلا کورس انبالہ اور جودھ پور میں

تربیت مکمل کر کے یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو پاس آؤٹ ہوا۔

جہازوں اور ساز و سامان کی تقسیم میں ہندو بنئے نے پہلے دن سے عیاری اور مکاری کا مظاہرہ کیا۔ تربیتی طیاروں میں پاک فضائیہ کو آٹھ ''ٹائیگر ماتھ'' طیارے ملے تھے جو جودھ پور میں کھڑے تھے۔ پاکستان سے ایک گیارہ رکنی ٹیم ان طیاروں کو لانے کے لیے ایک ڈکوٹا طیارے میں انڈیا روانہ ہوئی۔ چکلالہ' لاہور اور انبالہ میں ٹھہرتے ہوئے یہ لوگ شام کے وقت پالم کے ہوائی اڈے پر اترے۔ میزبانوں نے انہیں آفیسرز میس میں ٹھہرانے سے انکار کر دیا۔ بڑی مشکلوں سے سنگل آفیسرز کوارٹرز میں جگہ ملی جہاں بجلی تھی نہ چارپائیاں۔ جیسے تیسے رات بسر کی اور صبح جودھ پور روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچے تو بتایا گیا کہ ایک جہاز تو بالکل خراب ہے اور مرمت کے قابل بھی نہیں۔ سات جہاز لے جائیں۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۴۷ء کو پاکستانی ٹیم ان طیاروں کو لے کر روانہ ہوئی۔ جو پائلٹ ان طیاروں کو اڑا رہے تھے ان کے نام سکواڈرن لیڈر یوسف' فلائنگ آفیسر سرور حسین' فلائنگ آفیسر ظفر چوہدری (بعد میں پاک فضائیہ کے سربراہ بنے)' کیڈٹ سلیم الادروس' کیڈٹ آصف خان' کیڈٹ چوہدری اور کیڈٹ ایس ایم تھے۔ فضائی پرواز کی تاریخ میں یہ انوکھا واقعہ تھا کہ ایسے کیڈٹ جو ابھی زیر تربیت تھے' کسی دوسرے ملک سے اتنے مشکل اور طویل روٹ پر سفر کرتے ہوئے جہاز لے کر آ رہے تھے۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ طیارے پرانے تھے' پائلٹ کم تجربہ کار اور سفر طویل۔۔۔۔۔۔۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ سیدھا رسالپور جانے کی بجائے مختلف مرحلوں میں سفر مکمل کیا جائے۔ اس فیصلے کے مطابق انہوں نے اترلائی' چھور' نواب شاہ' جیکب آباد' خانپور' ملتان اور میانوالی ٹھہرتے ہوئے رسالپور پہنچنا تھا۔ یہ لوگ نوابشاہ اترے تو سخت گرمی کے باوجود ہزاروں لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ یہ جان کر کہ یہ طیارے پاکستان کے ہیں' لوگ فخر سے پھولے نہ سماتے تھے۔ اس سے اگلے مرحلے پر جیکب آباد سے طیاروں نے ٹیک آف کیا تو ٹیم لیڈر سکواڈرن لیڈر یوسف کے طیارے میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی اور انہیں ہنگامی طور پر کھیتوں میں اترنا پڑا۔ ملتان میں لینڈنگ کرتے ہوئے ایک جہاز کو نقصان پہنچا اور باقی پانچ طیارے رہ گئے۔

۱۴ ستمبر کو یہ ٹیم میانوالی پہنچی۔ انہیں جودھ پور لے کر جانا ڈکوٹا طیارہ بھی ان سے آن ملا۔ سکواڈرن لیڈر یوسف بھی اس میں سوار تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے طیارے کے ایندھن میں چینی ملا دی گئی تھی جس کی وجہ سے انجن بند ہو گیا تھا۔ حیرانی و پریشانی کے عالم میں باقی طیاروں کا بھی تفصیلی معائنہ کیا گیا تو تین طیاروں کے فلٹر چینی سے بھرے ہوئے تھے۔

وہ یہاں سے پرواز کرتے تو کسی بھی وقت انجن بند ہو سکتے تھے۔ گویا ہندوستان کی طرف سے پاکستان کو ملنے والا پہلا تحفہ چینی کا تھا' لہٰذا ہوشیار رہیں' صرف ایک طیارے کو میانوالی سے پرواز کی اجازت ملی اور وہ پروگرام کے مطابق ۱۴ ستمبر کو رسالپور پہنچ گیا۔

میانوالی میں رہ جانے والے چار جہاز ایئر ہیڈ کوارٹر سے مینٹی نینس ٹیم کے آنے کا انتظار کرتے رہے۔ اس وقت پاکستان کے پاس صرف چار انجینئر تھے۔ جیری خان' محمد محبوب' چاچا صدیق اور خلیل الرزاق۔ پوری فضائیہ کی دیکھ بھال کی ذمہ داری انہی پر تھی۔ کان کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ انہیں میانوالی کون جانے دیتا۔ میانوالی میں باقاعدہ ہینگر نہیں تھے' جہاز کھلے آسمان تلے کھڑے تھے۔ گرد و غبار کے طوفان آتے تو ایئر مین جہازوں کے پر پکڑے کھڑے رہتے کہ کہیں الٹ نہ جائیں۔ چار دنوں کے جان لیوا انتظار کے بعد بھی جب کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچ سکا تو انہوں نے خود ہی فیول ٹینکوں اور انجنوں کی بساط بھر صفائی کی اور اللہ کے نام لے کر رسالپور روانہ ہو گئے۔ انجنوں سے عجیب و غریب آوازیں آتی تھیں جیسے غصے سے غرا رہے ہوں لیکن انہوں نے سفر جاری رکھا اور شام تک رسالپور پہنچ گئے۔ پائلٹوں کی حالت یہ تھی کہ شیو بڑھی ہوئی' سر کے بال گرد و غبار میں اٹے ہوئے پھٹی پرانی وردیاں گرد اور تیل میں چیکٹ۔۔۔۔۔۔ تو ان حالات میں پاک فضائیہ کو پاک فوج کا SOS پیغام ملا کہ شمالی علاقہ جات میں کھانے پینے کی اشیاء کی قلت ہے۔ ایک طرف شہری قحط کے ہاتھوں سخت پریشان ہیں' دوسرے مجاہدین کو بھی مدد کی سخت ضرورت ہے۔ کھانے پینے کی اشیاء اور ایمونیشن گلگت' بلتستان میں ایئر ڈراپ کرنے کے لیے فوراً مدد کو پہنچیں۔

سکردو شہر اس وقت تک مکمل طور پر آزاد نہیں ہوا تھا۔ بھارتی گیریژن قلعہ بند ہو گیا تھا اور مجاہدین نے قلعے کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اس وقت پاک فضائیہ کی عمر بمشکل دو تین ماہ تھی اور مطلوبہ سامان ڈراپ زون میں گرانے کے لیے ان کے پاس دوسری جنگ عظیم کے استعمال شدہ صرف دو ڈکوٹا طیارے تھے۔ ان ٹرانسپورٹ طیاروں کو اڑانے کے ماہر صرف دو ہواباز' تین نیوی گیٹر اور تین ایئر سگنلرز میسر ہوابازوں کو بھی اس سے پہلے ایئر ڈراپ کا کوئی تجربہ نہ تھا کہ فضا سے سامان گرانے کے لیے جہاز کو ایک خاص بلندی پر لا کر بڑے متوازن اور ہموار طریقے سے اڑانا پڑتا ہے۔ ایسے میں جہاز کی ٹیل کھول دی جاتی ہے اور خاص طریقے سے پیک شدہ سامان کو ریمپ پر لڑھکا دیا جاتا ہے۔ ایسے میں جہاز غیر متوازن ہو جائے یا ڈگمگا جائے تو ایئر ڈراپ میں مصروف عملہ بھی سامان کے ساتھ فضا میں قلابازیاں کھاتا نظر آئے۔ مینٹی نینس سپورٹ نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس بے سروسامانی کے باوجود ۶ سکواڈرن نے پوری بہادری سے یہ چیلنج قبول کیا اور اپنا آدھا سرمایہ یعنی ایک ڈکوٹا طیارہ شمالی علاقہ جات میں ایئر ڈراپ کے لیے وقف کر دیا۔ یہ فرسودہ جہاز دس ہزار فٹ سے زیادہ اونچا نہیں جا سکتا تھا اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ چلاس' بونجی' گلگت اور سکردو پہنچنے کے لیے وہ دریائے سندھ کی وادی میں پرواز کرے جس کی دونوں جانب سات سے سترہ ہزار فٹ سنگلاخ پہاڑ تھے بلکہ چلاس کی دائیں جانب نانگا پربت تو اٹھائیس ہزار فٹ بلند تھا۔ وادی کی چوڑائی اتنی کم ہے کہ ایمرجنسی کی صورت میں ڈکوٹا واپس بھی نہیں مڑ سکتا تھا۔ راستے میں کوئی ایسی

جگہ بھی نہ تھی جہاں ایمرجنسی کی صورت میں لینڈ کیا جا سکے۔

شمالی علاقوں میں موسم بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ابھی موسم صاف ہے' دھوپ چمک رہی ہے' آسمان کی نیلاہٹ نمایاں ہے۔۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر میں بادل گھر کر آتے ہیں' بجلی چمکتی ہے' موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی ہے۔ ۴۸-۱۹۴۷ء میں دریائے سندھ کی وادی میں موسم کا حال جاننے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندوستانی فضائیہ کشمیر میں پوری آزادی سے دندناتی پھر رہی تھی۔ اس نے آزاد کشمیر کی فوجی پوزیشنوں پر بھی حملے کئے تھے اور گلگت ایجنسی میں نہتے شہریوں پر بمباری بھی کی تھی۔ ٹرانسپورٹ طیارے ڈکوٹا کو حفاظت کے لیے کوئی جنگی جہاز بھی مہیا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ خود تو فاختہ کی طرح پرامن طیارہ تھا' کسی چڑیا کے بچے کو بھی نہیں مار سکتا تھا کہ اس میں کوئی گن تو کیا کوئی رائفل بھی فٹ نہیں ہوتی۔

ان تمام خطرات کے باوجود دسمبر کے آغاز میں ڈکوٹا طیارہ سپلائی کا اہم سامان لے کر پہلی پرواز پر روانہ ہوا۔ اسے فلائنگ آفیسر ایس ایم اے شاہ اڑا رہے تھے۔ اس پرواز کی کامیابی کے بعد ڈکوٹا سروس معمول بن گئی۔ پرواز صبح سویرے پشاور سے روانہ ہوتی اور غروب آفتاب تک جتنے پھیرے ممکن ہوتے' لگائے جاتے۔ ادھر انجینئروں کی سر توڑ کوششوں کے بعد دو اور طیارے پرواز کے قابل ہو گئے۔ انہیں بھی اسی کام پر لگا دیا گیا۔

بھارتی شمالی علاقہ جات میں مجاہدین کی کامیابیوں پر حیران تھے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ نہتے رضا کار پے در پے کامیابیاں کیوں کر حاصل کر رہے ہیں۔ اور سکردو گیریژن کا ناطقہ انہوں نے کیسے بند کر رکھا ہے۔ مجاہدین کے بڑھتے ہوئے قدم روکنے کے لیے انہوں نے دو کام کئے۔ ایک تو سکردو میں محصور گیریژن کی مدد کے لیے سری نگر سے برگیڈیئر فقیر سنگھ کی قیادت میں ایک برگیڈ روانہ کیا۔ دوسرے شمالی علاقہ جات میں جنگی طیاروں کا گشت بڑھا دیا۔ سری نگر سے آنے والے برگیڈ تیس بتیس رضا کاروں اور فوجیوں پر مشتمل ایک پلاٹون کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا۔ اس پلاٹون کی قیادت کیپٹن انعام اللہ جرال کر رہے تھے۔ اس معرکے کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ ایک ڈکوٹا کا حال سنئے جو بھارتی طیاروں کی زد میں تھا۔ فلائنگ آفیسر مختار احمد ڈوگرا سے اڑا رہے تھے اور جہاز کے عملے میں ایک زیر تربیت نیوی گیٹر پائلٹ آفیسر منیر اور ایئر سگنلر سارجنٹ ایس ایم محسن شامل تھا۔ ایک اور زیر تربیت نیوی گیٹر فلائنگ آفیسر الفریڈ جگ جیون اور فضائی ترسیل کا سامان ڈراپ کرنے والا پاک فوج کا نمائندہ نائک محمد دین بھی جہاز پر موجود تھے۔

فلائٹ آفیسر مختار احمد ڈوگر بتاتے ہیں۔

''۴ نومبر ۱۹۴۸ء کی صبح ہم سکردو میں سامان ڈراپ کر کے واپس آ رہے تھے۔ موسم صاف تھا اور ایک اور مشن کی کامیابی پر ہم سب بہت مطمئن اور مسرور۔ میں نے کچھ دیر آرام کرنے کے لیے کنٹرول فلائنگ آفیسر جگ جیون کے حوالے کردیا۔ ہم چلاس کے اوپر پہنچے تو مجھے دو ٹیمپسٹ (Tempest) طیارے نظر آئے۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ یہ اپنے طیارے ہیں جو فضائی گشت پر نکلے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ قریب آئے تو پتہ چلا کہ بھارتی طیارے ہیں۔ میں نے جھٹ کنٹرول سنبھال لیا۔ چلاس کے ارد گرد وادی چار پانچ میل چوڑی ہے اور اس بات کی گنجائش موجود تھی کہ میں بھارت کے جنگی طیاروں کی زد سے بچنے کے لیے اپنا جہاز دائیں بائیں لے جاؤں۔ بھارتی پائلٹوں نے ریڈیو پر مجھے ہدایت کی کہ میں اپنا رخ بھارتی ایئرپورٹ کی طرف موڑ دوں لیکن میں نے سنی ان سنی کردی۔ انہوں نے تین مرتبہ مجھے وارننگ دی اور پھر دھمکی کہ اگر میں نے ان کا کہنا نہ مانا تو وہ مجھے شوٹ کردیں گے اور یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ نہتے نہیں ہیں انہوں نے فضا میں گولیوں کا ایک برسٹ بھی فائر کیا۔

جہاز کا باقی عملہ اب تک اس بات سے بے خبر تھا کہ میں کس صورت حال سے دوچار ہوں۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ ڈوگر صاحب آج جہاز کے کرتب دکھا کر ان پر مہارت کی دھاک بٹھانا چاہتے ہیں بلکہ ایک دو نے آگے آ کر مجھے کہا بھی کہ میں جہاز آہستہ اور سیدھا چلاؤں۔ اب جوان پر انکشاف ہوا کہ جہاز بھارت کے جنگی طیاروں کی زد میں ہے جو انہیں زیر حراست لے کر بھارت جانا چاہتے ہیں تو سب اپنی اپنی نشستوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ البتہ فلائنگ آفیسر جگ جیون اور نائک محمد دین کھلے دروازے سے اس فضائی معرکے کا مشاہدہ کرتے رہے۔ جب بھارتی پائلٹوں کی وارننگ کے باوجود میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا تو ایک جنگی جہاز اپنے ساتھی سے جدا ہو کر بلندی کی طرف چلا گیا۔ ہمارے جہاز کو زد میں لے کر اس نے ۲۰ ملی میٹر گن کا بھرپور برسٹ فائر کیا۔ یہ گولیاں دروازے میں کھڑے ساتھیوں کو لگیں۔ نائک محمد دین بری طرح زخمی ہوا اور فلائنگ آفیسر جگ جیون زخمی ہو کر بے ہوش ہوگیا۔ میں نے ایئر سگنلر محسن کو اپنے پاس بلایا اور اسے ہدایت کی کہ کاک پٹ کے پیچھے نیوی گیٹر کی جگہ کھڑا ہو کر اوپر والی کھڑکی سے بھارتی جہازوں پر نظر رکھے اور جب بھی وہ اپنے طیارے کے پیچھے فائرنگ پوزیشن میں آئیں تو مجھے ٹھوکا دے۔ تین مرتبہ اس نے مجھے اشارے دیئے اور تینوں مرتبہ میں تھراٹل کو ہاف پوزیشن پر لاتا' فلیپ پورے کھول دیتا اور بائیں رڈر (Rudder) کو دباتا۔ اس ساری کارروائی سے جہاز بائیں طرف جا کر گولیوں کی زد سے باہر ہو جاتا۔

یہ کشمکش تقریباً پچیس منٹ جاری رہی۔ اس دوران میں وادی کے تنگ حصے کے دھانے تک پہنچ چکا تھا۔ میں اس حصے میں داخل ہو جاتا تو بھارتی طیاروں سے محفوظ ہو جاتا کہ یہاں وادی اتنی تنگ تھی کہ کوئی جہاز واپس نہ مڑ سکتا تھا۔ میں نے تو جانا ہی آگے تھا۔ اگر

بھارتی جہاز میرے پیچھے پیچھے وادی میں داخل ہو جاتا تو ان کے لیے واپسی کی راہیں مسدود ہو جاتیں۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ یہ فاش غلطی نہیں کریں گے۔ میں نے وادی میں داخل ہونے سے پہلے ریڈیو پر انہیں پیغام دیا۔ ''تم اب تک میرا کچھ نہیں کر سکے تو اب کیا کر سکو گے۔'' وہ میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے واپس لوٹ گئے۔

فلائنگ آفیسر مختار احمد ڈوگر کو اس معرکے میں کامیابی پر ستارۂ جرات عطا کیا گیا۔

اس واقعے کے بعد ایئر ہیڈ کوارٹرز کے حکم پر دن کے وقت ڈکوٹا کی پروازیں معطل کردی گئیں۔ ونگ کمانڈر اصغر خان اور ۶ سکواڈرن کے آفیسر کمانڈنگ نے فوری طور پر رات کے وقت پرواز کی تربیت کا اہتمام کیا اور جس کام میں مہینے لگ سکتے تھے' صرف دو ہفتے میں مکمل کرلیا۔ ۱۸ نومبر کی رات کو ڈکوٹا سکردو جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ ونگ کمانڈر اصغر خان خود جہاز میں موجود تھے۔ اس پرواز کی کامیاب تکمیل پر اسی رات دو اور پروازیں روانہ کی گئیں۔ اس کے بعد ڈکوٹا سروس ایک معمول بن گئی۔ پروازیں غروب آفتاب پر شروع ہوتیں اور طلوع آفتاب سے پہلے پہلے تمام جہاز پشاور پہنچ جاتے۔

اسی دوران پاک فضائیہ کو دو پرانے ہیلی فیکس بمبار طیارے مل گئے۔ ان میں کچھ تبدیلیوں کے بعد یہ سپلائی ڈراپ کے لیے استعمال ہونے لگے۔ ان کا فائدہ یہ تھا کہ یہ پہاڑوں کی چوٹیوں سے بلند ہو کر اونچی پرواز کر سکتے تھے اور ضروری نہیں تھا کہ وہ وادی سندھ کے درمیان سفر کریں۔ ان کی رفتار بھی تیز تھی اور یہ کسی قدر مسلح بھی تھے کہ ان کے سامنے ایک مشین گن اور پیچھے کی طرف برین گن لگی ہوئی تھی۔ ان تمام فوائد کے پیش نظر انہیں دن کے وقت استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس بات کا خطرہ اگرچہ موجود تھا کہ جب وہ سپلائی ڈراپ کرنے کے لیے کم بلندی پر آئیں تو بھارتی طیاروں کے لیے تر نوالہ بن سکتے تھے۔ لیکن جہاد کے جذبے سے سرشار پائلٹوں اور فضائی عملے کے دیگر ارکان نے ان خطروں کی بالکل پرواہ نہ کی۔ ایک آدھ بار ان کا بھارتی طیاروں سے سامنا ہوا بھی لیکن مشن جاری رہا۔

جب ڈکوٹا اور ہیلی فیکس طیارے دن رات شہریوں اور مہاجرین کو خوراک اور ایمونیشن پہنچانے پر مامور تھے تو پاک فضائیہ کو چند چھوٹے طیارے ہارورڈ بھی مل گئے۔ ان میں ۳۰۳ مشین گنیں نصب تھیں۔ ان کے لیے گلگت اور سکردو میں موجود ایئرپورٹ کے رن وے مرمت کیے گئے اور ان جہازوں کے ذریعے فوجی افراد اور ہلکے پھلکے سامان کی ترسیل کا کام شروع کیا گیا۔

ایئر ڈراپ کے لیے سامان کو ایک خاص طریقے سے چیک کیا جاتا ہے بڑے بڑے ڈبوں کو ایک پیراشوٹ سے باندھا جاتا ہے اور انہیں جہاز سے پھینکنے کے لیے بھی خاص مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سارا کام پاک فوج کی ۶۰۳ ایئر ڈسپیچ کمپنی کے سپرد

تھا۔فوج کی ۲۰۳ کمپنی اور پاک فضائیہ کے ۶ سکواڈرن میں ایک صحت مند مقابلہ جاری تھا۔سکواڈرن کی کوشش ہوتی تھی کہ کمپنی جو کچھ پیک کرے وہ اسے جلد از جلد ڈراپ زون پر گرا آئیں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان کے جہاز واپس آئے ہوں تو انہیں لوڈ کرنے کے لیے مزید سامان تیار نہ ملا ہو۔ پاک فضائیہ اور پاک فوج کے درمیان تعاون' رابطے اور ہم آہنگی کی زبردست مثال قائم کرتے ہوئے دسمبر ۴۸ء تک ۴۳۰ پروازوں کے ذریعے ایک لاکھ چھتیس ہزار چار سو ستر پاؤنڈ سامان بونجی' استور' برزل' گلگت' چلاس اور سکردو میں ڈراپ کیا گیا۔

ادھر مجاہدین نے معجزے انجام دیئے۔ سکردو گیریژن کی مدد کے لیے ہندوستان نے دو مرتبہ سری نگر سے دو بریگیڈ بھجوائے لیکن دونوں بریگیڈ مجاہدین کی مٹھی بھر جماعتوں کے ہاتھ تباہ و برباد ہوئے۔ اور جدید جنگوں میں یہ ایک بے مثال ریکارڈ ہے کہ مجاہدین اور رضا کاروں نے کسی باقاعدہ فوجی یونٹ کی مدد کے بغیر اٹھائیس ہزار مربع میل علاقہ آزاد کروالیا۔

پاک فضائیہ کا پہلا شکار

اور یہ قیام پاکستان کے بارہ سال بعد کا ذکر ہے۔ ۱۹۵۹ء کا موسم بہار' عید کا دن تھا۔ پوری قوم عید منانے میں مصروف تھی۔ پاک فضائیہ کے اڈوں پر شادی شدہ افسروں اور جوانوں کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ عید اپنے اہل خانہ کے ساتھ جا کر منائیں۔ سنگل افسر اور جوان اپنی اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ ان میں اہم ترین ڈیوٹی ایئر ڈیفنس الرٹ (ADA) کی ہوتی ہے جہاں طیارے پرواز کے لیے ہمہ وقت مستعد اور تیار رہتے ہیں۔ ان کی ٹینکیاں پٹرول سے لبالب بھری ہوتی ہیں' وہ اسلحہ اور بارود سے مسلح ہوتے ہیں۔ ان کے پائلٹ جہازوں کے قریب ہی کسی کمرے میں وردیوں میں ملبوس تیار ہوتے ہیں اور سائرن بجتے یا فون پر ہدایت ملتے ہی لپک کر جہازوں میں بیٹھتے ہیں اور آناً فاناً فضاؤں میں بلند ہو جاتے ہیں۔ کہاں جانا ہے' کیا کرنا ہے۔۔۔۔۔۔ ضروری نہیں کہ یہ ہدایات زمین پر ہی ملیں' یہ احکامات انہیں فضا میں بھی دیئے جا سکتے ہیں۔

تو یہ ۱۰ اپریل ۱۹۵۹ء کی صبح تھی۔ ۱۵ سکواڈرن کے فلائٹ لیفٹیننٹ یونس اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اے ڈی اے ڈیوٹی پر موجود تھے۔ قدرے تاخیر سے آنے پر ان کے سینئر فلائٹ لیفٹیننٹ نصیر بٹ نے دھمکی دی تھی کہ سزا کے طور پر انہیں موبائل ڈیوٹی پر لگا دیا جائے گا۔ (موبائل ڈیوٹی پر موجود افسر رن وے کے کنارے ایک کمرے سے ٹیک آف یا لینڈنگ کرتے ہوئے جہازوں پر نظر رکھتا ہے اور بوقت ضرورت وائرلیس کے ذریعے انہیں ضروری ہدایات دیتا ہے۔ لیکن عید کا دن تھا اور دونوں آپس میں دوست بھی تھے' معاملہ رفع دفع ہو گیا ورنہ یونس ایک تاریخی کارنامے کی انجام دہی سے محروم رہ جاتے۔ صبح کے بعد وہ چائے پینے میں مصروف

تھے کہ سائرن چیخ اٹھے۔ فلائٹ لیفٹیننٹ نصیر بٹ اور یونس نے چائے کی پیالیاں پٹخیں' اپنے سیبر طیاروں کی طرف بھاگے اور جھٹ پٹ فضاؤں میں بلند ہو گئے۔

فوری پرواز (Scramble) کے احکامات سرگودھا سے آئے تھے۔ شہر سے دور سرحد کے قریب ایک گاؤں وگیووال میں ایک متروکہ فضائی پٹی (Air Strip) کے قریب ۱۵ موبائل راڈار یونٹ تعینات تھا جسے تیسے سرگودھا بیس کے ۲۲۳ سکواڈرن کے اپریشن کیبن سے منسلک کیا گیا تھا۔ ایک نوجوان' جونیئر افسر' پائلٹ آفیسر رب نواز ڈیوٹی پر تھا اور سکرین پر گھور رہا تھا کہ اسے ایک دھندلا سا یہ سا نظر آیا تھا۔ اس نے چند لمحوں کے غور کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ سایہ کسی بھارتی جہاز کا ہے۔ اس نے فوراً یہ اعلان مائیکرو فون پر نشر کیا اور ڈیوٹی آپریشن آفیسر فلائٹ لیفٹیننٹ اے ایم شہزادہ نے فوری فیصلہ کرتے ہوئے پشاور بیس پر اے ڈی اے طیاروں کو پرواز کا حکم جاری کر دیا۔ ۲۲۳ سکواڈرن کے پاس جو راڈار تھے وہ دوسری جنگ عظیم کے استعمال شدہ تھے اور ٹارگٹ جہاز کی صحیح بلندی بتانے سے قاصر۔ سکرین پر جو شبیہہ ابھرتی تھی وہ ٹارگٹ کے اصل مقام سے دس پندرہ میل دور نشاندہی کرتی تھی۔ لیکن پائلٹ آفیسر رب نواز نے اپنی توجہ مرتکز رکھی اور پشاور بیس سے اڑنے والے سیبر طیاروں کو بھارتی جہاز دکھانے میں کامیاب ہو گیا۔

فلائٹ لیفٹیننٹ یونس بتاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ جب ہم بیس ہزار فٹ بلندی پر تھے تو ہمیں اوپر اور دور دھوئیں کی دو لکیریں نظر آئیں۔ ہم سمجھے کہ یہ بھارت کے دو ہنٹر طیارے ہیں۔ لیکن جب بلندی کی طرف پرواز کرتے ہوئے قریب پہنچے تو پتہ چلا کہ یہ بھارت کا کینبرا طیارہ ہے جو شمال کی طرف جا رہا تھا۔ جب ہم گجرات کے اوپر پہنچے تو ہماری بلندی تقریباً پچاس ہزار فٹ تھی۔ فارمیشن لیڈر فلائٹ لیفٹیننٹ نصیر بٹ نے سرگودھا میں ۲۲۳ سکواڈرن لیڈر کے اپریشن کنٹرول سے بھارتی جہاز پر فائرنگ کھولنے کی اجازت طلب کی۔

راڈار سکرین پر جھکے پائلٹ آفیسر رب نواز نے ایک لمحے کا توقف کیا اور سوچا کیا اسے ایئر ہیڈ کوارٹر سے اجازت لینی چاہیے لیکن اس عمل میں دیر ہو جاتی اور کینبرا طیارہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ اس نے Initiative لیتے ہوئے سیبر جہازوں کو شوٹ کرنے کی اجازت دے دی۔

فلائٹ لیفٹیننٹ یونس بتاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ "میں اپنے لیڈر فلائٹ لیفٹیننٹ نصیر کو کور کیے ہوئے تھا۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر کینبرا طیارے کے پائلٹ کو ہماری موجودگی کا احساس ہو گیا تو وہ سرحدوں کی جانب دائیں مڑ جائے گا۔ چنانچہ میں اپنے لیڈر کے عقب میں اڑنے کے بجائے ذرا دائیں ہو کر پرواز کرنے لگا۔ اچانک کینبرا طیارہ دائیں طرف مڑا اور غالباً اسے میری

موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی بائیں طرف رخ کیا لیکن ادھر نصیر موجود تھا۔ اسے جب پتہ چلا کہ وہ دو طیاروں کی زد میں ہے تو بچنے کے لیے سیدھی پرواز کی بجائے دائیں بائیں مڑتے ہوئے منحنی خط میں پرواز کرنے لگا لیکن ان حرکتوں سے اس کی بلندی کم ہو گئی اور وہ عین میرے سامنے آ گیا۔ میں پہلے سے مستعد تھا۔ میں نے گن کا ٹریگر دبایا۔ گولیاں کینبرا طیارے کے دائیں انجن پر لگیں لیکن میں نے اس وقت تک ٹریگر نہیں چھوڑا جب تک میرے جہاز کی گنیں خود ہی خاموش نہیں ہو گئیں۔ چند لمحوں میں، میں بارہ سو گولیاں برسا چکا تھا۔ کینبرا جہاز سے شعلے بلند ہوئے اور وہ سر کے بل چکر کاٹتا نیچے گرنے لگا۔ میں نے پائلٹ کو جہاز سے جمپ کرتے نہیں دیکھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ اور اس کا ساتھی پیراشوٹ کی مدد سے چھلانگ لگا چکے تھے۔ انہیں گراؤنڈ پارٹی نے گرفتار کر کے ائیر ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا۔ یہ پوری قوم کے لیے عید کا تحفہ تھا۔"

پاک فضائیہ کی مختصر تاریخ ایسے ہی کارناموں سے درخشندہ ہے۔ ضروری تھا کہ ان واقعات کو محفوظ کر لیا جاتا تاکہ آنے والی نسلیں آگاہ رہیں کہ ہم نے کن حالات میں سفر شروع کیا تھا اور بے سروسامانی کے باوجود محض اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے کیسے کیسے کارہائے نمایاں سرانجام دیے کہ اللہ تعالیٰ پر توکل نہ رہے اور ساز و سامان کی فراوانی پر اعتماد بڑھنے لگے تو حنین کے واقعات پیش آتے ہیں۔ پاک فضائیہ نے تاریخ کو محفوظ کرنے کے لیے نہ صرف خوبصورت اور مستند کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا بلکہ کراچی میں ایک میوزیم بھی قائم کیا۔

اس میوزیم کا قیام بجائے خود ایک دلچسپ داستان ہے۔ جب میوزیم قائم کرنے کا خیال آیا تو متروک طیارے اور دیگر ساز و سامان کاٹھ کباڑ کی صورت فضائیہ کے مختلف سٹیشنوں کے جنک یارڈ میں پڑا تھا انہیں ایک جگہ جمع کرنا ایک خاصا مسئلہ تھا۔ وہ واکنگ طیارہ جو قائداعظم کے زیر استعمال رہا پشاور کے ایک سٹور میں پڑا تھا۔ کراچی لانے کے لیے اس کے پرپرزے پہیے اتار دیے گئے۔ اسے کھولتے ہوئے ہر مرحلے کی کئی تصاویر اتاری گئیں تاکہ دوبارہ جوڑنے میں آسانی رہے۔ پھر ایک ٹرانسپورٹ کمپنی سے اسے کراچی پہنچانے کی بات کی گئی۔ کمپنی کے نمائندے نے طیارے کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ یہ کسی بڑے سے بڑے ٹرالر میں بھی نہیں آ سکتا۔ کمپنی نے دو ٹرالروں کو جوڑا ان کی چوڑائی کم پڑی تو مزید تبدیلیاں کی گئیں۔ پھر ایک ٹیم نے پشاور سے کراچی تک بذریعہ سڑک سفر کیا اس بات کا جائزہ لینے کے لیے اتنا لمبا چوڑا ٹرالر کہیں پھنس تو نہ جائے گا۔ جہاں جہاں اس کا مڑنا مشکل تھا ان سارے مقامات کو ریکارڈ کر کے وہاں متبادل راستے ڈھونڈے گئے اور پھر فضائیہ پولیس کی نگرانی میں یہ طیارہ روانہ ہوا۔ کئی دن کے سفر کے بعد کراچی پہنچا۔ مشن کی تکمیل پر کمپنی کے مالک سے اخراجات کی ادائیگی کی بات کی گئی تو اس نے ایک پیسہ بھی لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ قائداعظم کے طیارے کو عوام کے لیے کراچی پہنچانا ایک مقدس فریضہ تھا جس کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کے جذبہ

ایثار کے پیش نظر پاک فضائیہ کے سربراہ نے اسے کوئی ایوارڈ دینا چاہا تو اس نے وہ بھی وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ ایک طیارے کی کہانی ہے۔ ملک کے طول و عرض سے ۳۳ طیارے کراچی لائے گئے۔

تو اس طرح کی بے لوث کوششوں اور شبانہ روز محنتوں سے تکمیل شدہ میوزیم کراچی میں قائم ہے۔ ائیر پورٹ سے شارع فیصل پر آئیں تو فیصل بیس سے ذرا آگے بائیں ہاتھ یہ میوزیم قائم ہے۔ سڑک پر ایک F-86 طیارہ آنے والوں کا استقبال کرتا ہے۔ یہ وہی طیارہ ہے جس کی مدد سے فلائٹ لیفٹیننٹ یونس نے ۱۹۵۹ء میں عید کے روز بھارت کے جاسوس طیارے کینبرا کو مار گرایا تھا اور اس طرح پاک فضائیہ کا اکاؤنٹ کھولا تھا۔ سڑک سے نیچے اتریں تو بوگن ولیا کے رنگ برنگے پھولوں کے درمیان سے گزرتے آپ میوزیم میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں وہ تمام طیارے رکھے ہیں جو اب تک پاک فضائیہ کے زیر استعمال رہے ہیں۔ بڑے ہال میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب آپ کو "نائیگر ماتھ" طیارہ نظر آئے گا جس کی کہانی ہم نے شروع میں بیان کی تھی۔ ذرا آگے ہندوستان کا ایک نات طیارہ کھڑا ہے جسے فلائٹ لیفٹیننٹ حکیم اللہ (جو بعد میں پاک فضائیہ کے سربراہ بنے) اور فلائنگ آفیسر عباس مرزا نے ۳ ستمبر ۱۹۷۵ء کو چار نات طیاروں کا مقابلہ کرنے کے بعد پسرور میں اترنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس ہال کے دونوں جانب گیلریوں میں پاک فضائیہ کے سربراہوں، فضائی اڈوں اور سکواڈرنز کی تاریخ تصویروں اور مختصر تحریروں کے ذریعے نمایاں کی گئی ہے۔

ایک جانب کمپیوٹر لگا ہوا ہے جس میں پاک فضائیہ کی مختلف برانچوں میں استعمال ہونے والے ساز و سامان اور طیاروں کی تفصیل ہے۔ نشان حیدر پانے والے پائلٹ آفیسر راشد منہاس اور دیگر اعزاز حاصل کرنے والوں کی تصاویر اور تفصیلات ہیں اور پاک فضائیہ کی تاریخ بھی۔ ان تفصیلات کی فہرست سکرین پر موجود رہتی ہے۔ آپ جو معلومات دیکھنا چاہیں تو سکرین پر صرف انگلی رکھ دیں، مطلوبہ معلومات آپ کے سامنے آ جائیں گی۔ ان تفصیلات کو کمپیوٹر میں فیڈ کرنے کے لیے ایک کمپنی نے ۴۴ لاکھ روپے طلب کیے تھے لیکن فضائیہ کے ایک انجینئرنگ ونگ کمانڈر اختر نقوی، ان کے چار ساتھی افسروں، ایک فائٹر پائلٹ اور چار ایروناٹیکل انجینئروں نے پانچ مہینوں کی دن رات محنتوں سے چند ہزار روپوں میں یہ منصوبہ مکمل کر لیا۔

موجودہ میوزیم کا بنیادی خیال سابق چیف آف ائیر سٹاف ائیر چیف مارشل محمد عباس خٹک نے ۱۹۸۶ء میں پیش کیا۔ ۱۹۶۱ء میں رسالپور میں ایک ایسی ہی کوشش ہو چکی تھی۔ ۱۹۶۲ء میں چند نادر اشیاء پشاور پہنچائی گئیں کہ ائیر ہیڈ کوارٹرز کی زیر نگرانی کوئی میوزیم بنایا جا سکے۔ چند سالوں بعد ۱۹۸۶ء میں ائیر چیف مارشل جمال اے خان کی زیر ہدایت سرگودھا بیس پر ایک فائٹر گیلری قائم کی گئی جس میں پاک فضائیہ کے زیر استعمال رہنے والے تمام طیاروں کے ماڈل رکھے گئے تھے۔ اسی سال فضائیہ کے سابق سربراہ نے جو اس وقت ائیر کموڈور کے رینک میں فیصل بیس کراچی کے بیس کمانڈر تھے، یہ تجویز پیش کی کہ تاریخی اہمیت کی تمام اشیاء کو ایک میوزیم میں اکٹھا کیا جائے۔ جب وہ فضائیہ کے سربراہ بنے تو اس پر تیزی سے کام شروع ہوا اور ۱۴ اگست ۱۹۹۷ء کو موجودہ میوزیم کا

افتتاح ہوا۔ اس دن سے یہ عوام کے لیے کھلا ہے۔ اس کی خوبصورت روشیں' سبزہ زار اور صاف ستھری کھلی فضا آپ کی منتظر۔ میوزیم نہ صرف آنے والوں کو پاک فضائیہ کے بارے میں معلومات مہیا کرتا ہے بلکہ کراچی جیسے شہر میں جہاں ٹریفک کے شور اور کارخانوں میں گاڑیوں کے دھویں نے سکون کا کوئی گوشہ باقی نہیں چھوڑا' صاف ستھرے ماحول میں تفریح کا خوبصورت موقع بھی مہیا کرتا ہے۔

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

◆◆◆

سانحہ کراچی

صبح ہونے میں ابھی بہت دیر تھی۔ رات کے پچھلے پہر ان چند مسلمان اور پارسی عبادت گزاروں کو چھوڑ کر جو تہجد یا اوشین کی نماز میں مصروف ہوں گے' پورا شہر گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا' جب پاک فضائیہ کے مسرور بیس پر چہل پہل شروع ہو گئی۔ فضائی عملے کی بس رہائشی علاقوں اور آفیسرز میس کے آس پاس' یہاں وہاں رکتی تھی۔ نوجوان پائلٹ بس میں سوار ہوتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے علیک سلیک کرتے' ایک دوسرے کا حال چال پوچھتے اور جس کو جہاں جگہ ملتی' بیٹھ جاتے۔ کچھ منچلے اپنی موٹر سائیکلوں پر ہوا سے باتیں کرتے تھے تو سینئر افسر سٹاف کاروں میں بیس کی طرف رواں دواں تھے۔ دوسرے لوگوں میں ایئر ٹریفک کنٹرول (ATC) کے افسر' کمپیوٹر کے ماہرین' راڈار آپریٹر' مکینک' انجینئرز' سنتری اور ڈرائیور شامل تھے۔ منہ اندھیرے کی یہ آمد و رفت کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وردی والوں کے لیے یہ روزمرہ کا معمول ہے۔ جب لوگ سوتے ہیں تو یہ جاگتے ہیں اور ان فضاؤں کی نگرانی کرتے ہیں جن میں سبز ہلالی پرچم لہراتا ہے۔

صبح کے ستارے کے ساتھ طلوع ہونے والے یہ وہ لوگ ہیں جو صبح سویرے پرواز کرنے والے فوجی طیاروں کی اڑان میں مدد کرتے ہیں۔ سینکڑوں دوسرے کارکن دفتری اوقات میں بیس پر پہنچتے ہیں۔

۸ مئی کی صبح اٹھنے والوں میں فلائٹ لیفٹیننٹ ظہیر بھی شامل تھے۔ وہ پانچ بجے سے پہلے ہی بیدار ہو چکے تھے۔ نہا دھو کر انہوں نے اوورآل یونیفارم پہنی اور ناشتہ کرنے میس میں چلے گئے۔ بہت سے لوگ اتنی صبح کچھ کھانے پینے کے عادی نہیں ہوتے لیکن پائلٹوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ناشتہ کریں' بھرپور ناشتہ۔ پرواز کے دوران پائلٹ پر نقاہت طاری ہو جائے تو جہاز اور پائلٹ دونوں خطرے سے دوچار ہو سکتے ہیں۔

سول جہاز ہو تو کاک پٹ کے پیچھے اعلیٰ درجے میں کام کرنے والی کوئی فضائی میزبان پائلٹوں کی دیکھ بھال بھی کرتی رہتی ہے۔ وہ حسب مرضی ناشتہ' کھانا' چائے' کافی یا کوئی بھی دل پسند مشروب جب چاہیں طلب کر سکتے ہیں لیکن لڑاکا طیارے کھانے پینے کی چیزیں رکھنے کی ''عیاشی'' کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ان میں صرف پٹرول ہوتا ہے' بم ہوتے ہیں' گولیاں اور بارود۔۔۔۔۔۔ خوش باش پائلٹ اپنی جیبوں میں ٹافیاں' گولیاں یا چاکلیٹ رکھ لیتے ہیں لیکن کاک پٹ میں بند ہو جانے کے بعد وہ اپنے سامنے اور دائیں

بائیں نصب آلات میں اس طرح کھوجاتے ہیں کہ انہیں ہوش ہی نہیں رہتا کہ وہ کچھ کھانے کے لیے بھی ساتھ لائے ہیں۔ مزے میں رہتا ہے وہ ملازم جو یونیفارم کو استری کرانے یا دھلائی کے لیے لے جانے سے پہلے احتیاطاً جیبیں ٹٹولتا ہے اور صاب کی ''خوش خوراکی'' کی عادتوں پر اکثر مسکراتا ہے۔ اور ''مال غنیمت'' ہڑپ کرنے کے بعد صاب کو اطلاع دے دیتا ہے کہ سرٹافیاں آؤٹ ڈیٹ ہورہی تھیں میں نے خود ہی کھا مرلی ہیں۔

فلائٹ شیڈول پروگرام ایک دن پہلے جاری ہو چکا تھا۔ اس کے مطابق فلائٹ لیفٹیننٹ ظہیر نے ایک طالب علم افسر فلائٹ لیفٹیننٹ ذوالفقار کو ساڑھے تین سو میل دور ''دشمن'' کے ایک علاقے میں لے جانا تھا۔ ذوالفقار کا پرواز کا نو سال کا تجربہ تھا لیکن اس سے پہلے وہ A-5 بمبار جہاز اڑاتا رہا تھا۔ F-6 سکواڈرن میں باقاعدہ شمولیت سے پہلے ضروری تھا کہ وہ کنورژن کورس مکمل کرے اور میراج۔ 3 طیارے کو اڑانے کے لیے بھرپور اہلیت حاصل کرے۔ طویل دورانیے کی یہ پہلی پرواز تھی جس پر آج ذوالفقار نے روانہ ہونا تھا۔ مشن کچھ اس طرح کا تھا کہ انہوں نے دو ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے سفر کرنا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اضافی ایندھن کی ٹینکیاں ساتھ لے جائیں۔

فلائٹ لائن پر موجود انجینئر نے تاریخ کی روشنی میں فلائٹ شیڈول پر آخری نگاہ ڈالی اور حکم دیا کہ میراج طیارے کے ساتھ ۱۳۰۰ لیٹر پٹرول کی ٹنکیاں فٹ کردی جائیں۔ ہر بازو کے نیچے ۱۳۰۰ لیٹر کی ایک ایک ٹنکی۔ فوجی طیارے کے اندر ایندھن کی جو گنجائش ہوتی ہے' اس سے وہ بمشکل پندرہ سے بیس منٹ پرواز کرسکتا ہے۔ چنانچہ تربیتی پرواز یا طویل فاصلے کی پرواز پر روانگی سے پہلے اضافی ایندھن کی ٹنکیاں ساتھ لینا ضروری ہے۔

بریفنگ روم میں پائلٹ جمع تھے۔ محکمہ موسمیات اور ائیر ٹریفک کنٹرول کے افسر بھی موجود تھے۔ ٹھیک چھ بجے ایک افسر روسٹرم پر گیا اور اس نے قرآن پاک کی آیات مقدسہ کی تلاوت شروع کی۔ کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی اور تمام لوگ متوجہ ہوکر بیٹھ گئے۔ پاک فضائیہ کے تمام اڈوں پر بریفنگ کا آغاز اسی طرح ہوتا ہے۔ آیات مقدسہ کے ترجمے کے بعد محکمہ موسمیات کے افسر نے ڈائس سنبھالا اور کراچی اور اردگرد کے ان علاقوں میں موسمی حالات کی تفصیلات بتائیں جہاں اس دن پائلٹوں نے مختلف سرگرمیوں میں مصروف رہنا تھا۔ پھر ائیر ٹریفک کے ایک افسر اٹھے اور انہوں نے اس دن فضائی ٹریفک کی تفصیلات بتائیں۔ ائیر ٹریفک کے لوگ علاقے میں موجود دیگر ائیر ٹریفک کنٹرول والوں سے رابطہ رکھتے ہیں اور پائلٹوں کو ان فضائی راستوں میں محدود رکھنے کے لیے رہنمائی کرتے ہیں جو ان کے لیے متعین کیے گئے ہوں۔

فضا بظاہر کھلی اور آزاد نظر آتی ہے جس میں کسی روک ٹوک کی گنجائش نہ ہو لیکن یہ بات اس صدی کے آغاز تک تو شاید درست ہوتی' آج کل ایسا نہیں ہے۔ ۱۹۰۳ء کا ذکر ہے جب رائٹ برادران نے ایک جہاز بنایا اور اس کو فضا میں اڑایا۔ فضا میں بلند ہونے والے اس پہلے جہاز کی پرواز صرف بارہ سیکنڈ جاری رہی اور اس دوران میں اس نے صرف چھتیس میٹر فاصلہ طے کیا لیکن آج کل سینکڑوں جہاز ہر وقت فضا میں تیرتے پھرتے ہیں۔ عالمی ہوائی اڈوں پر ہر منٹ میں کوئی جہاز اترتا ہے' کوئی پرواز کرتا ہے۔ حادثوں سے بچنے کے اور فضائی ٹریفک کو کنٹرول کرنے کے لیے بین الاقوامی قوانین بنائے گئے ہیں جو فضا میں بلند ہونے والے ہر جہاز پر لاگو ہوتے ہیں۔ عام طور پر ہر جہاز کے لیے جو گزرگاہ متعین کی جاتی ہے وہ نو میل (یا 14.5 کلومیٹر) چوڑی ہوتی ہے۔ عمودی طور پر ہر گزرگاہ کی بلندی میں ایک سے دو ہزار فٹ تک کا فاصلہ ہوتا ہے۔ وہ جہاز جو 0 سے 179 مقناطیسی سمت (Compass Bearing) کی طرف سفر کر رہے ہوں' طاق عدد ہزار فٹ کی بلندی پر رہتے ہیں جیسے گیارہ ہزار' تیرہ ہزار یا پینتیس ہزار اور جو طیارے 180 سے 359 ڈگری کی طرف محو پرواز ہوں وہ جفت عدد ہزار فٹ کی بلندی پر رہتے ہیں جیسے بارہ ہزار' چودہ ہزار' یا چونتیس ہزار۔ انتیس ہزار سے زیادہ بلندی پر پرواز کرنے والے طیاروں کا عمودی وقفہ دو ہزار فٹ ہوتا ہے۔ ائیر ٹریفک کنٹرول ٹاور میں بیٹھے لوگ انہی اصولوں کے مطابق پروازوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔

ہم بریفنگ روم میں تھے۔ ائیر ٹریفک افسر کی گفتگو ختم ہوئی تو اہم ترین ''ایمرجنسی سیشن'' کا آغاز ہوا۔ اس سیشن میں کوئی سینئر افسر' ان مختلف ہنگامی حالتوں کی تصویر کشی کرتا ہے جس سے کسی پائلٹ کو واسطہ پڑ سکتا ہے۔

''اگر جہاز کی دائیں جانب' انجن میں داخل ہونے والی ہوا کی گزرگاہ سے کوئی پرندہ ٹکرا کر وہاں پھنس جائے' RPM گرنے لگے' انجن کی طاقت کم ہونے لگے اور پورا جہاز لرزنے لگے تو پائلٹ کو کیا کرنا چاہیے؟''

''ایک جہاز چار ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہا ہے۔ اچانک جہاز کو جھٹکے لگنے لگیں اور اس کی معمول کی آواز میں بھی تبدیلی محسوس ہو' آلات کسی غیر معمولی بات کی نشاندہی نہ کریں تو کیا خرابی ہوسکتی ہے؟ پائلٹ کو کیا اقدامات کرنے چاہئیں؟''

''رات کی پرواز کے وقت ایک پائلٹ فضا میں بلند ہوتا ہے۔ چار ہزار فٹ کی بلندی کے بعد بغیر کسی نوٹس کے اس کا رابطہ ائیر کنٹرول سے ٹوٹ جاتا ہے۔ ائیر کنٹرول افسر اور موبائل افسر کو کیا اقدامات کرنے چاہئیں؟''

سوال کرنے کے بعد کسی بھی پائلٹ سے جواب طلب کیا جاسکتا ہے۔ تسلی بخش جواب نہ دینے والے پائلٹ کو نہ صرف خفت اٹھانا پڑتی ہے بلکہ اسے فوری طور پر پرواز سے روک دیا جاتا ہے۔

اوپر کی سطروں میں ہم نے موبائل افسر کا ذکر کیا۔ یہ افسر رن وے کے قریب بنے ہوئے ایک چھوٹے سے کیبن میں بیٹھتا ہے جس کے چاروں طرف اور اوپر' شیشے کی چھت ہوتی ہے۔ وہ ہر اترتے چڑھتے جہاز کا بغور جائزہ لیتا رہتا ہے اور ایئر کنٹرول اور پائلٹ کے درمیان ہونے والی گفتگو سنتا رہتا ہے اور کوئی غیر معمولی بات دیکھے تو ریڈیو کے ذریعے فوری طور پر پائلٹ کو آگاہ کرتا ہے اور اسے احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ پائلٹ کتنا ہی سینئر کیوں نہ ہو' موبائل افسر کے احکامات قطعی اور حتمی ہوتے ہیں۔ ٹیکسی کرتے ہوئے جہاز کو رکنے کا حکم دیا جائے تو پائلٹ پرواز نہیں کرتا بلکہ جہاز کو موڑ کر واپس لے آتا ہے۔ ممکنہ ہنگامی صورت حال سے نبٹنے کے لیے جو اقدامات ضروری ہیں' موبائل افسر کے پاس ان کی فہرست اور چیک لسٹ موجود ہوتی ہے جن کی مدد سے وہ پائلٹ کی رہنمائی کرتا ہے۔

۸ مئی کی صبح ''ایمرجنسی کلاس'' لینے کی ذمہ داری بھی فلائٹ لیفٹیننٹ ظہیر پر تھی۔ وہ حال ہی میں ایئر وار فیر سٹاف کالج سے کمبیٹ (Combat) کمانڈ کورس کر کے واپس لوٹے تھے۔ ان کی معلومات تازہ ترین تھیں اور انہوں نے بھرپور اعتماد سے مختلف ہنگامی صورتوں کو منظر کشی کرتے ہوئے ایمرجنسی سیشن کو اختتام تک پہنچایا۔ کسے معلوم تھا کہ ڈائس کے پیچھے کھڑے ہوئے' بھرپور اعتماد کے لہجے میں بات کرنے والے استاد کو چند منٹوں بعد ہی انتہائی پیچیدہ صورت حال کا سامنا کرنا ہوگا اور اسے عملی طور پر ثابت کرنا ہوگا کہ وہ اپنے علم کو استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

فلائٹ لائن پر ایک میراج طیارے کو مشن کے مطابق تیار کر دیا گیا تھا۔ اس کے تمام حصے پرزوں کی پڑتال کر لی گئی تھی اور ایک مخصوص فارم 781 تیار کر لیا گیا تھا جس میں جانچ پڑتال کی تفصیلات اور بڑے بڑے حصوں کی حالت بیان کی گئی تھی۔ ٹیکنیکل آفیسر' کریو چیف (Crew Chief) جانچ پڑتال سے مطمئن تھا اور طیارہ پائلٹ کے حوالے کے لیے تیار۔

فلائٹ لیفٹیننٹ ظہیر ایمرجنسی سیشن سے فارغ ہونے کے بعد ایک اور چھوٹے کمرے میں اپنے طالب علم فلائٹ لیفٹیننٹ ذوالفقار کے ساتھ مصروف گفتگو تھے۔ انہوں نے ذوالفقار کو مشن کی تفصیلات سمجھائیں۔ نقشے پر جانے اور آنے کی گزرگاہیں سمجھائیں اور ایک بار پھر ان اقدامات کا ذکر کیا جو کسی ممکنہ ہنگامی صورت حال کی شکل میں انہیں اختیار کرنا ہوں گے۔ اس کے بعد وہ آفیسر کمانڈنگ فلائٹ کے دفتر میں گئے اور ''اتھارائزیشن رجسٹر'' پر اپنے دستخط ثبت کیے۔ اس رجسٹر میں ان تمام پروازوں کا اندراج ہوتا ہے جو اس دن روانہ ہوئی ہوں۔ تمام اندراجات اوسی فلائنگ بقلم خود کرتے ہیں اور اس میں مشن کی تفصیلات' جہاز کا نمبر اور پائلٹوں کے نام لکھے ہوتے ہیں۔ یہ اندراجات گویا پائلٹ کے لیے اجازت نامہ ہوتے ہیں کہ وہ فلاں دن' فلاں وقت' فلاں جہاز

لے کر فلاں مشن پر روانہ ہو سکتے ہیں۔

رجسٹر پر دستخط کرنے کے بعد دونوں پائلٹ ایک کمرے میں گئے اور وہاں سے انہوں نے اپنا جی سوٹ' لائف جیکٹ اور کریش ہیلمٹ وصول کیا۔ جی سوٹ اصل میں کشش ثقل کم کرنے کا ایک لباس ہوتا ہے۔ فوجی طیاروں کی پرواز کے دوران' خاص طور پر مڑتے ہوئے پائلٹ کے جسم پر کشش ثقل کا کھچاؤ دگنا یا تگنا ہو جاتا ہے' فضائی لڑائی کے دوران جب پائلٹ کو یکلخت مڑنا پڑے یا فوری طور پر بلندی کی جانب اٹھنا ہو یا دفعتاً جہاز کی رفتار بڑھانی پڑے تو کشش ثقل کا کھچاؤ نو گنا تک بڑھ سکتا ہے۔ اس شکل میں جسم کا سارا خون نچلے حصوں میں جمع ہو سکتا ہے اور دماغ کو خون کی فراہمی رک جائے تو پائلٹ صاحب خاموشی سے ٹائیں ٹائیں فش ہو سکتے ہیں اور پائلٹ کی گردن ہی ڈھلک جائے تو جہاز کو لڑھکنے سے کون روکے۔ تو یہ جی سوٹ کشش ثقل کے کھچاؤ کو قدرے کم کرتا ہے۔ اس لباس کے اندر ہوا کی نالیاں بنی ہوتی ہیں جنہیں کاک پٹ میں ایک پائپ سے جوڑ دیا جاتا ہے اور وہ پائلٹ کے جسم کو مختلف حصوں سے اس طرح دباتی ہیں کہ اوپر کے حصے کا خون اوپر ہی رہے اور نچلے حصے میں آ کر ایک جگہ سمٹ نہ جائے۔ سمندر کے قریبی علاقوں میں پرواز کرنے والے پائلٹوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ لائف جیکٹ بھی پہنیں۔ محض ساتھ رکھنا ضروری نہیں' پہننا لازم ہے کہ فوجی طیاروں کی رفتار اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ایمرجنسی کی صورت میں اسے پہننے کا وقت بھی نہیں ملتا۔

فلائٹ لائن پر دونوں پائلٹوں نے گھوم پھر کر جہاز کا معائنہ کیا اور جہاز کے ساخت کنندگان کی ہدایات کے مطابق اس کی جانچ پڑتال کر کے فارم 781 پر دستخط کر دیئے۔ فلائٹ لیفٹیننٹ ذوالفقار پہلے جہاز میں داخل ہوئے اور سامنے والی نشست پر بیٹھ گئے جبکہ فلائٹ لیفٹیننٹ ظہیر نے عقبی نشست سنبھالی۔ استاد سے اجازت لے کر ذوالفقار نے قبل از پرواز پڑتال (Pre Flight Checks) شروع کی۔ اس دوران وہ ہیڈ فون پر بولتے بھی جاتے تھے تاکہ استاد کو پتہ چلتا رہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

''آکسیجن لیول۔۔۔۔۔۔۱۰۰ فیصد''

''سکرین کی دھند صاف کرنے والے وائپر۔۔۔۔۔۔آف''

''سمت کا تعین کرنے والا آلہ۔۔۔۔۔۔سیٹ''

''پارکنگ بریک۔۔۔۔۔۔آن''

''ایمرجنسی ہائیڈرالک پمپ سوئچ۔۔۔۔۔۔آن''

پائلٹ کو قبل از پرواز اور بعد از پرواز اس طرح کے بیسیوں اقدامات کرنے ہوتے ہیں۔ فلائٹ لیفٹیننٹ نے جانچ پڑتال مکمل

کر کے ایئر ٹریفک کنٹرول سے اجازت لے کر انجن سٹارٹ کیا۔ انجن سٹارٹ کرنے کے لیے جہاز کی بیٹریاں استعمال نہیں کی جاتیں بلکہ جہاز کے باہر ایک ٹرالی پر رکھی بیٹری استعمال کی جاتی ہے تاکہ جہاز کی بیٹریاں دوران پرواز استعمال کے لیے سالم رہیں۔ جہاز سٹارٹ ہونے پر زمینی عملہ بیٹری کی تار اتار کر اپنی ٹرالی الگ کر لیتا ہے۔ آلات چیک کئے گئے۔ آر پی ایم ۸۰۰۰ تک پہنچا تو ذوالفقار نے ایئر کنٹرول سے ٹیکسی کرنے کی اجازت چاہی۔ ابھی تک آگ بجھانے والا عملہ مستعد کھڑا تھا۔ جہاز میں بے تحاشا ایندھن بھرا جاتا ہے۔ ایندھن بھرنے کے دوران جو پٹرول بہتا ہے وہ بخارات بن کر جہاز کی سطح پر یا اردگرد موجود رہتا ہے۔ احتیاط کے طور پر آگ بجھانے والے آلات (Crash Tender) تیار رکھے جاتے ہیں۔ پائلٹ کی طرف سے اشارہ ملنے پر متعلقہ عملہ بھی جہاز سے دور ہٹ جاتا ہے۔ فلائٹ لیفٹیننٹ ذوالفقار نے انگوٹھوں کی مدد سے زمینی عملے کو اشارہ کیا کہ وہ پہیوں کے آگے رکھی ہوئی رکاوٹیں ہٹا دیں۔ کلیرنس کا اشارہ ملنے پر ذوالفقار نے بریک ڈھیلی کی اور تھروٹل کو بڑھا دیا۔ جہاز حرکت کرنے لگا۔

شہر میں زندگی کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ سب سے زیادہ بھیڑ سبزی منڈی میں تھی۔ آڑھت اور نیلامی کا کام زوروں پر تھا۔ وہ بھاری ٹرک جو دور دور سے سبزیاں اور پھل لے کر گزشتہ رات منڈی پہنچے تھے' سامان اتار کر واپس جا رہے تھے اور سڑکوں کی بھیڑ میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ جہاں پہلے ہی منی بسیں' بڑی بسیں اور ویگنیں اور رکشے' ٹیکسیاں اور پرائیویٹ کاریں بھاگم دوڑ میں مصروف تھیں۔ ان میں طالب علم تھے' طالبات تھیں' دفتروں کو جانے والے کلرک بابو' افسر' تجارت پیشہ۔ سبھی اپنی اپنی منزلوں کو رواں تھے۔

کراچی کبھی ماہی گیروں کے گھانس پھونس کے جھونپڑوں اور کچے مکانات پر مشتمل چند دیہات کا مجموعہ تھا۔ اسے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے ایک انگریز فوجی افسر سر چارلیس نیپئر نے ۱۸۴۳ء میں آباد کیا۔ فوجی علاقوں میں کچھ بیرکیں ابھی تک اسی کے نام سے موسوم ہیں۔ اس نے یہاں شاندار عمارتیں بنوائیں۔

ڈینسو ہال ۱۸۵۶ء میں تعمیر ہوا' فریر ہال ۱۸۶۵ء میں۔ تقسیم ہند کے وقت کراچی کی آبادی بمشکل تین لاکھ ہوگی اور یہ آبادی بھی صدر' سولجر بازار اور بولٹن مارکیٹ کے اردگرد علاقوں میں مرکوز تھی۔ اس آبادی میں پندرہ سے اٹھارہ ہزار عیسائی تھے اور کوئی پچیس ہزار کے قریب پارسی۔ جو علاقہ آج کل لیاقت آباد کے نام سے جانا جاتا ہے' لالو کھیت کہلاتا تھا اور یہاں کھیت تھے جو اپنے ہندو مالک لالو کے نام پر مشہور تھے۔ تین ہٹی کا پل نہیں تھا' جنہیں ضرورت ہوتی ندی میں سے گزر کر کھیتوں کی طرف جایا کرتے۔ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کو یہاں آباد کیا گیا تو آبادکاری کے سلسلے میں بھرپور معاونت مہیا کرنے پر علاقے کا نام ملک

کے پہلے وزیراعظم کے نام پر لیاقت آباد رکھا گیا۔

مسرور بیس اس وقت ماڑی پور بیس کہلاتا تھا۔ قائداعظم پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالنے کے لیے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو بمبئی سے کراچی پہنچے تو اسی ہوائی اڈے پر اترے تھے۔ اس علاقے میں ان دنوں سمندری پانی سے نمک نکالا جاتا تھا اور انگریزوں کی طرف سے ٹیکس وصول کرنے کے لیے جو سالٹ ریونیو آفیسر مسٹر ماری مقرر کیا گیا' اسی کے نام پر یہاں کا نام ماری پور رکھا گیا۔ فضائی اڈہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے تعمیر کیا گیا تھا اور یہ جہازوں کے لیے عارضی مستقر کام کرتا تھا یعنی یورپ اور امریکہ سے جہازوں کے بڑے بڑے حصے پرزے بحری جہازوں میں یہاں لائے جاتے۔ اڈے پر انہیں اسمبل کیا جاتا اور جانچ پرواز (Test Flight) کے بعد انہیں آگے برما کے محاذ کی طرف بھیج دیا جاتا۔ پاکستان کے قیام کے بعد جنوری ۱۹۴۸ء میں اسے پاک فضائیہ کے اپریشنل اڈے میں بدل دیا گیا۔ ایئر مارشل نور خان جو اس وقت ونگ کمانڈر تھے' پہلے بیس کمانڈر کے طور پر یہاں آئے۔ لیکن ایک دو دنوں ہی میں انہیں ایک اور اہم مشن پر لندن بھیج دیا گیا اور ونگ کمانڈر ظہیر اس کے پہلے بیس کمانڈر مقرر ہوئے۔ موجودہ نام ونگ کمانڈر مسرور حسن کے نام پر رکھا گیا جنہوں نے اس اڈے کی استعداد بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا اور اسی اڈے کے اردگرد پرواز کرتے ہوئے ایک حادثے میں وہ شہید ہو گئے۔ اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ کسی بھی ہوائی اڈے کی تعمیر کے وقت وہاں چلنے والی ہوا کا بغور مشاہدہ کیا جاتا ہے اور عام طور پر ہوا جس رخ چلتی ہے اسی رخ رن وے بنایا جاتا ہے کہ جہاز کے لیے ضروری ہے کہ ٹیک آف یا لینڈنگ کے وقت وہ ہوا کی مخالف سمت میں حرکت کرے۔ کراچی میں ہوا عام طور پر مغرب سے مشرق کو چلتی ہے۔ چنانچہ جناح انٹرنیشنل اور مسرور بیس کے رن وے اسی رخ پر واقع ہیں۔

۸ مئی کی صبح پاک فضائیہ کا میراج۔III طیارہ بھی رن وے کے کنارے مغرب کی طرف منہ کئے کھڑا تھا۔ کاک پٹ کے عین نیچے رن وے پر سفید پینٹ سے ۲۷ کے ہندسے لکھے ہوئے تھے جو ۲۷۰ ڈگری یعنی مغرب کی سمت کو ظاہر کرتے تھے۔ ایئر کنٹرول سے پرواز کی اجازت لینے کے بعد فلائٹ لیفٹیننٹ ذوالفقار نے دائیں ہاتھ سے سٹک پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے بائیں ہاتھ سے تھروٹل کو آگے بڑھایا۔ طیارے کی گرجدار آواز میں غراہٹ کا اضافہ ہوا اور وہ تیزی سے رن وے پر دوڑنے لگا۔ جب آر پی ایم ۹۳ فیصد اور رفتار ۱۹۰ ناٹیکل میل تک پہنچی تو ذوالفقار نے آہستگی سے سٹک کو اپنی طرف کھینچا۔ جہاز نے سر اٹھایا اور چند لمحوں بعد فضا میں بلند ہو گیا۔ ذوالفقار نے زمینی بریک لگائی جس سے گھومتے ہوئے پہیے رک گئے۔ گیر لیور کو اپ کیا تو لینڈنگ گیر یعنی جہاز کی نچلی جانب پہیوں کا پورا حصہ آہستگی سے نیم دائرے کی شکل میں گھومتے ہوئے جہاز کے درمیان حصے میں سما گیا اور پہیوں کی محراب بند ہو

گئی۔

اپنے دائیں پاؤں کے نیچے پتوار (Rudder) اور سٹک کو دائیں جانب دباتے ہوئے ذوالفقار نے جہاز کا رخ دائیں جانب موڑا اور بعداز پرواز پڑتال میں مصروف ہو گیا۔ انسٹرکٹر فلائٹ لیفٹیننٹ ظہیر پوری توجہ سے آلات کے پینل پر نظر جمائے اس کے اقدامات دیکھ اور سن رہے تھے۔ طالب علم اور مشین' دونوں ٹھیک کام کر رہے تھے۔

جب جہاز حب چوکی پر پہنچا تو ذوالفقار نے دوسرے مرحلے کی تیاری کی۔ یہاں سے انہیں اپنا رخ بلوچستان میں واقع تربتی علاقے کی طرف موڑنا تھا۔ ذوالفقار ابھی مقناطیسی سمتی آلے پر مطلوبہ سمت لگانے ہی والے تھے کہ فلائٹ لیفٹیننٹ ظہیر نے انجن آئل کی وارننگ لائٹ کو جلتے بجھتے پایا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انجن کو چکنا رکھنے والے تیل کی فراہمی میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ اگر تیل کی فراہمی رک جائے تو انجن جام بھی ہو سکتا تھا۔ ظہیر نے ذوالفقار سے پوچھا' آیا اس کے پینل پر بھی انجن آئل کی بتی جل بجھ رہی تھی۔ اس کے جواب سے پہلے ہی انجن آئل کی سرخ بتی ساکت ہو گئی۔ یہ گویا تیل کی فراہمی میں کسی خرابی کی یقینی خبر تھی۔

پلک جھپکتے ہی فلائٹ لیفٹیننٹ ظہیر نے کنٹرول سنبھال لیا۔ سٹک کو تھامتے ہوئے اور دونوں پاؤں پتواروں میں رکھتے ہوئے ہیڈ فون میں پکارے۔

''کنٹرول میرے پاس'' (I have the Control)

''کنٹرول آپ کے پاس سر'' (You have the control, Sir) ذوالفقار نے تصدیقاً دہرایا' پاؤں پتوار سے اٹھا لیے اور سٹک کو چھوڑ دیا۔

جہاز کے کپتان کی آواز میں ایک لرزش تھی جس سے ذوالفقار کو احساس ہو گیا تھا کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ اس نے آلات پر نظر دوڑائی تو بات سمجھ میں آ گئی۔ اسے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے بارہا جن ممکنہ ہنگامی صورتوں کا ذکر کرتے رہے تھے' ان میں سے ایک پیش آ گئی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ کتنے تحمل کے ساتھ اس مشکل کو نبھا سکتے تھے۔ ذوالفقار کے جسم میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے اس نے کاندھوں کے اوپر پیراشوٹ کے ہینڈل کو چھو کر دیکھا۔ پیراشوٹ کے ذریعے چھلانگ لگانی ہو تو حکم تو سینئر کی طرف سے آتا ہے اور پہلے عقبی نشست والا خود کو Eject کرتا ہے۔ اگر سامنے کی نشست والا پہلے چھلانگ لگا دے تو پیچھے بیٹھنے والے کے زخمی ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ جب پیراشوٹ کا ہینڈل کھینچا جاتا ہے تو اس سے نشست کے نیچے لگا ہوا ایک راکٹ فائر ہوتا ہے اور اتنے زور کا دھماکہ ہوتا ہے کہ پائلٹ نشست سمیت پوری قوت سے اوپر کی طرف اٹھتا

ہے۔ یا نشست کے اوپر لگے ہوئے دھاتی حصے شیشے کی کینوپی کو توڑ دیتے ہیں اور پائلٹ فضا میں بلند ہو جاتا ہے۔

جب فلائٹ لیفٹیننٹ ظہیر نے جہاز کا کنٹرول سنبھالا تو مشن کی ضروریات کے مطابق وہ تین سو ناٹیکل میل یعنی ۵۵۵ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ رہے تھے اور وہ زمین سے صرف دو ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ کنٹرول ہونے لگا۔ ساتھ ہی جہاز کا رخ بھی دائیں جانب موڑ دیا گیا تھا تاکہ وہ اڈے کی طرف واپس جا سکیں۔ فلائٹ لیفٹیننٹ ظہیر نے انجن کو تیل کی فراہمی کی متبادل تدبیر کے سوئچ بھی آن کر دیئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہو گیا تھا کہ وہ نوزل جن کے ذریعے انجن کا دھواں باہر نکلتا ہے' مزید کھول دیا جائے۔ یہ ایک احتیاطی تدبیر ہے کیونکہ انجن کو تیل کی فراہمی کی اصلی صورت بحال کرنے کی کوششیں کامیاب ہو جائیں تو انجن میں جانے والے تیل کی مقدار دگنی ہو سکتی ہے اور اس کے جلنے سے گیسوں کی مقدار بڑھ سکتی ہے جو انجن کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے چنانچہ نوزل کا منہ کھول دیا جاتا ہے۔ ظہیر کی ہدایت پر ذوالفقار نے متعلقہ بٹن دبایا۔ اس کے ساتھ ہی ظہیر نے دیکھا کہ RPM کی سوئیاں واپس آ رہی تھیں۔ یہ ۸۰ فیصد پر آ کر رک گئیں۔ اب تک وہ سات ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ چکے تھے۔ ایمرجنسی میں فوری طور پر بلندی اس لیے کی جاتی ہے کہ پائلٹ کو احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا موقع مل سکے۔ ورنہ نیچی پرواز میں ایمرجنسی صورت حال پیش آ جائے تو جہاز کو زمین سے ٹکرانے میں کیا دیر لگتی ہے۔ آر پی ایم گرنے کا مطلب یہ تھا کہ انجن کو پٹرول کی فراہمی میں بھی کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ میراج طیارہ اتنا بھاری جہاز ہے کہ اسے فضا میں اڑنے کے لیے ۱۰۰ فیصد قوت چاہیے۔ آر پی ایم گرنے لگیں تو سمجھیں کہ اب جہاز کی باری ہے۔ ظہیر نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے ایمرجنسی ریگولیشن کا بٹن دبا دیا۔ یہ بھی انجن کو ایندھن کی فراہمی کی متبادل تدبیر ہے جس میں پٹرول اپنی ٹینکیوں سے ایندھن کنٹرول کرنے والے یونٹ سے گزرے بغیر براہ راست انجن کے پسٹنوں میں جاتا ہے۔

جب ظہیر آلات کے ساتھ الجھا ہوا تھا' اس کا دماغ برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ اسے یاد تھا کہ ہوائی اڈے سے پرواز کرتے وقت اضافی ایندھن کی جو ٹنکیاں انہوں نے ساتھ لی تھیں' ان سمیت جہاز کا وزن ۳۲ ہزار پاؤنڈ سے بھی زائد تھا۔ اس وزن کے ساتھ جہاز پرواز تو کر جاتا ہے لیکن اتر نہیں سکتا کہ اس کے لینڈنگ گیئر اتنے بھاری وزن کے زمین سے ٹکرانے کا جھٹکا برداشت نہیں کر سکتے۔ اترنے کے لیے جہاز کا وزن تقریباً ۲۳ ہزار پاؤنڈ یا اس سے کم ہونا چاہیے۔ انہیں رن وے سے پرواز کئے ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی اور ابھی تو اصل ٹنکوں کا ایندھن بھی استعمال نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ظہیر نے اضافی ٹینکوں کا ایندھن گرانے کا فیصلہ کیا۔ کاک پٹ میں ایک خاص بٹن دبانے سے اضافی ٹنکیوں کے نیچے ایک گول ڈھکن ایک طرف کو سرک جاتا ہے اور ایندھن نیچے گرنے لگتا

ہے۔ عام حالات میں تو نیچے گرنے والا پٹرول ٹینکی کے ساتھ پیچھے کو بہتا ہوا بخارات میں تبدیل ہو کر ہوا میں مل جاتا ہے لیکن ہوا کی رفتار تیز ہو' بار بار اس کا رخ بدل رہا ہو اور جہاز کی رفتار کم ہو جائے تو اس بات کا خدشہ ہوتا ہے کہ بہنے والا یہ پٹرول جہاز کے ان حصوں تک نہ پہنچ جائے جو سخت گرم ہوتے ہیں۔ اس صورت میں آگ لگنے کا خدشہ ہوتا ہے اور پورا طیارہ شعلوں کی لپیٹ میں آ سکتا ہے۔

لیکن ظہیر کو احساس تھا کہ وہ انسانی آبادیوں کے اوپر اڑ رہا ہے۔ اس نے جان کا خطرہ مول لیتے ہوئے متعلقہ بٹن دبا دیئے۔

ان ساری کوششوں کے ساتھ ساتھ ریڈیو پر ائیر کنٹرول سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی جاری تھی۔ ظہیر اب تک دو چینل بدل چکے تھے لیکن ائیر کنٹرول سے رابطہ نہیں ہو پایا تھا۔ تیسرے چینل پر ان کا رابطہ ہوا تو انہوں نے ہنگامی صورت حال کا اعلان کیا اور بتایا کہ وہ فوری طور پر اڈے کی طرف واپس آ رہے ہیں۔ اس کے فوراً بعد انہوں نے موبائل افسر سے رابطہ کیا' پہلی کوشش ہی کامیاب رہی۔ انہوں نے موبائل افسر کو ساری صورت حال بتائی اور درخواست کی کہ جس صورت حال سے وہ دوچار تھے' اس سے متعلق ہدایات فوری طور پر انہیں پڑھ کر سنائی جائیں۔ بتائے گئے طریقوں کے مطابق یہ ایک احتیاطی تدبیر تھی۔ گھبراہٹ میں ممکن ہے کوئی ایسا بٹن جسے آن کرنا ہو' آف کر دیا گیا ہو یا جسے آف کرنا چاہیے' آن ہو گیا ہو۔

اب تک فلائٹ لیفٹیننٹ ظہیر جہاز کو رن وے کی سیدھ میں لانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اب ان کی بھرپور کوشش یہ تھی کہ وہ جہاز کو سامنے رن وے پر اتار لیں۔ اب تک کی پیچیدہ صورت حال کے پیش نظر اس بات کا واضح جواز موجود تھا کہ وہ چھلانگیں لگا کر اپنی جانیں بچائیں لیکن پاک فضائیہ کی روایات کے پیش نظر ظہیر نے آخر دم تک جہاز اور آبادی کو تباہی سے بچانے کا عزم کر رکھا تھا۔ صورت حال یہ تھی کہ وہ جب تک ایمرجنسی ریگولیشن کا بٹن دبائے رکھتے' ایندھن انجن میں جاتا رہتا اور آر پی ایم کی سوئیاں ظاہر کرتیں کہ جہاز کو طاقت مل رہی ہے لیکن جیسے ہی وہ بٹن چھوڑتے آر پی ایم گرنے لگتا۔ پائلٹ کو اس بات کی فکر بھی تھی کہ اضافی ٹینکیوں کا ایندھن گر چکا ہے یا نہیں۔ وہ ایک سے زائد طیاروں کی فارمیشن میں اڑ رہے ہوتے تو کوئی اور پائلٹ انہیں بتا دیتا کہ ایندھن گر رہا ہے یا نہیں لیکن اس وقت وہ اکیلے تھے۔ ٹینکیاں نیچے اور پیچھے تھیں۔ کوئی تدبیر ایسی نہ تھی جس سے معلوم ہوتا کہ ایندھن گر رہا یا نہیں۔ وہ دو ہزار فٹ کی بلندی تک اتر آئے تھے کہ آر پی ایم پھر گرنے لگا اور جہاز کی رفتار بھی کم ہو گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ انجن میں جانے والے پٹرول میں پھر گڑبڑ ہو گئی تھی اور جو قوت پیدا ہو رہی تھی وہ جہاز کو ہوا میں سنبھالے رکھنے کے لیے ناکافی تھی۔ رفتار مزید کم ہوتی گئی تو جہاز پتھر کے تودے کی طرح زمین پر آ گرتا۔

* ظہیر کے پاس تین راستے تھے۔

☆ پہلا یہ کہ وہ ایمرجنسی ریگولیشن کو بحال کرنے کی کوششیں جاری رکھے۔ بلندی کم تھی اور وقت بہت کم۔ خدشہ تھا کہ دو تین لمحوں میں انجن کو پٹرول کی فراہمی بحال نہ ہوتی تو جہاز آبادی والے علاقوں میں گر کر تباہی مچا دیتا۔ پائلٹ بھی جان سے جاتے اور بیسیوں شہری بھی جاں بحق ہوتے۔

☆ دوسرا یہ کہ وہ جہاز سے چھلانگیں لگا کر اپنی جانیں بچا لیں۔

☆ تیسرا یہ کہ اضافی ایندھن کی ٹینکیاں گرا کر جہاز کا وزن ہلکا کیا جائے۔

وقت کم تھا اور ظہیر نے فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ اس نے آخری تدبیر آزمانے کا فیصلہ کیا اور ہیڈفون پر پکارا۔

''اضافی ٹینکیاں گرا دو۔''

ظہیر کے اپنے دونوں ہاتھ پاؤں مصروف تھے۔ پاؤں پتوار (Rudders) پر تھے۔ دائیں ہاتھ میں سٹک تھی اور بائیں ہاتھ سے وہ ایمرجنسی ریگولیشن بٹن کو مسلسل دبا رہے تھے۔

ذوالفقار نے جواب دیا۔ ''سر! ہم آبادی والے علاقے پر اڑ رہے ہیں۔''

ذوالفقار کو معلوم نہیں تھا کہ جہاز کا کپتان تمام ممکنہ تدابیر پر غور کر چکا ہے' یہ آخری تدبیر تھی تباہی کو کم کرنے کی۔ لیکن بحث کا وقت تھا نہ گنجائش۔ ظہیر ہیڈفون پر دہاڑے۔

''Jettison the Tanks''

ذوالفقار نے متعلقہ بٹن دبا دیا۔ جوں ہی ٹینکیاں نیچے گریں جہاز کا توازن بگڑ گیا اور وہ غوطہ لگا کر نیچے گرنے لگا۔ ظہیر نے اپنے حواس پر قابو پائے رکھا۔ ایک لمحے کے لیے جہاز کو نیچے جانے دیا اور پھر آہستگی سے سٹک کو اپنی طرف کھینچا۔ جہاز سیدھا ہو گیا اور اس کی رفتار بھی بڑھ گئی۔ ظہیر کو اس وقت بلندی والے آلے پر نظر ڈالنا یاد ہے۔ وہ سات سو فٹ تک نیچے گر گئے تھے۔ چند لمحوں ہی میں وہ مسرور بیس کے قریب پہنچ گئے۔ ذوالفقار نے دیکھا کہ لینڈنگ گیئر ابھی تک ڈاؤن نہیں کیا گیا تھا' پہیے باہر نہیں نکلے تھے۔ انہوں نے ظہیر کو یاد دلایا۔ ظہیر نے جان بوجھ کر لینڈنگ گیئر ڈاؤن نہیں کیا تھا۔ انہیں ابھی تک انجن سے پوری قوت نہیں مل رہی تھی۔ یہ ۲۱ فیصد کم تھی۔ وہ پہیے باہر نکالتے تو جہاز کے نیچے سے گزرنے والی ہوا میں رکاوٹ پیدا ہوتی اور جہاز کی رفتار مزید کم ہو جاتی۔ ظہیر آبادی والے علاقے پر کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔

موبائل آفیسر اور اوٹی فلائنگ نے جہاز کو آتے دیکھا تو ان کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ بجائے ایک سیدھ میں نیچے

اترنے کے' جہاز دائیں بائیں ہچکولے لیتا نیچے اتر رہا تھا۔ لینڈنگ گیئر بھی ڈاؤن نہیں کئے گئے تھے۔ موبائل آفیسر نے ریڈیو پر ہدایت بھی دی لیکن پائلٹ کے پاس وضاحت کا وقت نہیں تھا۔ لینڈنگ گیر اس وقت ڈاؤن کئے گئے جب رن وے تقریباً پانچ سو گز رہ گیا تھا۔ ابھرتی ہوئی نبضوں کے ساتھ ظہیر نے آہستگی سے جہاز کو رن وے پر اتارا۔ فوراً بعد تھروٹل کو پیچھے کھینچا اور ڈریگ شوٹ کا بٹن دبا دیا۔ شوٹ تیزی سے باہر نکلا اور لمحوں میں اس کی چھتری کھل گئی۔ جہاز آہستہ ہو گیا۔ ظہیر جہاز کو رن وے کے کنارے لے آئے تاکہ مین رن وے پر ٹریفک میں خلل نہ پڑے۔ انہوں نے بریکیں لگائیں اور منہ زور طیارہ ساکت کھڑا ہو گیا جیسے کوئی بدکا ہوا گھوڑا اپنے اصطبل کو لوٹ آیا ہو۔

فائر بریگیڈ اور آگ بجھانے والے جدید آلات سے لیس دیگر گاڑیاں' اوسی فلائنگ' اوسی انجینئرز جہاز کی طرف لپکے۔ انجن سے نکلنے والے شعلے بھڑک سکتے تھے لیکن زمینی عملہ جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے جہاز کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ سیڑھیاں لگائی گئیں۔ پائلٹ کینوپی کھول چکے تھے لیکن ابھی تک اندر ہی تھے اور چیک لسٹ کے مطابق مختلف بٹن آف کر رہے تھے۔ اوسی انجینئرز سیڑھیوں کی مدد سے اوپر چڑھے۔ انہوں نے پائلٹوں کو تھپکی دیتے ہوئے باہر آنے کا اشارہ کیا اور خود کاک پٹ میں جھکتے ہوئے انجن بند کر دیا۔ پھر زمینی عملے کو اشارہ کیا جنہوں نے جہاز پر ایک خاص گیس کی بوچھاڑ کر دی۔ دھواں بند ہو گیا۔ پائلٹ نیچے اترے۔ اوسی فلائنگ نے انہیں اپنی جیپ میں بٹھایا اور دفتروں کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹیک آف سے واپس رن وے پر اترنے میں کل پندرہ منٹ لگے ہوں گے اور ہنگامی صورت حال تین چار منٹ جاری رہی ہو گی لیکن جدوجہد اور کشمکش کے یہ لمحات پائلٹوں کے ذہن پر ہمیشہ کے لیے مرتسم ہو چکے تھے۔ واقعہ کی تحقیقات کا حکم دیا جا چکا ہے۔ جہاز تفصیلی معائنے اور خرابی کی وجوہات معلوم کرنے کے لیے کامرہ ایروناٹیکل کمپلیکس پہنچایا جا چکا ہے۔

حادثے والے دن پاک فضائیہ نے ایک پریس ریلیز کے ذریعے عوام کو پوری تفصیلات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ حادثہ ناگزیر فنی وجوہات کی بنا پر پیش آیا۔ پاک فضائیہ کی طرف سے حادثے پر تاسف اور جاں بحق اور زخمی ہونے والوں سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔ ان کی ہمدردی زبانی جمع خرچ تک محدود نہیں تھی۔ تمام زخمیوں کو فوری طور پر پی این ایس شفا میں منتقل کیا گیا۔ پاک فضائیہ کا ایک سینئر افسر روزانہ ان کی خیریت دریافت کرنے ہسپتال پہنچتا' زخمیوں کو پھولوں کے گلدستے اور تازہ پھول پہنچائے جاتے۔ جن افراد کے اہل خانہ حادثے میں شہید یا زخمی ہوئے انہیں فوری طور پر ساڑھے ساتھ لاکھ روپے ادا کئے گئے۔ رقم وصول کرنے والوں میں جناب محمد یٰسین' ظہیر الدین اور شفیق صاحب شامل تھے۔ علاوہ ازیں کراچی ترقیاتی ادارے کی معاونت سے ان کی آبادکاری کا

کام بھی جاری ہے۔

اللہ تعالٰی سے دعا ہے کہ وہ پاکستان کی فضاؤں کے محافظوں اور عوام کو اپنی امان میں رکھے اور آئندہ ایسے حادثات سے محفوظ رکھے۔۔۔۔۔۔۔آمین!

◆◆◆

وادی بولان میں ''شاہین'' کی پرواز

بھارت نے اگنی۔ ۲ میزائل کے تجربے سے برصغیر میں طاقت کا توازن اپنے حق میں کر لیا تھا اور اس کے لیڈران کھلم کھلا کہہ رہے تھے کہ اب چین اور پاکستان کے تمام شہران کے میزائلوں کی زد میں ہیں۔ ان کے لب و لہجے میں وہی تحکم اور فرعونیت در آئی تھی جو ایٹمی تجربے کے بعد سننے میں آئی تھی اور پاکستان کے جوابی ایٹمی دھماکے کے بعد صلح کے پیام اور بس ڈپلومیسی میں بدل گئی تھی۔ مسلمانوں کی تاریخی مجبوری یہ ہے کہ عددی برتری یا ساز و سامان کی فراوانی انہیں کبھی مرعوب نہیں کر سکی۔ اقبال بھی انہیں ہمیشہ یہ پیام دیتے رہے۔

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

پاکستان کی سیاسی و فوجی قیادت کو بخوبی احساس ہے کہ ہمارا اصل مسئلہ اقتصادی ہے اور ہم اسلحے کی دوڑ میں شامل نہیں ہو سکتے۔ ہم برہنہ پا بھی ہیں برہنہ سر بھی لیکن ایک تو قومی سلامتی کو یقینی بنائے بغیر اقتصادی ترقی خیال است و محال است' دوسرے وہی تاریخی مجبوری کہ ہم نے ہمیشہ سر اٹھا کر جینا سیکھا ہے۔ بقول اقبال:

برہنہ سر ہے تو عزم بلند پیدا کر
یہاں فقط سر شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

چنانچہ پاکستان نے چند دنوں بعد ہی پہلے غوری۔ ۲ کا تجربہ کیا' پھر شاہین کا۔

* شاہین میزائل داغے جانے کی مفصل روداد۔۔۔۔۔۔

جی ایچ کیو سے ایک محفوظ فون پر ہدایت وصول ہوئی۔ ''پاکستان ٹیلی ویژن کراچی سے رابطہ کریں۔ کیمرہ مینوں کی دو ٹیمیں درکار ہیں۔ یہ ٹیمیں دو گھنٹے کے نوٹس پر روانگی کے لیے تیار رہیں۔'' فوج میں رہتے ہوئے بعض اوقات خود پر بہت جبر کرنا پڑتا ہے۔ تجسس انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ ان جانے کو جاننے کی تمنا اسے بے تاب رکھتی ہے۔ لیکن فوج میں رہتے ہوئے بعض اوقات خود پر بہت جبر کرنا پڑتا ہے۔ بہت صبر چاہیے کہ یہی جبر ملکی سلامتی کا ضامن ہے۔ حالات واضح تھے۔ ہم نے پوچھا نہ ادھر سے بتایا

گیا کہ ٹیمیں کیوں' کہاں چاہئیں۔ محفوظ فون پر بھی گفتگو مکمل محفوظ تو نہیں ہے نا۔

بہتر ہے کہ بے چارے ممولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

ہم نے کراچی ٹیلی ویژن کے نیوز ایڈیٹر کو فون کیا۔ بس اتنا ہی بتایا کہ دو ٹیمیں چاہئیں۔ وہ فوجیوں سے بھی زیادہ محتاط نکلے' بس ایک لفظ میں جواب دیا۔ ''ڈن'' (Done)

رات کا ایک پہر بیت چکا تھا۔ ہم کراچی کے ایک فوجی اڈے پر لیفٹیننٹ تبسم کے ساتھ چہل قدمی میں مصروف تھے۔ ہماری اطلاع کے مطابق ایک فوجی جہاز جی ایچ کیو کے کچھ افسروں کو لے کر اب تک یہاں اتر جانا چاہیے تھا لیکن اس کی آمد میں قدرے تاخیر ہو گئی تھی۔ انتظار کی گھڑیاں کاٹنے کو ہم اڈے کی مدھم روشنی میں روشوں میں ٹہلتے تھے اور باتیں کرتے تھے۔ ہر جہاز کی آمد پر ہم سمجھتے کہ شاید اب وہ آئے ہیں لیکن جہاز سیدھی پرواز کرتا کراچی کے بین الاقوامی اڈے کی طرف چلا جاتا۔ بالآخر وہ جہاز آیا جس کا انتظار تھا۔ جی ایچ کیو کا جیٹ پروپ جہاز۔ پنکھے رکے' انجن بند ہوا' دروازہ کھلا تو جی ایچ کیو اور انٹر سروسز پبلک ریلیشنز کے کچھ افسر برآمد ہوئے۔ ان کے ساتھ شاہین میزائل کے خالق ڈاکٹر ثمر مند مبارک' ڈاکٹر اشفاق علی اور ان کے معاون سائنس دان تھے۔ علیک سلیک کے بعد گاڑیاں مہمانوں کو لے کر مختلف میسوں کی طرف روانہ ہو گئیں۔ چلتے چلتے آئی ایس پی آر کے ڈائریکٹر بریگیڈیئر راشد قریشی ہمارے کان میں چپکے سے کہہ گئے۔ ''ایچ آور نائن تھرٹی''

اس وقت تک سول ایوی ایشن ڈیپارٹمنٹ میں ایک چارٹ تیار ہو چکا تھا۔ جس میں خطوط طول بلد اور عرض بلد کے حوالوں سے ایک فضائی رستہ متعین کیا گیا تھا۔ اس کے متوازی دونوں جانب دس دس کلومیٹر کے فاصلے کی لکیریں لگائی گئی تھیں۔ صبح نو سے گیارہ بجے تک یہ کوریڈور ہر طرح کے فضائی ٹریفک کے لیے بند کیا جانا تھا۔ سول ایوی ایشن کا ایک خاص فریکوینسی پر بذریعہ وائرلیس اور ہاٹ ٹیلیفونوں پر کنٹرول روم سے رابطہ تھا کہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں اوقات میں تبدیلی کی اطلاع فوری طور پر وصول ہو سکے۔

ادھر بھارت میں وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کی حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش ہو چکی تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ دفاعی معاملات ہی تھے۔ بھارتی وزیر دفاع جارج فرنانڈس نے چند ماہ قبل بھارتی بحریہ کے سربراہ ایڈمرل وشنو بھگوت کو ملکی سلامتی کے خلاف اقدامات میں ملوث ہونے کے الزامات لگا کر برطرف کر دیا تھا۔ تامل ناڈو کی سیاسی جماعت AIADMK کی سربراہ مسز جے للیتا نے اس پر سخت احتجاج کرتے ہوئے مطالبہ کیا تھا کہ ایڈمرل وشنو بھگوت کو ان کے عہدے پر بحال کیا جائے اور

وزیر دفاع اپنے عہدے سے استعفیٰ دیں۔ مسز جے للیتا کی جماعت کو پارلیمنٹ میں ۱۸ نشستیں حاصل ہیں اور وہ بھارتیہ جنتا پارٹی کی سب سے بڑی اتحادی تھیں۔ ان کے مطالبے پورے نہ ہوئے تو انہوں نے بی جے پی سے کھلم کھلا بیزاری کا اعلان کر دیا۔ حکومت نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ دفاعی معاملات سے غافل نہیں' پے در پے ایٹمی دھماکے کئے۔ اگنی۔ ۲ کا تجربہ کیا لیکن اندرون ملک مخالفت ختم نہ ہو سکی۔ جے للیتا کے دو وفاقی وزیروں نے کابینہ سے استعفیٰ دے دیا اور بی جے پی حکومت کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اب پارلیمنٹ میں حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پر بحث جاری تھی۔ وزیر اعظم اور وزیر دفاع سخت تنقید کی زد میں تھے۔ بھارت میں قوت فیصلہ مفلوج تھی۔ کسی مہم جوئی کی توقع تو نہیں تھی لیکن احتیاط کے تقاضے پورے کرنے ضروری تھے۔

پاک فضائیہ کے تمام اڈوں پر ایئر ڈیفنس الرٹ یونٹوں کو جن کے جہاز فضائی خلاف ورزیوں کی صورت میں چند لمحوں میں فضاؤں میں اٹھ آتے ہیں' مزید چوکس کر دیا گیا تھا۔ سرحدوں پر متعین موبائل راڈار یونٹ بھی مستعد تھے۔ پاک فضائیہ کے دو جہازوں نے ایچ آور سے پہلے سے کوریڈور کے ساتھ ساتھ فضائی گشت کرنا تھی جس کی اطلاع صرف ایک بیس کمانڈر کو تھی۔ وہ اپنے ذہن میں پائلٹوں کا انتخاب کر چکے تھے۔ اس کی اطلاع صبح سویرے اپریشنل بریفنگ کے دوران دی جانی تھی۔ پاک بحریہ کے ایک نگران جہاز نے کراچی کے ساحل سے' ساحل مکران کے آخری کنارے جیوانی تک گشت کرنا تھا اور کسی اجنبی جہاز کی کوریڈور کی طرف آنے کی اطلاع فوری طور پر پاک فضائیہ اور کنٹرول روم کو کرنا تھی۔

۱۶ اپریل ۱۹۹۹ء کی صبح پانچ بجے آئی ایس پی آر اور پاکستان ٹیلی ویژن کی کیمرہ ٹیمیں اور فوٹو گرافر آئی ایس پی آر کے دفتر میں جمع تھے۔ ساڑھے پانچ بجے روانگی ہوئی۔ ہمیں اندازہ تھا کہ اتنی صبح سویرے آنے والے حضرات نہار منہ ہی تشریف لائے ہوں گے اور انہیں ناشتہ کرانا ضروری تھا۔ فیصلہ کیا کہ بلوچستان کی میزبانی سے لطف اندوز ہوا جائے۔ حب چوکی عبور کر کے بلوچستان میں داخل ہوئے تو سورج طلوع ہو چکا تھا۔ اکا دکا ہوٹل کھل رہے تھے۔ ایک کشادہ ہوٹل کا انتخاب کیا۔ گرم گرم پراٹھے' بالائی اور چینکوں میں بنی ہوئی کڑک چائے۔۔۔۔۔۔ رتجگوں کی ساری تھکن جاتی رہی۔ ناشتے کے بعد سونمیانی کی طرف روانہ ہوئے تو ایک ہیلی کاپٹر سمندر کی جانب سے پہاڑیوں کی طرف پرواز کرتا نظر آیا۔ یقیناً اس میں ڈاکٹر اشفاق اور دوسرے سائنس دان تھے۔ منزل سے تھوڑی دور تھے کہ ایک اور ہیلی کاپٹر افق پر نمودار ہوا۔ اس میں کور کمانڈر تھے لیفٹیننٹ جنرل مظفر حسین عثمانی' ڈائریکٹر آئی ایس پی آر بریگیڈیئر راشد قریشی اور دوسرے افسر۔۔۔۔۔۔ منزل پر پہنچے۔ پنجاب رجمنٹ کے ایک افسر ہم سب کے پاس بنوا چکے تھے۔ اندر داخل ہوئے تو دور لانچنگ پیڈ نظر آیا جس پر شاہین میزائل فٹ تھا۔ سائنس دانوں کی ٹیم ابھی تک میزائل پر کام میں مصروف تھی۔ جانچ

پڑتال کے آخری مراحل طے ہو رہے تھے۔ ایک سائنس دان نے ہمارا استقبال کیا اور فوراً ہی لانچنگ پیڈ پر لے گئے۔ انہوں نے پورے طریق کار کی وضاحت کی اور ان مقامات کی نشاندہی کی جہاں کیمرے نصب اور فوٹو گرافر متعین ہو سکتے تھے۔ خود سائنس دانوں نے بھی خود کار کیمرے فٹ کر رکھے تھے جن میں سے چند تو لانچنگ پیڈ کے بالکل قریب تھے۔ ہمیں حفاظتی حصار سے پرے خاردار تاروں کے پار ایک پہاڑی نظر آئی اور سوچا کہ ایک کیمرہ ٹیم وہاں متعین ہونی چاہیے۔ باقی کیمرہ مینوں اور فوٹو گرافروں کو ہم نے کرنل منصور رشید کے حوالے کیا اور ایک ٹیم کو جیپ میں بٹھا کر پہاڑی کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس کے لیے ہمیں فائرنگ رینج کے کمپلیکس سے باہر آنا پڑا تھا۔ سڑک پر آئے تو پہاڑی گھنی جھاڑیوں کے پیچھے چھپ چکی تھی۔ کچھ دور چلنے کے بعد ایک کچا رستہ نظر آیا۔ اس پر اتر گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی خاردار گھنی جھاڑیوں نے راستہ روک لیا۔ جیپ سے اتر کر پیدل روانہ ہوئے۔ بمشکل پہاڑی "ہاتھ" آئی۔ ٹیم کو وہاں چھوڑا اور بھاگم بھاگ واپس آئے۔

لانچنگ پیڈ سے ذرا ہٹ کر فائرنگ رینج کی چاروں طرف ان کارکنان کی ٹکڑیاں جمع تھیں جنہوں نے شاہین میزائل کی تیاری اور تجربے کو ریکارڈ کرنے کے انتظامات میں حصہ لیا تھا۔ ان میں وہ وہ سائنس دان بھی تھا جس نے میزائل میں الیکٹرانک آلات نصب کئے تھے اور جن کی مدد سے میزائل کی ساری خبریں بذریعہ کمپیوٹر حاصل ہونا تھیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ نوجوان ۲۸ مئی کو ایٹمی دھماکے کے وقت چاغی میں بھی موجود تھا اور جب سب کامیاب تجربے کے بعد دم بخود تھے' خوشگوار حیرت سے مبہوت تو اسی نے نعرۂ تکبیر بلند کیا تھا۔ ایک کمپیوٹر انجینئر نے فخر سے بتایا کہ جب وہ خود لانچنگ پیڈ پر موجود تھا تو اس کے والد آخری ٹریکنگ سٹیشن پر متعین تھے اور میزائل کے ہدف پر پہنچنے کی اطلاع انہوں نے دینی تھی۔ ان لوگوں میں وہ آرٹسٹ بھی تھا جس نے میزائل کو سنوارا تھا۔ اس پر شاہین کے الفاظ لکھے تھے اور بڑی محبت سے اس پر پاکستان کا پرچم پینٹ کیا تھا۔ فائر بریگیڈ کا عملہ اپنی گاڑیوں کے ساتھ مستعد تھا۔ کچھ حضرات سنارکل کو فضا میں بلند کئے اس پر چڑھے ہوئے تھے۔ سب کا اشتیاق دیدنی اور لب پر دعائیں کہ اللہ تجربہ کامیاب رہے۔ کنٹرول روم میں ڈاکٹر ثمر مند مبارک تھے اور ابزرویشن پوسٹ میں سائنس دان بھی تھے' ڈاکٹر اشفاق علی اور کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل مظفر حسین عثمانی اور دوسرے سینئر افسر بھی۔

ایک بڑے سے نقشے پر شاہین میزائل کے لانچنگ پیڈ کی نشاندہی سرخ پن سے کی گئی تھی اور اس کا ہدف سفید پن سے ظاہر کیا گیا تھا۔ راستے میں میزائل کو مانیٹر کرنے والے ٹریکنگ سٹیشن (Tracking Stations) سبز پنوں سے ظاہر کئے گئے تھے۔ ابزرویشن پوسٹ کے سامنے کی طرف شیشے کی بڑی کھڑکی تھی جس سے باہر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ لیکن اندر کافی رش تھا۔ ہم کمرے

سے باہر ریلنگ پر آ گئے۔ ابھی سانسیں درست بھی نہ ہوئی تھیں کہ کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو گیا۔ لاؤڈ سپیکر پر آواز آ رہی تھی ------ٹین' نائن' ایٹ' سیون------ہم نے ہاتھ میں تھامی ڈائری کو زمین پر پٹخا' عینک اتار کر جیب میں ٹھونسی' کاندھے پر لٹکتا کیمرہ اتارا اس کے کور کھولے اور جب تک گنتی زیرو تک پہنچی' ہم کیمرے کی سپیڈ' اپرچر اور فوکس ایڈجسٹ کر چکے تھے۔ کیمرہ آنکھ سے لگایا تو میزائل فائر ہو چکا تھا۔ پہلے میزائل کے نیچے آگ کے شعلے لپکے' ایک دھماکہ سنائی دیا' پھر سفید رنگ کی گیسوں نے میزائل کا احاطہ کر لیا۔ چاروں طرف ایک سکوت طاری تھا۔ اچانک میزائل فضا میں بلند ہوا اور گیسوں کی ایک دبیز دھار خارج کرتا ہوا' اوپر اٹھتا چلا گیا۔ ہم نے کھٹا کھٹ کئی تصاویر بنا ڈالیں۔ پوسٹ کے نیچے سے کوئی پکارا۔ ''نعرۂ تکبیر'' اور فضا ''اللہ اکبر'' کے نعروں سے گونج اٹھی۔

اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل

میزائل چند سو فٹ کی بلندی پر جا کر' دائیں جانب مڑا اور اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ جب تک شاہین نظر آتا رہا' نعرے بلند ہوتے رہے۔ ہم نے نیچے دیکھا تو کمپلیکس میں کام کرنے والے سب لوگ ابزرویشن پوسٹ کے نیچے سمٹ آئے تھے اور پرنم آنکھوں سے ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہوئے گلے مل رہے تھے۔ ہم ابزرویشن روم میں آئے۔ میزائل کے سفر کی لمحے لمحے کی روداد کمپیوٹر پر ابھر رہی تھی۔ بلکہ ایک ایک لمحے میں کمپیوٹر کی سکرین کئی بار رنگ بدلتی تھی اور مختلف تفصیلات پیش کرتی تھی۔ میزائل میں نصب الیکٹرانک آلات بالکل ٹھیک کام کر رہے تھے۔ میزائل کے متعین راستے پر جگہ جگہ واقع ٹریکنگ سٹیشن کمپیوٹر کے علاوہ ہاٹ لائن پر بھی کنٹرول روم اور ابزرویشن پوسٹ سے منسلک تھے۔ جہاں جہاں سے میزائل گزرتا اسٹیشن کا انچارج پر جوش آواز میں اس کی آمد کی اطلاع کے ساتھ مبارکباد بھی پیش کرتا۔ چھ منٹوں میں شاہین میزائل وادی بولان میں پرواز کرتے ہوئے تو کنڈی کے قریب اپنے ہدف پر جا پہنچا۔ آخری ٹریکنگ سٹیشن نے الحمدللہ کہتے ہوئے شاہین کے پہنچنے کی اطلاع دی۔ دھماکے کی آواز دور دور تک سنی گئی۔ آخری منزل پر شاہین کی کارروائی ریکارڈ کرنے کے لیے تین جانب سنسر سٹیشن قائم کیے گئے تھے۔ میزائل کی پرواز کے رخ میں ذرا سی بھی غلطی ہو جاتی تو ان میں کوئی بھی سٹیشن میزائل کی زد میں آ سکتا تھا لیکن پاکستان کے مایہ ناز سائنس دانوں کو اپنی تخلیق پر بھرپور اعتماد تھا اور یہ یقین بھی کہ

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

ادھر بھارتی پارلیمنٹ میں عدم اعتماد کی تحریک پر بحث جاری تھی۔ اپوزیشن کا ایک رکن وزیر اعظم پر برس رہا تھا کہ آپ کی غلط پالیسیوں نے پاکستان کو ایٹمی قوت بنا دیا ہے۔ آپ نے اگنی۔ ۲ کا تجربہ کر کے پاکستان کو غوری اور شاہین چلانے پر مجبور کیا۔ آپ کی پالیسیوں کا نتیجہ ہے کہ آج کشمیر میں بھارتی پرچم جلایا جا رہا ہے اور پاکستانی پرچم لہرایا جا رہا ہے۔

ہفتے کے روز تحریک عدم اعتماد پر رائے شماری ہوئی تو حکومت ایک ووٹ سے ہار گئی اور یوں بھارتیہ جنتا پارٹی اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

یہ تھا ان کی مہم جوئی کا انجام!

◆◆◆

سیلاب بلاخیز

بہاولپور سے کراچی پوسٹنگ ہوئی تو سچی بات ہے' دل بہت دکھا۔ بہاولپور شہر تو چھوٹا سا ہے لیکن یہاں رہنے والوں کے دل بڑے ہیں۔ طبیعتیں سادہ' ضرور تیں مختصر' دوستیوں کے رسیا' دشمنی سے مجتنب' مخالفتوں میں بھی شائستگی کے قائل۔

تقسیم ہند سے پہلے بہاولپور ایک ریاست تھی ۔۔۔۔۔۔ باقی پانچ ساڑھے پانچ سو ریاستوں کی طرح جن میں بیشتر کے حکمران ظالم' سنگدل' عیاش لوگ تھے۔ بہاولپور کے حکمران عادل' رعایا پرور' نرم خو اور سلجھے ہوئے لوگ تھے۔ یہاں خواندگی کا تناسب نوے فیصد سے بھی زیادہ تھا۔ کہتے ہیں ''الناس علی دین ملوکھم'' (لوگ اپنے بادشاہوں کا مذہب اختیار کرتے ہیں) تو یہاں کے لوگ ابھی تک اسی مذہب کو اختیار کئے ہوئے ہیں جو اخوت' محبت' پیار اور دوستی کا درس دیتا ہے۔ تو ایسے اچھے لوگوں کا پرسکون شہر چھوڑ کر ہنگاموں بھری دنیا کا رخ کرنا' نفسانفسی کے عالم میں جا اترنا' خوشگوار تجربہ کیونکر ہو سکتا تھا۔

کراچی میں سب سے پہلا وار ہماری چھٹیوں پر ہوا۔ ڈیوٹی کے لیے رپورٹ کرنے سے آٹھ دس دن پہلے ہم کراچی آ گئے تھے۔ مارشل لاء کے دور میں ہم یہاں تھے۔ خیال تھا کہ کھوئے ہوئے لوگ ڈھونڈ لیے جائیں' پرانے رشتے بحال ہوں۔ نئے ابھرنے والے قابل دید مقامات جیسے ہمدرد یونیورسٹی' آغا خان ہسپتال دیکھ لیے جائیں۔

پہلا قدم ہی غلط پڑا۔ ہم کور ہیڈ کوارٹر گئے تھے کہ دفتر دیکھ لیں اپنے رفقاء کار سے مل لیں۔ ماحول کا نیم باز نظروں سے جائزہ لے لیں۔ افسروں نے آڑے ہاتھوں لیا۔

''کیا عیاشی ہے بھئی' نئے شہر میں ملازمت کا آغاز چھٹیوں سے۔''

''آپ کہاں ہیں بھئی ۔۔۔۔۔۔ آج ہی کور کمانڈر پوچھ رہے تھے کہ نیا پبلک ریلیشن آفیسر کہاں رہ گیا۔''

''بھئی کل آپ وردی پہن کر کور کمانڈر سے مل لیں۔ اس کے بعد بھلے سے چھٹیاں کاٹتے رہیں۔'' (چھٹیاں نہ ہوئیں قید ہو گئی)

سینئر افسروں کا مشورہ حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ ہم نے دوسرے دن وردی پہنی اور کور کمانڈر کے حضور پیش ہو گئے۔ انہوں نے سندھ کی صورت حال پر تفصیل سے روشنی ڈالی' اپنی پالیسی بیان کی اور دھمکی نما نصیحتوں سے نوازا۔ لیفٹیننٹ جنرل لہراسپ خان مختصر اور دوٹوک بات کرنے کے عادی ہیں لیکن یہ نشست کوئی ڈیڑھ گھنٹہ طویل ہو گئی۔ ان کے دفتر سے نکلے تو کسی اور سے ملنے کا یارا نہ تھا۔

سیدھے میس پہنچے۔ وردی تبدیل کی اور شہر کی رونقوں میں گم ہو گئے۔ پرانے دوستوں کو ڈھونڈنے میں زیادہ وقت لگتا تھا۔ ملاقات مختصر رہتی تھی پھر کسی وقت' فرصت کے لمحات میں ملنے کی امید پر رات ہو گئی۔ زاہد کی نہاری کھائی' ناگوری کی لسی پی اور دوسرے دن برنس روڈ کی حلیم اور ربڑی کا پروگرام سوچتے میس میں واپس آئے تو آدھی رات سے زیادہ رات بیت چکی تھی۔ نہا دھو کر سونے کی تیاریوں میں تھے کہ بریگیڈیئر سعید شریف کا فون آیا۔ کور ہیڈ کوارٹر میں کور کمانڈر کے بعد سینئر ترین افسر چیف آف سٹاف ہوتا ہے مختصراً جسے COS کہتے ہیں۔ کور کمانڈر کے احکامات کی تنفیذ اور ہیڈ کوارٹر میں سٹاف ورک کی تمام تر ذمہ داری سی او ایس کے ذمے ہوتی ہے۔ بریگیڈیئر سعید شریف سی او ایس تھے' اپنے نام کی طرح سعید بھی شریف بھی۔

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو

رزم ہو کہ بزم ہو' پاک دل و پاکباز

ایسا نہیں تھا کہ انہیں غصہ نہیں آتا تھا لیکن ناک پر نہیں دھرا رہتا تھا۔ بڑے بڑے نازک لمحات میں وہ اپنی مسکراہٹ قائم رکھتے جس سے ان کے ماتحتوں کے حوصلے برقرار رہتے تو کراچی میں ہماری دوسری رات تھی۔ نصف شب سے زائد کا عمل' جب ان کا فون آیا۔

''کیا کر رہے ہو؟''

''سر! سونے لگا تھا۔''

''اب تک کیوں نہیں سوئے؟''

''ابھی تو لوٹا ہوں آوارہ گردی کے بعد۔''

''اچھا ۔۔۔۔۔۔ میرا خیال تھا کہ تم تہجد گزار آدمی ہو۔''

''سر' خوش فہمی ہے آپ کی ۔۔۔۔۔۔ کوشش کروں گا تہجد پڑھنے کی۔''

''اچھا' تہجد سے فارغ ہو کر فیصل بیس پہنچ جانا وردی میں' پانچ بجے ٹیک آف ہے۔'' کھٹ ۔۔۔۔۔۔ ٹیلیفون بند۔

یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے؟ کس کا ٹیک آف ہے اور کیوں؟ کس بادشاہ سلامت کی سواری' کہاں اور کیوں جا رہی ہے؟ ہمارا کیا رول ہے' ہماری تو ابھی چھٹیاں باقی ہیں۔ کوئی آئے' کوئی جائے' ہمیں کیا ۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ ساری طفل تسلیاں تھیں۔ فوج میں حکم مل جائے تو تعمیل کے بعد ہی پوچھا جا سکتا ہے۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں

منہ اندھیرے ائیر پورٹ پر پہنچے تو دو مشاق طیارے رن وے پر کھڑے تھے۔ پائلٹ جہازوں کی چیکنگ میں مصروف تھے۔ علیک سلیک کے ابتدائی مرحلے بھی طے نہ ہوئے تھے کہ کور کمانڈر آ پہنچے۔ جب تک وہ طیارے میں بیٹھے' پروٹوکول آفیسر کرنل نثار نے جلدی جلدی ہمیں بتایا۔ ''سکھر کے قریب دریائے سندھ کے ابتدائی حفاظتی پشتے ٹوٹ گئے ہیں۔ شہروں کے ڈوب جانے کا خطرہ ہے۔ فوج کو طلب کر لیا گیا ہے۔ آپ کور کمانڈر کے ساتھ جائیں گے ۔۔۔۔۔۔ بیٹھیں جہاز میں۔'' بریفنگ مکمل' احکام جاری۔ ایک نوجوان پائلٹ ہمارا منتظر تھا۔

دوسرے طیارے میں ہم بیٹھ گئے۔ ڈنمارک کے بنے ہوئے یہ مشاق طیارے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ پائلٹ کے علاوہ اس میں صرف ایک سواری اور بیٹھ سکتی ہے۔ اصل میں تو یہ تربیتی طیارہ ہے جس میں ساتھ ساتھ دو نشستیں ہوتی ہیں۔ ایک انسٹرکٹر کے لیے' دوسری شاگرد کے لیے۔ دونوں کے سامنے کنٹرول پینل ہوتے ہیں۔ بوقت ضرورت اسے سینئر کمانڈر اپنی ذمہ داری کے علاقے سے واقفیت حاصل کرنے' توپ خانے کا فائر درست کروانے یا اگلے مورچوں پر فوجی دستوں کی نقل و حرکت کنٹرول کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں ایسے پانچ طیارے پاک فضائیہ کو ملے تھے۔ بعد میں ناکارہ طیاروں کے ملبے سے حصے پرزے چھانٹ چھانٹ کر ۹۲ طیارے بنائے گئے جو پاک فضائیہ اور پاک فوج کی ایوی ایشن یونٹوں میں تقسیم کر دیئے گئے۔ بوقت ضرورت اسے مسلح بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے پروں کے ساتھ چھ سو پاؤنڈ وزن کے راکٹ' دو مشین گنیں یا چھ ٹینک شکن میزائل فٹ کئے جا سکتے ہیں۔ تو ہم مشاق طیارے میں بیٹھے تھے۔ سامنے شیشے کی سکرین' دائیں بائیں دروازے' شاید ایک سوزوکی کار کی وسعت بھی اس طیارے سے زیادہ ہو۔ کم بخت جب ہوا میں بلند ہوتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ اب گرے کہ گرے۔ بلندی سے ڈر (Acrophobia) کے کسی مریض کو ایسے طیارے میں بٹھا دیا جائے تو اسے شاید زمین پر واپسی نصیب نہ ہو' اوپر ہی اوپر ۔۔۔۔۔۔ تو ہم اس طیارے میں سفر کر رہے تھے۔ آگے آگے کور کمانڈر کا طیارہ تھا اور حد ادب قائم رکھتے ہوئے کوئی دو تین سو گز پیچھے اور پچاس فٹ نیچے ہم پرواز کر رہے تھے۔ کنٹرول پینل سامنے تھا۔ پرواز کی ابتدائی نوعیت کی تربیت گلائڈنگ کورس کے دوران ہم نے بھی حاصل کی تھی۔ پینل کے آلات سے شناسائی تھی۔ آلٹو میٹر' ائیر سپیڈ انڈی کیٹر' اے ڈی ایف یعنی آٹو میٹک ڈائریکشن فائنڈر وغیرہ وغیرہ۔

ادھورا علم بعض اوقات عذاب جاں بن جاتا ہے۔ ایک مرتبہ شمالی علاقوں میں کسی ہیلی کاپٹر میں سفر کر رہے تھے۔ سیاچن سے

سکردو آ رہے تھے۔ ہمیں اسی طرح کی نشست ملی تھی' پائلٹ کے ساتھ۔ پورا پینل نگاہوں کے سامنے تھا۔ ہم نے ان پر ''غور'' فرمانا شروع کر دیا۔ اور تھوڑی دیر بعد پریشان ہو گئے۔ آلٹو میٹر کے مطابق بلندی کبھی دو' تین سو فٹ ہوتی' کبھی چالیس پچاس فٹ رہ جاتی اور کبھی سوئی جھٹکا کھا کر زیرو پر آ گرتی پھر آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگتی۔ ہم جس علاقہ میں پرواز کر رہے تھے اس کی سطح سمندر سے بلندی سات سے نو ہزار فٹ تھی۔ ''یا اللہ! یہ آلٹو میٹر ٹھیک کام کر رہا ہے؟'' ہم نے غور سے پائلٹ کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی پریشانی نہیں تھی۔ ہم نے توجہ دلائی۔ ''آپ کا آلٹو میٹر خراب ہے؟''

پائلٹ نے ایک نظر پینل پر ڈالی' پھر ہمیں دیکھا اور ہمارے ہیڈ فون کا مائیک ایڈ جسٹ کرتے ہوئے اشارے سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

ہم نے سوال دہرایا۔ ''آپ کا آلٹو میٹر خراب ہے؟''

''کون سا آلٹو میٹر؟''

ہم نے اس آلٹو میٹر پر انگلی رکھ دی جسے دیکھ دیکھ کر ہمارے خون کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ پائلٹ نے ہنستے ہوئے ایک اور میٹر پر انگلی رکھتے ہوئے بتایا کہ آلٹو میٹر وہ نہیں' یہ ہے۔

''تو پھر یہ کیا ہے؟''

''Relative Hieght Indicator'' پائلٹ نے جواب دیا۔

ہم جسے آلٹو میٹر یعنی سطح سمندر سے بلندی بتانے والا آلہ سمجھتے رہے تھے وہ نسبتی بلندی ظاہر کر رہا تھا۔ یعنی ہیلی کاپٹر کے نیچے پہاڑوں کی چوٹیوں سے بلندی۔ وہ ایک خاص سطح تک تو بلندی ظاہر کرتا لیکن جب ہیلی کاپٹر کسی گہری کھائی کے اوپر آ جاتا جہاں کی نسبتی بلندی اس میٹر کی استطاعت سے باہر ہوتی تو سوئی صفر پر آ گرتی۔

اس کے بعد سے ہم نے پینل کے آلات سے غور فرمانا چھوڑ دیا۔ تو اب بھی مختلف میٹر سامنے تھے اور نہ چاہتے ہوئے بھی ہم انہیں پڑھ رہے تھے۔ بلندی' ساڑھے تین ہزار فٹ۔ گراؤنڈ سپیڈ ایک سو چالیس میل فی گھنٹہ۔ لیکن پھر ہم نے آنکھیں موند لیں اور دریائے سندھ کے تصور میں کھو گئے جس نے لوگوں کو ''وخت'' میں ڈال رکھا تھا۔

دریاؤں کی کہانی بھی عجیب کہانی ہے۔ انسان دریاؤں سے پیار کرتے ہیں کہ ان کی زندگی پانی کی مرہون منت ہے۔ صاف پانی کے بہتے ہوئے دھارے زندگی کو نکھار عطا کرتے ہیں۔ زیادہ تر انسانی تہذیبوں نے دریاؤں کے کنارے ہی جنم لیا لیکن یہ کبھی

اچھے رفیق ثابت نہیں ہوئے۔ بپھرتے ہیں تو لہلہاتی فصلیں برباد اور بستیوں کی بستیاں ویران کر دیتے ہیں۔ انسان کشتیوں کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

لیکن انسان کے شوق کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ وہ محض کشتی پر بھروسہ نہیں کرتا' کچے گھڑے پر بھی پار اترنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ پی سے ملن کی سندر آشائیں اسے نڈر اور بے خوف بنا دیتی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دریاؤں کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں' اس کی روانی ماند پڑ جاتی ہے تب انسان اور کھیتیاں جاں بلب ہو جاتی ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دور ہے۔۔۔۔۔۔عمرو بن العاص مصر کے گورنر ہیں۔ ان کا خط وصول ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ دریائے نیل خشک ہو گیا ہے۔ یہاں کے باشندوں کی پہلے سے یہ روایت رہی ہے کہ ایسے موقعوں پر ایک نوجوان دوشیزہ کو دلہن بنا کر دریا کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں' تب دریا بہنے لگتا ہے۔ میرے لیے کیا حکم ہے؟"

عمر فاروق رضی اللہ عنہ جواب لکھتے ہیں۔ "انسانی زندگی زیادہ محترم ہے۔ اسے دریا کی بھینٹ نہیں چڑھایا جا سکتا۔ یہ رسم دوبارہ جاری نہیں ہو گی۔ میں دریا کے نام ایک خط لکھ رہا ہوں۔ اسے دریا کے حوالے کر دینا۔"

دریا کے نام خط لکھا۔۔۔۔۔۔جی ہاں' دریا کے نام۔۔۔۔۔۔"اگر تو شیطان کے حکم سے بہتا ہے تو ہمیں تیری روانیوں کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اور اگر تو اللہ کے نام پر بہتا ہے تو میں اللہ کے خلیفہ کی حیثیت سے تجھے حکم دیتا ہوں کہ اب بھی بہہ۔"

شہر کا شہر دریا کنارے اکٹھا ہو گیا۔ حضرت عمرو بن العاص نے ایک ہجوم کے سامنے خط پڑھا اور دریا میں ڈال دیا۔ دریا کے وسط میں بہتی ہوئی پتلی سی دھار بڑھنے لگی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب سے آج تک دریائے نیل کی روانی میں کمی نہیں آئی۔

دریائے سندھ۔۔۔۔۔۔کوہ ہمالیہ کی بلندیوں کو جنم لیتا ہے۔ لیہہ کے قریب سے پاکستان میں داخل ہوتا ہے اور شمال مغرب کی طرف بہتے ہوئے سکردو سے گزرتا گلگت سے موڑ کاٹ کر جنوب کی طرف بہنے لگتا ہے۔ شمالی علاقوں میں تو کہیں کہیں یہ اتنی گہرائیوں میں بہتا ہے کہ کناروں پر اس کی آواز تک نہیں آتی۔ کسی حادثے کے نتیجے میں گاڑیاں یا انسان اس میں جا گریں تو ان کا سراغ بھی نہیں ملتا۔ لیکن جب یہ سندھ میں داخل ہوتا ہے تو "پورے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے" کے مصداق پاکستان کے دوسرے دریاؤں کا پانی بھی اس میں شامل ہو چکا ہوتا ہے اور ان کی ساری مٹی بھی اس کی لہروں میں گھلی ہوتی ہے۔ روانی میں اتنا دم خم

نہیں ہوتا کہ مٹی کو اٹھائے پھرے چنانچہ اسے بچھاتا چلا جاتا ہے۔ نتیجتاً اس کی تلہٹی (Bed) کی سطح بلند ہوتی جاتی ہے۔ جنوبی سندھ تک پہنچتے پہنچتے یہ اتنا اتھلا' اتنا کم ظرف ہو جاتا ہے کہ اس سے ذرا سی بارشوں کا پانی تک نہیں سنبھالا جاتا۔ مون سون کے موسموں میں تو بالکل آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور ارد گرد کے علاقوں میں تباہی پھیلا دیتا ہے۔

چین کا دریائے ینگ سی کیانگ دریائے سندھ کا بھائی ہے۔ اسی کی طرح طویل' اسی کی طرح تند خو۔ ماؤزے تنگ اس کی طغیانیوں سے تنگ آئے تو ایک مرتبہ خشک موسموں میں اس کے کنارے بسنے والوں کو اکٹھا کر لیا۔ کدالوں کی مدد سے اس کی تہہ کی ایک ایک فٹ مٹی کھود کر کناروں میں جمع کر دی۔ پشتے کئی کئی فٹ بلند ہو گئے۔ کتنے برس گزر گئے۔ چین سے کبھی خبر نہیں آئی کہ ینگ سی کیانگ بپھر گیا ہو۔ بے چارہ چپ چاپ کناروں کے اندر اندر بہتا رہتا ہے۔

جب چینیوں نے دریائے ینگ سی کیانگ کے سینے سے مٹی کا بوجھ اٹھا کر اس کے بازو مضبوط کئے تھے تو ان کے وسائل کدالوں ہی تک محدود تھے۔ بات وسائل کی نہیں ایمان کی ہے یا عزم و ہمت کی۔ دریائے نیل نے ایمان کے ساتھ سر تسلیم خم کر دیا تھا اور ینگ سی کیانگ انسانی ارادوں کا مطیع ہو گیا تھا۔ ہمیں سوچنا ہے کہ ہم میں کیا کمی ہے۔ سندھ ہمارے قابو کیوں نہیں آتا؟ محنتی بھی ہم بہت ہیں' وسائل کی بھی کمی نہیں کہ ہر سال کروڑوں روپے حفاظتی پشتوں کو مضبوط بنانے کے لیے منظور ہوتے ہیں لیکن موسم گرما میں جب ہمالیہ پر برف پگھلتی ہے دریا کا پانی بڑھتا ہے اور لہریں بے تاب ہونے لگتی ہیں تو حفاظتی پشتے سد راہ بننے کی بجائے پلکیں فرش راہ کر دیتے ہیں اور دریا کا پانی بپھرتا ہوا چاروں طرف بکھر جاتا ہے۔ کھیتیاں برباد اور انسانی بستیاں ویران ہو جاتی ہیں۔ وقتی طور پر ہاہا کار مچتی ہے' نت نئے منصوبے بنتے ہیں لیکن پانی اترتا ہے تو ارادے معدوم اور منصوبے زمین بوس ہو جاتے ہیں۔

انہی خیالوں میں گم دو گھنٹے کی پرواز کے بعد ہم سکھر ائیرپورٹ پر اتر گئے۔ پنوں عاقل چھاؤنی کے جنرل آفیسر کمانڈنگ میجر جنرل (اب لیفٹیننٹ جنرل) امجد شعیب ائیرپورٹ پر موجود تھے۔ وہاں سے جیپوں میں سیلاب زدہ علاقے کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک سرکٹ ہاؤس میں سول انتظامیہ کی طرف سے بریفنگ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس بات کو ہم یہیں چھوڑتے ہیں کہ اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اس کے بعد سے ہمارے شب و روز اس طرح گزرتے تھے کہ کبھی مشاق طیارے کے ذریعے کراچی لوٹ آتے تھے اور صبح سویرے پھر سکھر۔۔۔۔۔۔اور کبھی کبھار رات وہیں دریا کنارے سخت حبس کے عالم میں گزارنی پڑتی۔ وہاں سے حاصل کردہ معلومات اور مشاہدات کا خلاصہ:

ضلع جیکب آباد میں دریائے سندھ کی سطح ارد گرد کی زمینوں سے قدرے بلند ہے۔ اس کے دائیں کنارے پر حفاظتی پشتوں کے

تین حصار بنائے گئے ہیں۔توری بند اور نیو توری بند' منگلی بند اور کھوانی بند۔ان تینوں بندوں کے پیچھے ایک اور پشتہ موجود ہے جو دراصل ایک نہر کی کھدائی کے نتیجے میں وجود میں آیا۔یہ نہر ۱۹۶۰ء میں نکالی گئی تھی اور اس میں سے نکلنے والی مٹی دریا کی جانب ڈال دی گئی۔علاقے کے نام پر اسے غوث پور بند کہا جانے لگا۔ہر سال حفاظتی پشتوں کو مضبوط بنانے کے لیے کروڑوں روپے منظور کیے جاتے ہیں لیکن غوث پور بند کے بارے میں کبھی کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ پانی وہاں تک آ پہنچے گا۔

ضرورت اس بات کی تھی کہ دریا کا پانی بڑھنے سے پہلے پہلے بندوں کو مضبوط کر لیا جاتا' جہاں جہاں سے کنارے ٹوٹ گئے تھے وہاں مٹی کی بھرائی کر کے ان پر بھاری پتھروں کی تہیں بچھائی جاتیں۔ایمرجنسی صورت حال سے نبٹنے کے لیے پشتوں کے قریب پتھروں اور مٹی سے بھری ہوئی بوریوں کا ذخیرہ کیا جاتا مگر یہ ہو نہ سکا اور پھر یہ عالم تھا کہ مٹی کے مہینے ہی میں دریا کی لہریں توری بند کو چاٹ رہی تھیں۔ملک کے حساس اداروں نے خبردار کیا کہ حفاظتی پشتوں کی خبر لی جائے۔مئی اور جون کے مہینے گزر ے۔۶ جولائی کو صبح دو بجے ٹکو کا کند کوٹ میں توری کے قریب حفاظتی پشتے میں بیس فٹ کا شگاف پڑ گیا جو دم بدم وسیع ہوتا گیا۔(اس بند کو مضبوط بنانے کے لیے ۶ کروڑ روپے منظور کیے گئے تھے) محکمہ آبپاشی نے توری بند میں نیچے کی جانب خود ایک شگاف ڈالنے کا منصوبہ بنایا تا کہ پانی کا زور ٹوٹ سکے۔یہ منصوبہ ابھی زیر غور ہی تھا کہ دوسرے دن دریا کا پانی دوسرے حصار کھوانی بند سے ٹکرانے لگا۔۷ جولائی کو دوپہر ایک بجے تک اس بند میں بھی بیس فٹ شگاف پڑ چکا تھا جس کی وجہ سے گدو کینال کے اردگرد کا علاقہ زیر آب آ گیا۔یہ پہلا موقعہ تھا کہ خطرے کا سگنل بس محسوس کرتے ہوئے فوج کو مدد کے لیے پکارا گیا اور توپ خانے کی ایک رجمنٹ کے جوان علاقے میں پہنچ گئے۔اس کے دو دن بعد وزیر اعلیٰ سندھ نے موقع کا معائنہ کیا اور فوری اقدامات کی ہدایات جاری کیں۔وزیر آبپاشی دوسرے وزیر اور محکمہ آبپاشی کے بہت سے افسروں نے علاقے کا معائنہ کیا لیکن پانی کی تند و تیز لہریں بپھرتی چلی گئیں اور غوث پور بند تک آ پہنچیں جو دریائے سندھ کے سامنے آخری حصار تھا۔اگر یہ بند بھی بہہ جاتا تو ضلع لاڑکانہ' جیکب آباد اور شکار پور اس کی براہ راست زد میں تھے۔

۱۸ جولائی کو حکومت سندھ نے کور ہیڈ کوارٹرز سے باقاعدہ درخواست کی کہ حفاظتی پشتوں کو مستحکم کرنے اور زیر آب علاقے میں لوگوں کی امداد کا کام فوج سنبھال لے۔پاک فوج کے مختلف دستے فوراً ہی غوث پور پہنچ گئے۔اس وقت اس کی چوڑائی کہیں کہیں تو اتنی کم تھی کہ اس پر سے ایک جیپ بھی نہیں گزر سکتی تھی۔اس پر مستزاد یہ کہ اردگرد کے لوگوں نے اس پر غار نما گھر بنا رکھے تھے۔بہت سے لوگوں نے بند کو کھوکھلا کر کے اس میں مویشیوں کے لیے باڑے بنائے ہوئے تھے۔بیشتر جگہوں پر باقاعدہ کمرے تراش کر اس

میں بھوسہ اور مویشیوں کا چارہ ذخیرہ فرمایا گیا تھا۔پانی کی لہریں اگر بند کی دبلی پتلی دیواروں کو چاٹ ڈالتیں تو بھوسے اور چارے کو بہا لے جانے میں چند لمحے ہی صرف ہوتے۔فوج کے انجینئروں نے ایک باقاعدہ حکمت عملی تیار کی۔پہلے تو دریا کی طرف مٹی کی بوریاں ڈالنی شروع کیں۔ان کے آگے درختوں کی موٹی موٹی ٹہنیاں گاڑی گئیں اور دوسری طرف ان کھوکھلے غار نما گھروں کی بھرائی کا کام شروع کیا گیا جسے لوگ اپنے یا مویشیوں کے لیے استعمال کر رہے تھے۔یہ کوئی آسان کام نہ تھا اس کے لیے جتنی افرادی قوت بھی تھی' کم تھی۔معلوم ہوا کہ محکمہ آبپاشی نے گزشتہ سال چالیس روپے یومیہ اجرت پر بہت سے مزدور بھرتی کیے تھے۔اردگرد کے لوگوں سے کام کرنے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور بتایا کہ انہیں گزشتہ سال کی اجرت کے پیسے ابھی تک ادا نہیں کیے گئے۔

کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل لہراسپ خان نے ہدایات جاری کیں کہ مزدوروں کو ۱۰۰ روپیہ یومیہ اجرت پر بھرتی کیا جائے اور یہ اجرت شام کو ان کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے پہلے ادا کر دی جائے۔پہلے دن ڈرے ڈرے' سہمے سہمے چالیس پچاس مزدور کام پر آئے۔ان کی اجرت شام کو ادا کر دی گئی دوسرے دن ان کی تعداد دگنی' پھر تگنی اور روزانہ بڑھتی چلی گئی۔تین چار روز میں تین ہزار سویلین فوجی جوانوں کے شانہ بشانہ کام کر رہے تھے۔کور کمانڈر روزانہ علاقے میں پہنچتے' رات گئے تک مختلف جگہوں کا معائنہ کرتے اور ہدایات جاری کرتے۔ان کی موجودگی میں بند پر کام کرنے والے فوجی جوانوں اور سویلین کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث بنی۔جنرل آفیسر کمانڈنگ پنوں عاقل میجر جنرل شعیب نے بھی اپنا کیمپ بند کے قریب ہی قائم کر رکھا تھا۔

ہمہ یاراں دوزخ' ہمہ یاراں بہشت

فوج جہاں بھی جاتی ہے ان کے ڈاکٹر ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔عام دنوں میں فوجی جوان نزلے زکام میں مبتلا ہوں تو میڈیکل انسپکشن روم آتے جاتے رہتے ہیں لیکن ایمرجنسی میں انہیں اتنی فرصت کہاں کہ چھوٹی موٹی بیماریوں میں مبتلا ہو سکیں لیکن ڈاکٹروں کو فراغت پھر بھی نہیں ملتی کہ ان کے دروازے اردگرد کے شہریوں کے لیے کھلے ہوتے ہیں اور وہ دور دراز سے سفر کر کے ان تک پہنچتے ہیں۔کور کمانڈر کی خاص ہدایات تھیں کہ شہریوں کے لیے ادویہ میں کمی نہ آئے۔راقم الحروف کو دیہی علاقے کی ایک ڈسپنسری میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں ایک سویلین ڈاکٹر پہلے سے موجود تھا۔فوجی ڈاکٹر نے بھی وہیں ایک کرسی ڈال رکھی تھی۔دیہاتی عورتوں اور بچوں کی ایک طویل قطار تھی جن کے چہرے بے چارگی و درماندگی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔وہ کمرے میں داخل ہوتے تو ان کی کوشش یہی ہوتی کہ وہ فوجی ڈاکٹر کے پاس جائیں۔سویلین ڈاکٹر فارغ ہوتا تو مریض دوسروں کو ٹھوکا دیتے کہ تم جاؤ اس طرف۔سویلین ڈاکٹر ملنسار شخص تھا۔اس نے مسکراتے ہوئے ایک دو کو اپنے پاس بلایا بھی لیکن انہوں نے صاف کہہ دیا۔"سائیں! ہم نے

وردی والے ڈاکٹر کو دکھاتا ہے۔" وردی پر بڑھتا ہوا یہ اعتماد سندھ میں ایک نئے رجحان کی علامت ہے۔

فوج کے انجینئرز مصروف ترین لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ میدان جنگ میں وہ سب سے پہلے پہنچتے ہیں اور سب سے آخر میں واپس آتے ہیں۔ ان سیلابوں میں بھی فوری طور پر ان کی ضرورت پیش آئی۔ کمانڈر کور انجینئرز بریگیڈیئر خالد سہیل چیمہ کا کور ہیڈ کوارٹرز میں پہلا پہلا دن تھا کہ کور کمانڈر انہیں اپنے ساتھ جہاز میں بٹھا کر غوث پور لے گئے اور تپتی دوپہروں کی حبس آلود فضاؤں میں لیجا کر چھوڑ دیا۔

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

بریگیڈیئر چیمہ کا خیال تھا کہ وہ شام تک واپس آ جائیں گے لیکن وہ غوث پور گئے تو کئی دن تک واپس نہ آ سکے۔ وہ صرف وردی میں گئے تھے۔ رات ہوئی تو انہوں نے سونے کے لیے کسی سے شلوار قمیض ادھار مانگی جوان کے لمبے تڑنگے جسم پر یوں لگتی تھی جیسے انہوں نے پی ٹی کٹ پہن لی ہو۔

غوث پور بند مین جی ٹی روڈ سے قدرے ہٹ کر واقع ہے۔ بند پر مٹی کی بھرائی کا کام شروع ہوا تو لامحالہ بھاری گاڑیوں، بلڈوزروں اور کرینوں کی ضرورت پیش آئی لیکن جی ٹی روڈ سے غوث پور بند تک کا راستہ کچا تھا اور بھاری گاڑیوں کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ انجینئروں نے ان راستوں کو اس قابل بنایا کہ ان پر سے گاڑیاں گزر سکیں۔ پھر غوث پور بند تک پہنچنے کے لیے نہر کے ایک پل سے گزرنا پڑتا تھا۔ دس میل طویل بند تک پہنچنے کے لیے یہی ایک پل تھا اور تمام گاڑیوں کو اس پر سے ہو کر جانا ہوتا تھا جس کی وجہ سے بھرائی کے لیے مہیا کی جانے والی مٹی، پتھر، بوریاں اور دیگر سامان کافی دیر میں پہنچتا تھا۔ ایک ٹرک اپنا سامان اتار کر جاتا تو متعلقہ یونٹ کے جوان ذرا سی دیر میں اس میٹریل کو استعمال کر ڈالتے اور پھر ٹرک کے انتظار میں سوکھنے لگتے جیسے

بیٹھے ہیں ہم تصور جاناں کیے ہوئے

انجینئروں نے گاڑیوں کی آمد و رفت تیز کرنے کے لیے نہر پر کشتیوں کے دو پل بنائے جن کی مدد سے بند پر کام کرنے والوں کو مطلوبہ سامان کی فراہمی زیادہ تیزی سے ہونے لگی۔ اب فرصت کے لمحات مختصر ہو گئے۔ کام میں تیزی آ گئی۔ فوجی جوانوں نے سائے کے لیے بند کے کنارے کھپریل، چھپر بنائے تھے۔ ایک دن کور کمانڈر بند سے گزر رہے تھے۔۔۔۔۔۔ دیکھا، فوجی جوان کام میں مصروف ہیں اور سویلین حضرات سایوں تلے آرام فرما رہے ہیں۔ کوئی بیٹھا ہے، کوئی لیٹا ہے، کوئی نیم دراز۔ کمانڈر نے حکم دیا

کہ تمام کھپریل گرا دیے جائیں۔ سائے کی جو تھوڑی بہت جگہیں تھیں زمین بوس کر دی گئیں۔ ایک سویلین اہلکار نے ایک کرنل سے شکایت کی۔

"سائیں! میرے بندے آرام کہاں کریں گے؟"

"سائیں! یہ پچاس سال سے آرام ہی کرتے رہے ہیں، انہیں دو چار دن کام بھی کر لینے دو۔" کرنل نے جل کر جواب دیا۔

جب فوجی جوان بند پر جان توڑ مشقتوں میں مصروف تھے بند کے پیچھے دور دور تک سویلین آبادی امید اور خوف کے درمیان معلق تھی۔ باہمی رابطوں اور خبروں کے تبادلے کے لیے بند پر فوجی یونٹوں کو ٹیلی فون مہیا کیے گئے تھے۔ جانے کیسے لوگوں کو ان نمبروں کی خبر ہو گئی۔ سارا دن ٹیلی فون کالز کا تانتا بندھا رہتا۔ راقم الحروف ایک دن غوث پور پر بیٹھا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ٹھل سے کسی بنک کے منیجر کا فون تھا۔ "سائیں! سیلاب کا کیا حال ہے؟"

"اچھا حال ہے۔"

"اچھا؟ اس کا مطلب ہے سیلاب بڑھ رہا ہے۔" منیجر کی آواز سے گھبراہٹ نمایاں تھی۔

"اتنی دور بیٹھے آپ کو کیا پریشانی ہے؟"

"سائیں! آپ بتائیں میرے لیے کیا حکم ہے۔۔۔۔۔۔ میں کیش نکال کر لے جاؤں؟"

"اپنے گھر۔۔۔۔۔۔؟"

"نہیں سائیں، کسی محفوظ جگہ پر۔"

"آپ جہاں بیٹھے ہیں وہ محفوظ جگہ ہے، فکر نہ کریں، انشاء اللہ پانی وہاں تک نہیں آئے گا۔ فوج پوری کوشش کر رہی ہے۔"

"اللہ فوج کو سلامت رکھے سائیں۔"

مصیبت کے وقت میں افواہیں بھی تیزی سے پھیلتی ہیں۔ ایک بڑے جاگیردار کا فون آیا۔

"سنا ہے غوث پور بند ٹوٹ گیا ہے۔"

"کس نے توڑا ہے سائیں؟" ہم نے دریافت کیا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب تو آپ بتائیں، ہمیں تو پتہ نہیں کہ بند ٹوٹ گیا ہے۔ میں بند کے اوپر بیٹھا ہوں۔"

''یعنی کہ آپ غوث پور بند سے بول رہے ہیں؟''

''جی!۔۔۔۔۔۔جی!''

''غوث پور بند کے اوپر سے؟''

''اگر میں بند کے نیچے ہوتا تو آپ سے بات کیسے کر رہا ہوتا؟''

''اللہ نہ کرے سائیں' اللہ نہ کرے۔۔۔۔۔۔آپ ہی پر تو ہمارا بھروسہ ہے۔''

عوام کی دعائیں اور فوج کی محنت رنگ لائی اور چند دنوں کے اندر اندر ہی غوث پور بند کو اتنا مستحکم کر دیا گیا کہ وہ تند و تیز لہروں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ صرف اٹھارہ دنوں کے اندر اندر اس پر بارہ لاکھ مٹی کی بوریاں لگائی گئیں۔ ان بوریوں اور خالی جگہوں میں بھرائی کے لیے ایک کروڑ تیس لاکھ مکعب فٹ مٹی استعمال کی گئی۔ پورے بند کو تقریباً تین فٹ بلند کیا گیا۔ جہاں دریا کے کٹاؤ (Erosion) کا عمل زیادہ تھا وہاں بند کو نوے نوے فٹ چوڑا کر دیا گیا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اب بند اس پوزیشن میں ہے کہ نو لاکھ کیوسک پانی کا دباؤ برداشت کر سکے۔ بند کی تسلی بخش حد تک تکمیل پر یہ ۸ اگست کو سول انتظامیہ کے حوالے کر دیا گیا۔ اسی دن کراچی اور سکھر کے صحافیوں کی ایک ٹیم نے غوث پور بند کا دورہ کیا۔ اس موقع پر صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے صوبائی وزیر آبپاشی سید پرویز علی شاہ نے کہا کہ فوج نے جو کام چند روز میں کر دکھایا ہے وہ شاید برسوں کی محنت کے بعد بھی ممکن نہ تھا۔ ہم فوج کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے پوری مستعدی اور لگن کے ساتھ یہ کام کیا اور تقریباً آدھے سندھ کو اس تباہی سے بچا لیا جو غوث پور بند ٹوٹنے کی شکل میں نازل ہو سکتی تھی۔

◆◆◆

سبحان اللہ

کراچی میں رہنے والا غریب ترین آدمی بھی اس زندگی کا تصور نہیں کر سکتا جو اس سے چند گھنٹوں کی مسافت پر واقع صحرائے تھر میں رہنے والے ایک عام باشندے کو گزارنی پڑتی ہے۔ مشقتوں کا کوئی صلہ نہیں' محرومیوں کا کوئی ازالہ نہیں۔

شہر میں روشنی ہے' حرارت ہے' پانی بجلی' سڑکیں' عمارتیں' سکول' مدرسے' کالج' ڈاک خانے' دوا خانے' مے خانے' انشورنس کمپنیاں' اخبارات' عدالتیں' کھوکھے' دکانیں' سٹور' پلازے' ہوٹل' ریستوران' سرائے' باغ' پارک' سینما' تھیٹر' سرکاری دفاتر' نجی ادارے۔۔۔۔۔۔آپ کہیں گے' آخر یہ سب کچھ گنوانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سب تو سامنے کی چیزیں ہیں' دیکھنے والی ہر آنکھ ان چیزوں کو صاف دیکھ سکتی ہے۔ اے کاش ایسا ہوتا' اے کاش اقبال کے یہ اشعار سمجھ میں آتے۔

مجھ کو بھی نظر آتی ہے یہ بوقلمونی
وہ چاند یہ تارا ہے وہ پتھر یہ نگیں ہے
دیتی ہے مری چشم بصیرت بھی یہ فتویٰ
وہ کوہ یہ دریا ہے وہ گردوں یہ زمیں ہے
حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا
تو ہے تجھے جو کچھ نظر آتا ہے نہیں ہے

اقبال جس مقام پر کھڑے ہو کر یہ بات کرتے ہیں' اس تک رسائی ہم عامیوں کے بس میں کہاں!

آئیں۔۔۔۔۔۔تھر کی بات کرتے ہیں۔ شہر کراچی سے چند گھنٹوں کی مسافت پر واقع صحرائے تھر۔ یہاں غریب ترین آدمی کو بھی جو سہولتیں میسر ہیں' تھری باشندوں کے لیے وہ تعیشات کے زمرے میں آتی ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی سہولتیں جن کی طرف شہری آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے' تھر والے ان کے حصول کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور یہ بات صحرا میں جائے بغیر سمجھ میں نہیں آتی۔ شہر میں کسی چیز کا کال پڑتا ہے' کوئی سہولت چھنتی ہے یا کوئی چیز ناپید ہوتی ہے تو بالعموم جان کے لالے نہیں پڑتے۔ اخبارات کو سنسنی خیز سرخیاں اور شاعروں کو نئے موضوع ہاتھ آ جاتے ہیں۔

اب تو اتنی بھی میسر نہیں مے خانے میں
جتنی ہم چھوڑ دیا کرتے تھے پیمانے میں

صحرا میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں سورج کی حرارت' چاند کی چاندنی' گرما کی حدت' سرما کی ٹھنڈک تو وافر ملتی ہے' لیکن ریت کے سمندر سے وہ کچھ نہیں اگتا کہ بنی اسرائیل نے آسمانی کھانوں کی جگہ جن کی فرمائش کی تھی اور موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہم ایک طرح کے کھانوں پر صبر نہیں کر سکتے۔ اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے لیے زمین کی پیداوار ساگ' ترکاری' کھیرا' ککڑی' گیہوں' لہسن' پیاز' دال وغیرہ پیدا کرے۔ (البقرہ آیت ۶۱)

صحرائے تھر میں آسمان سے خوان اترتے ہیں نہ کوئی موسیٰ ہے کہ جس کی دعا کے جواب میں کوئی زرخیز بستی عطا ہو جہاں سے انسان کی ضروریات پوری ہو سکیں۔

آئیں تھر چلیں۔۔۔۔۔۔

حیدر آباد سے مشرق کی طرف سفر کرتے ہوئے پہلے میر پور خاص پڑتا ہے' پھر عمر کوٹ۔ یہاں سے سترہ کلومیٹر کی مسافت پر ''چھور'' واقع ہے۔ صحرائے تھر کے عین کنارے' چند برس پہلے تک صحرا کی ساری وحشتیں چھور میں دکھائی دیتی تھیں۔ چاروں طرف دھول اڑتی تھی اور موسم گرما میں سورج آگ برساتا تھا۔ پاک فوج کا یہاں صرف ایک سکول تھا۔

سکول برائے تربیت صحرائی جنگ (School for Desert Warfare)

لیکن جب سے یہاں باقاعدہ چھاؤنی قائم ہوئی' صحرائی منظر گل و گلزار میں بدلتا چلا گیا۔ اب یہاں صاف ستھری سڑکیں ہیں' خوبصورت روشیں' پارک' جھیلیں' بوٹے' پھل' پھول' گھنی بیلوں کے سائے' چھاؤنی کے قیام اور اس کی تعمیر و ترقی میں ویسے تو ہر آنے والے نے کچھ نہ کچھ کیا ہے لیکن چھور کی قسمت بدلنے میں ہمارے ہم نام ایک بریگیڈیئر کا بڑا ہاتھ ہے۔۔۔۔۔۔ بریگیڈیئر اشفاق کیانی۔ سرزمین پوٹھوہار کے اس سپاہی کا پورا گھرانہ فوج میں ہے۔ اب تو ماشاءاللہ میجر جنرل ہو گئے۔ جب چھور میں بریگیڈیئر تھے تو چھوٹا بھائی کرنل' اس سے چھوٹا میجر اور اس سے چھوٹا کیپٹن' ایک بہن ڈاکٹر۔ ہر رینک میں ان کے گھرانے کی نمائندگی تھی اور یہ ماں کی دعاؤں کا ثمر ہے جن کی خدمت میں وہ کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ چھور میں انہیں دیکھا' ہر وقت کسی نہ کسی دھن میں مبتلا۔ چھاؤنی میں برف نہیں ملتی تھی' آئس فیکٹری لگوا دی۔ شاپنگ کی دقت تھی' فوجیوں اور ان کے اہل خانہ کو عمر کوٹ جانا پڑتا تھا' ویلفیئر شاپ کھلوا دی۔ چھاؤنی کے داخلے پر خوبصورت گیٹ تعمیر کروایا۔ ایک سپورٹس کمپلیکس تعمیر کروایا جس میں ایک جمنازیم ہے' فٹ بال اور ہینڈ بال کے

دو دو میدان' ہاکی گراؤنڈ اور گولف کورس۔ وہ کسی سرکاری کام سے کور ہیڈ کوارٹرز کراچی آتے تو ذہن چھور میں الجھا رہتا۔ ایک مرتبہ طارق روڈ کے اللہ چوک سے گزرے۔ اللہ کا ڈیزائن پسند آیا۔ گاڑی رکوائی۔ کھٹا کھٹ تصویریں بنائیں اور چھور جا کر اپنے انجینئرز کا ناک میں دم کر دیا کہ ایسا ہی چوک یہاں بناؤ۔۔۔۔۔۔ بنایا۔ اب صرف چوک بنانے سے تو بات نہیں بنتی نا' باقی سڑکوں اور گلیوں میں بھی ترتیب' نفاست' خوش ذوقی کا مظاہرہ چاہیے تھا۔۔۔۔۔۔ ہوا۔ اب وہاں جناح ایونیو ہے' اقبال اسٹریٹ ہے اور رات کو جہاں ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہیں دیتا تھا' جگمگاتی ہوئی سڑکیں ہیں۔ خوبصورت' کشادہ' باوقار مسجد ہے۔ اور تو اور انہوں نے مچھلیوں کے لیے تالاب بنوایا کہ تازہ مچھلی سستے داموں میسر آ سکے۔ تالاب کے لیے پانی کی ضرورت تھی اور جو پارک بنائے گئے تھے' پودے لگائے گئے تھے' ان کے لیے پانی پورا نہ پڑتا تھا' دور دور سے لانا پڑتا تھا۔ انہوں نے محکمہ آبپاشی سے بات کی اور چوبیس کلومیٹر دور ڈھارو نارو کی نہر سے چھور چھاؤنی کے لیے پانی منظور کروایا۔ ایک چھوٹی سی نہر کھدوائی۔ اب چھاؤنی کے چاروں طرف پانی بہتا ہے۔ پھول مسکراتے ہیں' درخت گنگناتے ہیں اور ان درختوں پر پرندے چہچہاتے ہیں۔ ویل ڈن اشفاق صاحب!

تو دن بھر کے سفر کے بعد ہم چھور پہنچے تو گھنے درختوں میں گھرے ایک میس میں جگہ ملی۔ رات کو کھانا کھاتے ہوئے ذہن کے کسی گوشے میں کوندا سا لپکا۔ جانے کب' کہاں پڑھا تھا کہ مغلیہ سلطنت کا عظیم فرمانروا اکبر بادشاہ عمر کوٹ میں پیدا ہوا تھا۔ ایک مودب ویٹر پاس ہی کھڑا تھا۔ ایک بے ربط سا سوال ہونٹوں سے پھسلا۔

''یہاں۔۔۔۔۔۔ عمر کوٹ میں کیا کچھ ہے؟''

''سر! سبھی کچھ ہے۔ گنڈے (پیاز)' مرچ' ٹماٹر' گوشت' سب کچھ ہے سر' لیکن اب تو ساری چیزیں یہاں سے مل جاتی ہیں اپنی ویلفیئر شاپ سے۔''

میس ویٹر کا علم اپنے فیلڈ پر محیط تھا۔ ہنسی تو بہت آئی کہ تحقیقات کی بسم اللہ ہی غلط ہو گئی تھی لیکن تحقیقی کام میں صبر بڑا ضروری ہے۔

چند لمحوں بعد پوچھا۔

''سنا ہے یہاں عمر کوٹ میں ہندو بہت زیادہ ہیں۔''

''جی سر''

''تم میس کی چیزیں کہاں سے خریدتے ہو؟''

''سر! مسلمانوں کی دکانوں سے۔''

"کیسے پتہ چلتا ہے کہ یہ ہندو کی دکان ہے یا مسلمان کی؟"

"سر! مسلمانوں کی دکانوں پر اللہ رسول کا نام لکھا ہوتا ہے' خانہ کعبہ کی یا مسجد نبوی کی تصویر لگی ہوتی ہے۔ ہندوؤں کی دکانوں پر بتوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ دیویوں کی تصویریں ہوتی ہیں' جن کے کئی کئی ہاتھ ہوتے ہیں۔"

"اور۔۔۔۔۔۔؟"

"اور سر' ہندوؤں کی دکانوں پر پانی کے مٹکے رکھے ہوتے ہیں جن پر سرخ کپڑا چڑھا ہوتا ہے۔"

"سر! وہ بتا دیتے ہیں کہ یہ ہندو کی دکان ہے' ویسے آپ پینا چاہو تو پی سکتے ہو۔"

"کبھی پیا تم نے ان مٹکوں سے پانی؟"

"نہیں سر' میس میں پانی کی تھوڑ ہے؟ ویسے بھی وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان ان کے برتن کو ہاتھ لگا دیں تو ناپاک ہو جاتے ہیں۔ تو ہمیں کیا ضرورت ہے انہیں تکلیف دینے کی۔"

دوسرے دن صبح ہم عمر کوٹ پہنچ گئے۔ شہر کے بالکل شروع میں ایک قلعہ ہے' ۹۴۶ فٹ لمبا' ۶۵۷ فٹ چوڑا۔ ایک چھوٹا سا میوزیم بھی ہے اور ایک بورڈ پر مختصراً شہر کی تاریخ درج ہے۔ اس کے مطابق یہ شہر ۱۰۵۰ء میں سمرہ سلطنت کے پہلے بادشاہ عمر نے تعمیر کروایا۔ مرور ایام کے ساتھ اس کے حکمران بدلتے رہے۔ ظہیر الدین بابر' نصیر الدین ہمایوں' جلال الدین اکبر' نور الدین جہانگیر' شہاب الدین شاہجہان' اورنگزیب' کلہوڑی' تالپور۔۔۔۔۔۔۔ ہمایوں جب شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کھا کر ایران کی طرف جا رہا تھا تو راجستھان اور صحرائے تھر عبور کر کے اس نے یہیں پڑاؤ کیا۔ اس وقت ایک ہندو رانا پرشاد حکمران تھا' اس نے شکست خوردہ بادشاہ کا خیر مقدم کیا اور عمر کوٹ میں پڑاؤ کی اجازت دی۔۔۔۔۔۔۔ رموز مملکت خسرواں دانند۔۔۔۔۔۔۔ عجیب بات ہے کہ نصیر الدین ہمایوں نے قلعے میں قیام نہیں کیا بلکہ قلعے سے ہٹ کر کھلے آسمان تلے خیمہ زن ہوا۔ اس وقت اس کے ساتھ صرف چند گھڑسوار محافظ تھے۔ اسی بے سرو سامانی کے عالم میں ایک رات اس کی بیوی حمیدہ بیگم نے ایک بچے کو جنم دیا' بتاریخ ۲۳ نومبر ۱۵۴۲ء ۔۔۔۔۔۔۔ بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں ہمایوں نے اپنے ہمراہیوں میں مشک نافہ تقسیم کی اور اس موقع پر کہا کہ جس طرح مشک نافہ اپنے اطراف کو معطر کر دیتی ہے' اسی طرح ایک دن اس بچے کی شہرت تمام دنیا میں پھیلے گی۔ معلوم نہیں یہ بات اس نے بیٹے کی محبت میں کہی تھی' مردم شناس تھا' مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتا تھا یا مرد درویش تھا۔ بقول اقبال:

یہ جہان روز و فردا نظر آئے گا اسی کو
جسے آ گئی میسر مری شوخیٔ نظارہ

محکمہ آثار قدیمہ نے اکبر کی جائے پیدائش کو محفوظ کر رکھا ہے اور وہاں ایک چھوٹا سا چبوترہ بنایا ہے جو کسی بھی طرح اکبر کے شایان شان نہیں۔

دوسرے دن ہم صحرائے تھر میں داخل ہوئے۔ فوجیوں نے چھور سے پر چی جی ویری تک ایک چھوٹی سی سڑک بنا دی ہے جس سے صحرا میں داخلہ آسان ہو گیا ہے۔ یعنی اب جیپ دس پندرہ منٹ تک فراٹے بھرتی ہوئی صحرا میں داخل ہوتی ہے۔ دائیں بائیں دور دور تک ریت ہی ریت یا خودرو جھاڑیاں' آک کے پودے' پر چی جی ویری' صحرا میں اگا ہوا یا اگایا ہوا ایک خوبصورت پھول' ریسٹ ہاؤس جس میں رہائشی کمرے بھی اس طرح بنائے گئے ہیں کہ گوپے دکھائی پڑتے ہیں۔ صحرا کے باشندے گھر اس طرح بناتے ہیں کہ سورج کی گرمی سے محفوظ رہ سکیں۔ گھاس پھونس اور بانسوں کی مدد سے گول سا کمرہ بناتے ہیں جس کے اوپر گھاس پھونس کو اس طرح باندھا جاتا ہے جیسے کسی لڑکی نے پونی بنا کر ربڑ بینڈ کس لی ہو۔ اسے گوپا کہتے ہیں۔ ریسٹ ہاؤس کے اردگرد بے تحاشا درخت لگائے گئے ہیں جن کی آبیاری خون جگر سے کی گئی ہے کہ اس کے بغیر صحرا میں پودے اگانا ناممکن تھا۔ یہ بھی ہوا کہ ہسپتال سے استعمال کے بعد ڈرپ کی جو بوتلیں بچ گئیں' فوجی اٹھا کر لائے' انہیں پانی سے بھر کر پودے کے ساتھ باندھ دیا گیا اور سرنج جڑ میں لگا دی گئی۔ جب سورج آگ برساتا تو پودوں کو قطرہ قطرہ پانی ملتا رہتا۔ کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل لہراسپ کا یہ حال تھا کہ انہیں ایک ایک پودے کا حال انہیں زبانی یاد تھا۔ کسی کام کے لیے آئے' راہ چلتے دیکھا کہ کسی پودے کی جڑ میں گھاس اگی ہوئی ہے۔ تمام علاقے مختلف یونٹوں میں تقسیم تھے۔ وہ فوراً متعلقہ کمانڈنگ آفیسر کو طلب کرتے۔ پودوں کی دیکھ بھال پر ایک لیکچر پلاتے۔ پھر کھرپا طلب کرتے کہ لاؤ میں گوڈی ہی کر جاؤں' آپ سے تو اتنا سا کام بھی نہیں ہو سکا۔ کمانڈنگ آفیسر پانی پانی ہو جاتا۔ یہ پانی پودوں کے حق میں زیادہ مفید ثابت ہوتا۔ اب چھور' پر چی جی ویری اور جہاں جہاں فوجیوں کی پوسٹیں ہیں' چاروں طرف درختوں کے جھنڈ ہیں' خوبصورت پودے' رنگ برنگی بیلیں اور ہنستے مسکراتے پھول۔ صحرا کو عبور کر کے آنے والے جب ستانے کو پر چی جی ویری میں ٹھہرتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ جہنم سے گزر کر جنت میں داخل ہو گئے۔

پر چی جی ویری کا مقامی زبان میں مطلب ہے "پر چی کا چھوٹا کنواں" صحرائی کلچر میں جگہوں کے نام اور بہت سی رسمیں پانی ہی کے حوالے سے ہیں' جیسے مہندر جو پار (کنوؤں کا بڑا مجموعہ) صحرا میں جب لوگ صبح اٹھتے ہیں تو انہیں پہلی فکر پانی ہی کی ہوتی ہے۔ میلوں دور سے جا کر پانی لاتے ہیں۔ کہیں پیدل' کہیں گدھوں پر' کہیں اونٹوں پر۔ اتنی محنت سے لایا گیا پانی ظاہر ہے کہ نہانے دھونے کی عیاشی میں استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ پینے اور کھانے پکانے میں استعمال ہوتا ہے۔ میرپور خاص سے ایک ٹرین چلتی ہے جو

کھوکھراپار تک جاتی ہے۔اس میں دو ڈبے مسافروں کے لیے ہوتے ہیں تو تین ڈبے پانی کے۔مقامی لوگ اسے ''دکھی ایکسپریس'' کہتے ہیں۔جانے اس نام میں کیا مصلحت ہے۔اس کا نام تو سکھی ایکسپریس چاہیے تھا کہ یہ لوگوں کے دکھ بانٹتی اور سکھ تقسیم کرتی ہے۔ بہرحال دکھی ایکسپریس جب صحرا میں چلتی ہے تو فیض کی زبان میں ایسے تو نہیں چلتی۔

جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم

لیکن اس کے اثرات باد نسیم سے کہیں زیادہ خوشگوار ہوتے ہیں۔

جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

بچھڑے ہوئے لوگوں کو ملانے کے ساتھ ساتھ یہ پانی بھی تقسیم کرتی ہے' آب حیات۔۔۔۔۔۔صحرا سے گزرتی ہوئی اس کی کوک اور انجن کی چھک چھک دور سے سنائی دیتی ہے۔ہارن کی آواز سن کر سٹیشنوں کے اردگرد کی بستیوں کے انسان تو انسان' جانور بھی منہ اٹھا کر سٹیشن کی طرف چلنا شروع کر دیتے ہیں۔گاڑی رکتی ہے' ٹینکوں کے نل کھلتے ہیں' گاؤں کی عورتیں' بچے بالے اپنے گھڑے' گھڑولیاں' گھڑونچیاں' صراحیاں' ڈول' بالٹیاں اور مشکیزے بھرتے ہیں۔ساتھ ساتھ کسی تسلے' پرات یا مشکیزے میں اپنے مویشیوں کو پانی بھی پلاتے ہیں۔کوئی کوئی عورت وہی سٹیشن پر کوئی چھوٹا موٹا کپڑا دھوتے بھی دکھائی دیتی ہے۔جب ٹرین چلی جاتی ہے تو جو پانی سٹیشن کے پکے پلیٹ فارم پر گرا رہ جاتا ہے اسے بھی کسی کپڑے میں جذب کر کے کسی برتن میں نچوڑ لیا جاتا ہے۔ پانی کی قدر کوئی ان سے پوچھے۔ایک وہ ہیں کہ شہر کے کسی بنگلے' فلیٹ' ولا کے باتھ روم میں گنگناتے ہوئے شیو کرتے ہیں تو جب تک برش کرتے ہیں' نلکا کھلا رکھتے ہیں۔بالٹیوں پانی یونہی بہہ جاتا ہے۔اسراف' تبذیر' بے رحمی' سنگدلانہ رویہ۔۔۔۔۔۔تو ہم دکھی ایکسپریس کی بات کر رہے تھے۔برسوں تک یہ گاڑی پانی تقسیم کرتی رہی' سکھ بانٹتی رہی۔اب بھی یہ کام کرتی ہے لیکن اب اس پر انحصار کرنے والوں کی تعداد کم ہو گئی ہے کہ پاک فوج نے عمر کوٹ اور چھور سے صحرا کے اندر دور دور تک پانی کے پائپ بچھا کر واٹر سپلائی پوائنٹ قائم کئے ہیں۔چھور اور عمر کوٹ میں پانی کے بڑے بڑے تالاب بنائے گئے ہیں جہاں سے پانی فراہم کیا جاتا ہے۔ جو منظر پہلے صرف تھر کے ریلوے سٹیشنوں تک محدود تھا' اب واٹر سپلائی پوائنٹس پر بھی نظر آتا ہے۔لوگ پاک فوج کو دعائیں دیتے ہیں اور پانی بھر بھر کر لے جاتے ہیں۔لیکن ابھی دور دراز کے کئی مقامات ایسے ہیں جن کے قریب سے دکھی ایکسپریس گزرتی ہے نہ پانی کے پائپ' وہ کنوؤں سے پانی حاصل کرتے ہیں۔

صحرا میں کنواں کھودنا جان جوکھوں کا کام ہے۔یہاں پانی تین تین سو فٹ سے پانچ پانچ سو فٹ کی گہرائی پر ملتا ہے۔کنویں کی

کھدائی کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا جاتا ہے جس کے دائیں بائیں گہرائی کے برابر فاصلہ خالی ہو۔اس کی وضاحت ہم آگے چل کر کریں گے۔ذرا کنواں تو کھود لیں۔

کھدائی سے پہلے سروے کیا جاتا ہے اور ''سروے'' کے لیے ایسے افراد کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی جناب سے ایک خاص علم کیا ہوتا ہے۔یہ افراد کہیں کہیں ملتے ہیں۔انہیں بڑے اہتمام سے بلایا جاتا ہے۔خوب آؤ بھگت کی جاتی ہے۔خاطر خواہ تواضع کے بعد وہ ایک لاٹھی ہاتھ میں پکڑے' آسمان کی طرف منہ اٹھائے' لاٹھی زمین پر مارتے ہوئے چلتا ہے۔کہیں کہیں رکتا ہے' آنکھیں کھولتا ہے' لاٹھی کو بار بار زمین پر مارتا ہے' کان لگا کر اس کی آواز سنتا ہے' پھر چل پڑتا ہے۔خاصے علاقے میں گھوم پھر کر کسی ایک جگہ رک جاتا ہے۔وہاں کھدائی کی جاتی ہے اور اکثر صورتوں میں نشان زدہ جگہوں سے پانی نکل آتا ہے۔

کھدائی کے لیے مشینیں استعمال نہیں کی جاتیں کہ جدید زندگی کی یہ سہولتیں تو دور کی بات ہے' عام سی اشیاء کا بھی یہاں سے گزر نہیں۔عام کدال' کئی' پھاوڑے' کھرپے استعمال کئے جاتے ہیں۔طریق کار یہ ہوتا ہے کہ چار' پانچ یا چھ فٹ قطر کی گولائی میں نشان لگا کر کھدائی شروع کی جاتی ہے۔جب پانچ چھ فٹ گہری کھدائی ہو جاتی ہے تو دیواروں کو برابر کر کے ان اینٹوں کی چنائی ہوتی ہے۔ چنائی کا کام ساتھ ساتھ ہونا اس لیے ضروری ہے کہ صحرا میں ریت بھربھری اور نرم ہوتی ہے' اس بات کا خدشہ موجود رہتا ہے کہ دور مزدور گہرائی میں کام کر رہے ہوں اور اردگرد کی ریت بغیر بتائے خاموشی سے سرکنا شروع کر دے اور مزدور منوں ریت تلے دفن ہو جائیں۔کھدائی اور چنائی کا کام جاری رہتا ہے۔جوں جوں گہرائی زیادہ ہوتی جاتی ہے' کام مشکل اور رفتار سست ہوتی جاتی ہے۔

مجاہد آباد کے ایک میس کے لان میں باتیں کرتے ہوئے چھاچھرو کے لیفٹیننٹ اکبر نے بتایا کہ اسے ایک مرتبہ ایک کنویں میں کام کرنا پڑا۔گہرائی میں جا کر کام کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔جب رسے کی مدد سے آپ کو سو ڈیڑھ سو ڈھائی سو یا اس سے بھی زیادہ گہرائی میں اتار دیا جاتا تو اوپر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی' کلیجہ منہ کو آ جاتا ہے۔دل کی حرکتیں بند اور سانس گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو نیا مزدور کوئی کام کئے بغیر ہی رسی ہلا کر اشارہ دیتا ہے کہ بھائی کھینچو مجھے اوپر' میں گیا۔جب کنویں پر کام ہو رہا ہو تو کنویں کے باہر لوگ سخت احتیاط کرتے ہیں کہ منڈیر کے اردگرد کوئی غیر ضروری حرکت نہ ہو' کوئی شور نہ ہو۔بے احتیاطی سے کوئی چھوٹا سا کنکر' پتھر' بجری' ریت' روڑا' کیل کنویں میں گر جائے تو نیچے کام کرنے والے کی جان نکل جاتی ہے۔ضروری نہیں کہ یہ چھوٹا سا کنکر مزدور کو جسمانی ضرر ہی پہنچائے لیکن جب یہ گرتا ہے تو ہوا کو چیرتے ہوئے فرکشن (Friction) پیدا کرتا ہے۔جگہ تنگ ہونے کے باعث اس کی گونج پیدا ہوتی ہے اور جوں جوں یہ نیچے جاتا ہے گونج در گونج کی آواز بڑھتی جاتی ہے اور نیچے کام کرنے والے کو سمجھ نہیں آتی

کہ اس پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ کچھ لوگ تو ویسے ہی تنگ جگہ سے گھبراتے ہیں۔ انگریزی زبان میں اس خوف کو Claustrophobia کا نام دیا گیا ہے۔اس خوف کے مریض کنویں میں کام تو کجا' اترنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

جس دن پانی نکل آئے' زبردست خوشی کا سماں ہوتا ہے۔کنویں کا مالک پھولے نہیں سماتا' حسب توفیق گڑ' شکر یا گھر میں بنائی ہوئی مٹھائی تقسیم کرتا ہے۔

ان مصیبتوں سے کھودا گیا کنواں بہت بڑی دولت ہے اور صحرا کے دولت مند اپنی یہ دولت بیٹیوں کے نام کرتے ہیں۔یعنی جب بیٹیاں جوان ہونے لگتی ہیں تو کوئی کنواں کھدوا کر ان کے نام کر دیتے ہیں۔اسے استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ ڈھانپ کر اس پر لپائی کر دی جاتی ہے۔وہ دولہا بہت ہی خوش قسمت سمجھا جاتا ہے جس کی دلہن جہیز میں کنواں لے آئے۔اس طرح گویا کنواں پیاسے کے پاس چلا آتا ہے۔

تو ہم پر چی جی ویری سے اتر رہے تھے۔ پرچی جی ویری کا ریسٹ ہاؤس ایک بلند ٹیلے پر بنایا گیا ہے جہاں سے صحرا کا منظر دور دور تک دکھائی دیتا ہے۔طلوع وغروب آفتاب کا منظر لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں اور مہینے میں ایک دو شام میں ایسی بھی آتی ہیں جب سورج مغرب میں ڈوب رہا ہوتا ہے اور مشرق سے چاند ابھر رہا ہوتا ہے۔اور صبح کے وقت جب آپ طلوع آفتاب کا انتظار کرتے ہیں تو دور سے گھنٹیوں کی ٹن ٹن سنائی دیتی ہے۔آواز کی سمت میں غور سے دیکھیں تو نقطوں کی مانند اونٹوں کی ایک قطار دکھائی دیتی ہے۔اونٹ پرچی جی ویری کے نیچے قائم واٹر سپلائی پوائنٹ کے پاس آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔مقررہ وقت پر پوائنٹ کھلتا ہے تو لوگ پانی بھرنے لگتے ہیں۔پانی بھرنے سے پہلے وہ صحرا کے جہاز کی ٹنکیاں بھرتے ہیں۔ریت میں ایک گڑھا سا بنا کر مشکیزہ اس میں بچھا دیا جاتا ہے اور اس میں پانی ڈال کر اونٹوں کو پلایا جاتا ہے۔واٹر پوائنٹ پر پکنک کا سماں ہوتا ہے اور اس کی خوش نمائی میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جب دکھی ایکسپریس چھک چھک کرتی قریب سے گزرتی ہے' اونٹ گردنیں موڑ موڑ کر اپنی پرانی سکھی کو دیکھتے ہیں جیسے اسے الوداع کہہ رہے ہوں۔

پرچی جی ویری میں اتریں تو پکی سڑک ختم ہو جاتی ہے۔اب صحرا کے راستے ہیں اور ہچکولے لیتی ہوئی جیپ۔راستے بھی کیا' پہلے سے گزری ہوئی گاڑیوں کے نشان۔اگر بارش ہوئی ہو جو کبھی کبھار ہی ہوتی ہے' تو ریت قدرے دبی ہوئی ہوتی ہے اور سفر نسبتاً آسان ہو جاتا ہے ورنہ راستہ' راستہ کہاں رہتا ہے۔۔۔۔۔۔لامتناہی گڑھوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جس میں دھچکے کھاتے ہوئے آپ آگے بڑھتے ہیں۔یہاں شاہراہوں پر نصب سیمنٹ اور بجری سے بنے سنگ میل نہیں ہوتے بلکہ لکڑی کی تختیوں پر مسافت لکھی ہوتی ہے۔

پلک جھپکتے میں ایک کلومیٹر نہیں گزر جاتا بلکہ کتنی ہی دیر سفر کے بعد ہڈیاں دکھنے لگتی ہیں تو دوسری تختی نظر آتی ہے اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ پہلی گاڑیوں کے چھوڑے ہوئے نشانات پر سے گزرتے گزرتے راستے کے گڑھے گہرے ہو گئے۔ان میں گاڑیاں دھنس جاتی ہیں۔ایسے میں اگر عام طریقے سے گاڑی کو گیئر میں ڈال کر چلانے کی کوشش کی جائے تو پہیہ اپنی جگہ پر گھومتا رہتا ہے' ریت اڑاتا رہتا ہے اور گاڑی مزید دھنستی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ سفر موقوف اور ایک نئے اپریشن کا آغاز ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔۔اپریشن ریسکیو۔تمام سواریاں اتار دی جاتی ہیں۔ارد گرد سے جھاڑیاں کاٹ کر پہیوں کے آگے رکھی جاتی ہیں۔سواریاں مزدوروں میں بدل جاتی ہیں اور زور لگا کر گاڑی کو ریت کی دلدل سے باہر نکالا جاتا ہے۔تو اسی طرح کی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے ہم کھوکھراپار کی طرف رواں تھے۔ایک تیز ڈھلوان سے بمشکل اوپر پہنچے۔تھوڑی دیر آگے گئے ہوں گے کہ اچانک ایک ایک نئی دنیا ہمارے سامنے تھے۔

ایک لمبا چوڑا نشیب جس کے پرلے سرے پر ایک گوٹھ تھا۔گوٹھ میں گوپے تھے جہاں سے رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس گوپیاں اترتی تھیں۔ان کے سروں پر اور کولہوں پر گھڑے تھے اور شانوں پر رسیاں تھیں۔وہ نشیب میں اترتی تھیں اور کنوؤں سے پانی بھرتی تھیں۔مرد منڈیر سے ڈول کنویں میں پھینکتا تھا اور اس کا سرا کسی عورت کو تھما دیتا تھا۔وہ عورت اسے شانے سے لپیٹ کر قدرے جھک کر ایک سمت میں چلنا شروع کرتی تھی۔جب ڈول اوپر آ جاتا تو مرد ہاتھ بڑھا کر اسے کھینچ لیتا۔پانی کسی برتن میں انڈیلتا۔اس دوران عورت اور رسی واپس آ چکی ہوتی۔ہم دور سے یہ منظر دیکھا کئے۔پھر گاؤں کے ایک کونے سے گزرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف چل دیئے۔پتہ چلا گوٹھ کا نام بھٹاروتھا۔پرچی جی ویری سے کھوکھراپار تک تقریباً تیس کلومیٹر کا سفر تین گھنٹوں میں طے ہوا۔ہم تو پھر جیپ پر تھے جو نسبتاً آرام دہ اور تیز رفتار سواری ہے' عام لوگ تو ''کیکڑے'' میں سفر کرتے ہیں۔

''کیکڑا'' ایک عام ٹرک کی تبدیل شدہ شکل ہے۔اس کی شکل تو عام ٹرک جیسی رہتی ہے لیکن چلتا یہ کیکڑے کی طرح ہے یعنی بالکل سیدھ میں چلنے کی بجائے رک رک کر چلتا ہے۔ بھاری بوجھ کی وجہ سے ڈولتا ہے' پھسلتا ہے' پھر چلتا ہے۔تو اس کی چال کی مناسبت سے اس کا نام کیکڑا رکھا گیا۔اس میں ڈیزل کا مضبوط انجن ڈالا جاتا ہے' چوڑے اور دیرپا ٹائر لگائے جاتے ہیں اور مسافروں کی گنجائش بڑھانے کے لیے خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔عام ٹرک میں جو ڈرائیور کی نشست ہوتی ہے اسے ڈبل کیبن بنایا جاتا ہے۔ڈرائیور کی پچھلی نشست پر خواتین بیٹھتی ہیں اور جو پچھلا حصہ ہوتا ہے اسے دو منزلہ بنایا جاتا ہے۔اوپری منزل اوپر سے کھلی ہوتی ہے اور اس پر لکڑی کا ایک چوکھٹا ہوتا ہے جس سے سامان کی پوٹلیاں باندھ دی جاتی ہیں۔اگر مسافروں میں جانور بھی شامل ہوں تو انہیں کپڑے کی چادر یا نوار کی چوڑی پٹیوں کی مدد سے اوپر کے چوکھٹے سے لٹکا دیا جاتا ہے۔کیکڑا صحرا میں سفر کی واحد پبلک ٹرانسپورٹ ہے۔

توہم کھوکھرا پار میں تھے۔ یہ بھارت اور پاکستان کے درمیان ایک سرحدی گاؤں ہے۔ سرحد سے پار بھارت کا ریلوے اسٹیشن مونا باؤ ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاک فوج نے بڑھ کر مونا باؤ پر پاکستان کا پرچم لہرایا تھا۔

ہم نے کھوکھرا پار کا نام تو بہت سنا تھا لیکن اسے دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ جسے بازار کہتے ہیں پرانی لکڑی کے چند کھوکھوں پر مشتمل تھا جن میں نمایاں ترین شے گردوغبار ہے۔ ایک کھوکھے پر گئے' میڈیکل سٹور تھا۔ دکاندار ایک بھولا بھالا نوجوان قائم علی' اس نے چھور سے میٹرک کرنے کے بعد یہ سٹور کھولا تھا۔ ماحول کے لحاظ سے وہ پڑھا لکھا آدمی تھا کہ کھوکھرا پار میں تعلیمی سہولتیں صرف ایک پرائمری سکول تک محدود تھیں۔ ان دنوں وہ بھی بند پڑا تھا کہ کوئی استاد ہی میسر نہ تھا۔ تو ہم نے قائم علی سے پوچھا کہ وہاں کھانے پینے کے لیے کوئی ہوٹل' کوئی ریسٹورنٹ؟

اس نے ہنستے ہوئے بتایا کہ سر کھانے پینے کے لیے تو میں بھی کچھ پیش کر سکتا ہوں۔

''کیا؟''

''سر! کھانے کے لیے دوائیں' پینے کے لیے کھانسی' نزلہ' زکام کا شربت''

''لاؤ یار یہی کچھ دے دو۔'' اس کی حوصلہ افزائی کے لیے ہم نے بلاضرورت دوائیں خریدنا چاہیں۔

''نہیں سر! اس کے لیے تو آپ کو بیمار ہونا پڑے گا۔'' قائم نے شرط رکھی۔

''احمق آدمی' لوگوں کے بیمار ہونے کا انتظار کرو گے تو یہ سٹور نہیں چلے گا۔ اچھے بھلے آدمی کو دیکھ کر کہا کرو کہ تمہیں وٹامنز کی ضرورت ہے' کیلشیم کی کمی' آئرن کی تھوڑ۔'' ہم نے اسے دکانداری کے گر بتائے۔

ہنسنے لگا۔

''سر! فوج میں آنے سے پہلے آپ بھی کوئی میڈیکل سٹور چلاتے رہے ہیں؟''

''نہیں' سٹور نہیں چلایا' بندے چلائے ہیں۔''

تھوڑی دیر کھوکھرا پار میں رکنے کے بعد ہم گڈرو روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دور بعد ہی ایک مشاہداتی چوکی ہے' غازی پوسٹ ------ یہاں سے بھارت کا سرحدی گاؤں مونا باؤ اور ریلوے سٹیشن صاف نظر آتے ہیں۔ غازی پوسٹ سے آگے جاتے ہوئے راستہ بارڈر کے ساتھ ساتھ ہے۔ اس علاقے میں Black Buck ہرن کثرت سے ملتے ہیں۔ فوج نے ان کے تحفظ کا خاص اہتمام کر رکھا ہے اور وائلڈ لائف کے محکمے کی ہدایات پر سختی سے عمل کروایا جاتا ہے۔ کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل لہراسپ کی طرف

سے سخت احکامات تھے کہ ہرنوں پر گولی نہ چلے۔ لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ باڑ باغ کو کھانے لگتی ہے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ جنگلی جانوروں کے تحفظ کے محکمہ (وائلڈ لائف) کے ایک سینئر افسر ایک سینیٹر کے ہمراہ ایک بریگیڈیئر کے مہمان بن کر اس علاقے میں تشریف لائے اور یہ سوچ کر کہ وہ ''اعلیٰ حکام'' ہیں' انہیں پوچھنے والا کون ہوگا' ہرن کے شکار پر نکل کھڑے ہوئے۔ پرمٹ ان کے پاس تھا نہیں۔ ہرن تو انہوں نے شکار کر لیا لیکن جنرل لہراسپ نے جو ہنگامہ برپا کیا تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ جس بریگیڈیئر کے یہ مہمان تھے' جنرل لہراسپ نے راتوں رات جی ایچ کیو سے بات کر کے ان کا تبادلہ کروا دیا۔ ''اعلیٰ حکام'' کے خلاف رپورٹ درج کروائی۔ معلوم نہیں اس رپورٹ کا کیا ہوا لیکن پورے علاقے میں لوگوں کو کان ہو گئے کہ ہرنوں کو نہیں چھیڑنا۔ بلکہ اب تو ہرن اتنے شیر ہو گئے ہیں کہ راہ چلتوں کو چھیڑتے ہیں۔ یہ چھیڑنا ہی ہوا نا کہ آپ جیپ پر جا رہے ہوں اور ڈاروں کی ڈار دائیں سے نکلتی ہے اور بائیں جانب بھاگتی چلی جاتی ہے۔ تھوڑی دور جا کر رکتے ہیں اور حیران حیران معصوم نظروں سے جیپ کو دیکھتے ہیں' پھر قلانچیں بھرتے ہوئے صحرا میں گم ہو جاتے ہیں۔ آپ کے پاس رائفل بھی ہے' ایمونیشن بھی کہ سرحدی علاقے میں سفر کے دوران مسلح گارڈ ساتھ ہوتے ہیں لیکن فائر کی آواز صحرا میں دور دور تک گونجتی ہے۔ ادھر ٹھائیں ہوئی اور ادھر مشاہداتی چوکیوں کے رینجرز آ موجود ہوئے۔ لوگ صبر کا گھونٹ پیتے ہیں۔ آپس میں کہتے ہیں ''یار سنا ہے ہرن کا گوشت مزیدار نہیں ہوتا'' اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ راہ میں باز' تیتر' خرگوش' چکور بھی نظر آتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک باز کو دیکھا کہ خرگوش کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ باز خرگوش کو دیکھ کر کسی درخت سے ڈائیو کرتا' پھرتیلا خرگوش سیدھا بھاگنے کی بجائے باز کی پرواز کی سیدھ سے دائیں بائیں ہو جاتا۔ باز آگے نکل جاتا اور خرگوش کسی جھاڑی میں دبک جاتا۔ فطرت اپنے تمام تر حسن کے ساتھ صحرا میں نمایاں تھی۔ معلوم نہیں اقبال نے کس صحرا کا مشاہدہ کیا تھا کہ کہا:

حسن بے پرواہ کو اپنی بے نقابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

کھوکھرا پار سے گڈرو کا زیادہ تر راستہ بین الاقوامی سرحد کے ساتھ ساتھ ہے۔ گزشتہ چند برسوں سے بھارت نے سرحد ''واضح'' کرنے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ ان برجیوں سے ہٹ کر جو دونوں ملکوں کے درمیان سرحدیں واضح کرتی ہیں' بھارت نے اپنی جانب لوہے کے خمدار سریے لگائے ہیں۔ ان پر خاردار تاریں کھینچی ہیں اور ان کے پیچھے خاردار تاروں کے رول بچھائے ہیں۔ سو سوفٹ کے فاصلے پر بجلی کے کھمبے نصب کر کے ان پر سرچ لائٹ لگائی ہے جن کا رخ پاکستان کی جانب ہے۔ رات کو جب یہ لائٹس جلتی ہیں تو صحرا روشن ہو جاتا ہے۔ اس تمام اہتمام پر کروڑوں روپیہ خرچ ہو گیا ہوگا۔ فائدہ پاکستان کو ہوا کہ سرچ لائٹوں کا رخ پاکستان کی طرف تھا۔

سرحدوں پر متعین رینجروں کو آسانی ہو گئی لیکن بھارت کو یہ آسانی پسند نہیں آئی یا شاید بجلی کا خرچ بڑھ گیا۔ شروع شروع میں تو تمام لائٹیں آن ہوتی تھیں لیکن اب وہ ساری لائٹیں آن نہیں کرتے۔ کبھی یہاں کی جلا دی' کبھی وہاں کی۔ ان خاردار تاروں کے درمیان انہوں نے گیٹ بنا رکھے ہیں جو حسب ضرورت کھولتے رہتے ہیں۔ اگر کسی کو انہوں نے سرحد پار بھجوانا ہو تو روشنیاں بند رکھتے ہیں اور اپنی دانست میں جب پاکستانی غافل ہوں تو ایجنٹ کو چپکے سے گیٹ کراس کروا دیتے ہیں۔ پاکستانی رینجرز کو اس تمام انتظام سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ ان کی توجہ ان دروازوں تک مرکوز رہتی ہے۔ جب لائٹیں آف ہوں تو وہ اندھیرے میں دیکھنے کی صلاحیت رکھنے والی تدبیروں (Night Vision Devices) کے ذریعے ان دروازوں کو تاکتے رہتے ہیں۔ اگر رات کے کسی پہر کوئی سرگرمی مشاہدے میں نہ آ سکے تو دن کے اجالے میں سراغ مل جاتا ہے۔ ویسے بھی صحرا جھوٹ نہیں بولتا' کچھ چھپاتا نہیں ہے۔ گزرنے والے ہر شخص' جانور کا سراغ رکھتا ہے۔ رینجرز میں ایسے ماہرین موجود ہوتے ہیں جو قدموں کے نشان سے انسان کی جنس' ڈیل ڈول' قدو قامت تک بتا دیتے ہیں۔ ایسے شخص کو ''پگی'' کہتے ہیں۔ پگی کھرا ڈھونڈتے ڈھونڈتے سرحد پار سے آنے والے کو جا لیتا ہے۔

تو رات پڑ چکی تھی جب ہم گڈرو پہنچے۔ میجر خالد کو ہمارے آنے کی خبر تھی۔ انہوں نے پر تکلف ضیافت کا اہتمام کر رکھا تھا۔ کھانے کے بعد کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ انہوں نے صحرائے تھر کی زندگی کے بارے میں دلچسپ باتیں بتائیں۔ عام آدمی غربت و افلاس کا شکار ہے اور اس پر مستزاد وڈیرہ شاہی' جاگیرداری ۔۔۔۔۔۔ کوئی جاگیردار' سرمایہ دار پورے کا پورا گوٹھ بھیڑ بکریوں کی طرح خرید لیتا ہے۔ برسوں اس گوٹھ کے مرد' عورتیں' بچے' بوڑھے' محنت مزدوری کرتے ہیں۔ کھلے آسمان تلے گھاس پھونس کے گوپوں میں رہتے ہیں اور پیٹ کا ایندھن پورا کرنے کے بعد جو کچھ بچتا ہے ''مالک'' کو ادا کرتے رہتے ہیں لیکن اصل رقم ادا ہوتی ہے نہ سود۔ مالک جب جی چاہے پورا گوٹھ کسی اور جاگیردار کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔ اس گوٹھ کے سب افراد بطور لونڈیاں' غلام نئے مالک کے ہاتھ آ جاتے ہیں۔

ایک اور افسر نے بتایا کہ جب وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ نئے نئے ڈیوٹی پر آئے تو انہوں نے بکریاں چراتے ایک گڈریے کو کہا کہ وہ انہیں دو ڈھائی کلو دودھ دے جایا کرے۔ بولا کہ پوچھ کر بتاؤں گا۔ دوسرے دن وہ پوچھ کر آیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پتہ چلا کہ دس روپے کلو کے حساب سے دودھ بیچنے پر پانچ روپے ٹیکس دینا ہو گا۔ تین کلو دودھ بیچنے کی اجازت ملی تھی۔ اس ''اجازت'' کا مطلب یہ تھا کہ دودھ بکے نہ بکے پندرہ روپے روزانہ ڈیرے پر پہنچائے جائیں۔ جو لوگ ''نظام'' سے بغاوت کرتے ہیں ان کے مقدر میں قید بامشقت آتی ہے۔ گزشتہ برسوں میں کئی ایسی نجی جیلوں کا انکشاف ہوا ہے جہاں سینکڑوں افراد کو محبوس رکھا

جاتا۔ ان سے جبراً بیکار لی جاتی اور کھانے کو صرف اتنا ملتا کہ سانس کا رشتہ باقی رہ سکے۔ جن دنوں (مارچ ۱۹۹۹ء) یہ سطریں تحریر کی جا رہی ہیں ایک اخبار میں مسلسل قومی اسمبلی اور سندھ اسمبلی کے دو ارکان کی تصویریں شائع ہو رہی ہیں' اس نوٹ کے ساتھ کہ ان کی قید میں ستر عورتیں ہیں' انہیں رہائی کب ملے گی؟

سب سے زیادہ بے گار خشت سازی میں لی جاتی رہی ہے اور اس کا انکشاف اس وقت ہوا جب چھور میں مقامی ٹھیکیداروں کی من مانیوں سے تنگ آ کر فوج نے اینٹوں کا اپنا بھٹہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ جب چھور میں چھاؤنی کے قیام کے ساتھ تعمیر و ترقی کا کام جاری ہوا تو لامحالہ اینٹوں کی ضرورت پڑی۔ جاگیرداروں کے گماشتے مقامی ٹھیکیدار پہلے تو آئیں بائیں شائیں کرتے' مہنگے دام لگاتے' ایڈوانس رقم لیتے' پھر بھی وعدے کے مطابق اینٹیں مہیا نہ کرتے اور جب مال پہنچاتے تو مطلوبہ معیار کا نہ ہوتا۔ فوج نے عسکری کلن (Askari Kiln) کے نام سے اپنا بھٹہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ بھٹے کی تعمیر آخری مراحل میں تھی' جب اردگرد کے جاگیرداروں کے وفود آنے شروع ہوئے کہ جتنی چاہو اینٹیں لے لو سستے داموں' بھٹہ نہ بناؤ۔

''بھئی' کیوں نہ بنائیں؟''

''سر' آپ کے شایان شان نہیں ہے۔''

''لیکن ہمیں اینٹیں نہیں ملتیں ۔۔۔۔۔۔ پیسے بھی دیں پھر بھی نہیں ملتیں۔''

''سر' اب ملیں گی' وہ تو فلاں آدمی شرارت کرتا تھا۔''

''نہ بھئی نہ' اب تو بنا لیا ہم نے بھٹہ' اتنے پیسے لگ گئے ہمارے۔''

''سر' پیسوں کی فکر نہ کریں' جتنے لگ گئے سو لگ گئے' آپ دگنے لے لیں' تگنے پیسے لے لیں۔ یہ بھٹہ ہمارے حوالے کریں' سر یہ ہمارا آبائی کام ہے۔''

''انہیں کیا تکلیف ہے؟'' کمانڈر نے سوچا اور بھٹے پر کام جاری رکھا۔

جب بھٹے پر کام شروع ہوا تو کمانڈر کے ذہن میں صرف یہ بات تھی کہ اس سے معیاری اینٹیں میسر آئیں گی لیکن بھٹہ معیار زندگی ہی بدل دے گا' سوچا نہ تھا۔ شروع شروع میں افرادی قوت کا مسئلہ درپیش تھا۔ لوگ آتے نہ تھے۔ جب پتہ چلا کہ اس بھٹے پر گالم گلوچ نہیں ہوتی' لیبر کا احترام کیا جاتا ہے' بیگار نہیں لی جاتی' مزدوری نہ صرف ملتی ہے بلکہ پوری ملتی ہے اور وقت پر ملتی ہے' کام ختم کرنے کے بعد بھٹے ہی پر رہنے اور دھوپ میں جھلستے رہنے کی شرط نہیں' کام ختم کرو جب جہاں مرضی آؤ جاؤ ۔۔۔۔۔۔ تو افرادی

قوت کی بہتات ہوگئی۔ صحرا میں آباد خاندان عسکری بھٹے کے اردگرد آن براجے اور باقاعدگی سے کام شروع کر دیا۔ تب جاگیرداروں کے نمائندے آئے اور پہلے تو نرمی سے چاہا کہ صحرا سے آنے والوں کو کام سے الگ کر دیا جائے پھر دھمکی نما مطالبے کہ یہ لوگ ہمارے مقروض ہیں انہیں ہمارے حوالے کیا جائے۔ کارکن خواتین اور بوڑھوں نے رورو کر آسمان سر پر اٹھالیا کہ ہماری ساری عمریں ان کی چاکری کرتے گزر گئیں۔ ہماری عزتیں محفوظ ہیں نہ آبرو۔ ان کا اصل زرختم ہوتا ہے نہ سود۔ ہمیں اس غلامی سے نجات دلائی جائے۔ بھٹے پر کام کرنے والے سارے کارکنوں اور ان کے خاندانوں کو فوج نے اپنی امان میں لے لیا۔ اب ان خاندانوں کے بچے سکولوں میں پڑھتے ہیں۔

پڑھائی کا ذکر ان سکولوں کے بغیر نامکمل رہے گا جو پاک فوج نے کھولے ہیں۔ نہ صرف چھور میں آرمی پبلک سکول قائم کیا گیا بلکہ صحرا کے اندر بہت دور' چھاچھرو میں بھی ایک سکول قائم کیا گیا ہے۔ سندھ کے دوسرے شہروں پتارو' بدین اور دادو میں خوبصورت سکول کھولے گئے ہیں۔ چھور' چھاچھرو اور صحرا کے دوسرے مقامات کا تو یہ عالم تھا کہ اگر کسی کا خط آجاتا تو کسی پڑھے لکھے آدمی کی تلاش بجائے خود ایک مسئلہ ہو جاتی۔ چھور کی پرنسپل نے بتایا کہ اب ان کے سکول کے بچے باقاعدہ سوشل ورک کے طور پر لوگوں کے خط لکھتے اور پڑھتے ہیں۔

راقم الحروف کو ایک دفعہ دادو جانے کا اتفاق ہوا۔ آمد کی خبر سن کر بچوں کے والدین جمع ہو گئے اور ہم سے ملاقات کی۔ ان کی درخواست تھی کہ فوج سکول چھوڑ کر نہ جائے۔ دادو میں نہ کوئی چھاؤنی ہے نہ فوجی دستے۔ ویلفیئر کے طور پر فوج نے وہاں سکول کھولا تھا۔ مقامی آبادی سے ٹیچرز بھرتی کی گئیں۔ اب یہ سکول خود کفیل ہے۔ ہم نے بتایا کہ جب سکول خود کفیل ہو گیا ہے تو فوج کی کیا ضرورت باقی رہ گئی ہے۔۔۔۔۔۔ تو ان کا کہنا تھا کہ جس دن فوج سکول چھوڑ کر گئی' سکول بند کر دیا جائے گا اور اس کی عمارت گدھوں اور گھوڑوں کے اصطبل میں بدل جائے گی۔

تمام سکولوں کی نگرانی ابھی تک فوج کے ذمے ہے اور ان سکولوں میں نہ صرف طلبہ کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے بلکہ چھور' بدین اور سکھر میں ہاسٹل بھی تعمیر کئے گئے ہیں' جہاں دور دراز کے طلبہ آ کر ٹھہرتے ہیں۔

تو ہم گڈرو میں تھے۔ رات گئے سوئے' گہری نیند آئی۔ صبح سویرے اٹھے اور باہر نکل آئے کہ صبح کے اجالے میں صحرا کے منظر دیکھے جائیں۔ یہاں بھی کیمپ کے اردگرد سینکڑوں درخت لگائے گئے ہیں جو صحرا کے پس منظر میں بہت ہی خوشنما دکھائی دیتے ہیں۔ ہم کیمپ کی سیر گشت میں مصروف تھے کہ دور سے ایک آواز سنائی دی۔۔۔۔۔۔ سبحان اللہ۔۔۔۔۔۔ پہلے تو ہم یہ سمجھے کہ کوئی

مرد درویش ذکر میں مصروف ہے۔ لیکن جب وقفے وقفے سے سبحان اللہ کی آواز آتی رہی تو تجسس ہوا کہ چل کر دیکھیں تو سہی کون مرد درویش ہے۔ کیمپ سے باہر آئے۔ تھوڑے سے فاصلے پر ایک کنواں دکھائی دیا جس سے پانی نکالنے کا عمل جاری تھا۔ پتہ چلا کہ کنواں تقریباً ساڑھے پانچ سو فٹ گہرا ہے۔ ایک مرد کنویں کی منڈیر سے ڈول کنویں میں پھینکتا تھا اور رسی کا ایک سرا ایک اونٹ کی کوہان سے باندھ دیتا تھا۔ اونٹ کی نکیل ایک عورت کے ہاتھ میں تھی جو اونٹ کو لے کر چلنا شروع کر دیتی تھی۔ مرد منڈیر پر آ بیٹھتا تھا اور کنویں میں جھانکتا تھا۔ جب ڈول اس کی پہنچ میں آ جاتا تو وہ اونٹ کی طرف منہ کر کے با آواز بلند پکارتا۔ ''سبحان اللہ'' اونٹ وہیں رک جاتا۔ عورت اونٹ کا رخ بدلتی' ہاتھ بڑھا کر رسی کو ہک سے آزاد کرتی اور نکیل تھامے کنویں کی سمت چلنے لگتی۔ اتنی دیر میں کنویں پر موجود مرد ڈول کا پانی ایک دوسرے اونٹ پر لدے مشکیزے میں انڈیل دیتا' ڈول کنویں میں پھینک دیتا۔ کتنی ہی دیر بیٹھے ہم یہ منظر دیکھتے رہے۔ ایک اور فیملی بھی آئی اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگی۔

اس دن کے پروگرام میں ایک میڈیکل کیمپ بھی شامل تھا۔ سرحد کے بالکل قریب کگرالہ گوٹھ کے ایک سکول میں یہ کیمپ لگنا تھا۔ کگرالہ اور اردگرد کے گوٹھوں کے نمبرداروں کو خبر کر دی گئی تھی۔ دس بجے کے قریب ہم سکول پہنچے تو بہت سے مریض جمع تھے اور مزید مریضوں کی آمد جاری تھی۔ ہم نے چل پھر کر سکول کا معائنہ کیا اور لوگوں سے پوچھا کہ سکول کے طلبہ اور استاد کدھر ہیں۔ بتایا گیا کہ سکول تو بند ہی رہتا ہے بس فوجی لوگ جب میڈیکل کیمپ قائم کرتے ہیں تو سکول کی عمارت استعمال کر لیتے ہیں۔ ایک استاد تھا اس نے اپنا تبادلہ کروا لیا۔ ویسے بھی طلبہ میسر نہیں ہیں۔

''کیوں۔۔۔۔۔۔ ان گوٹھوں کے بچوں کو پڑھنے کا کوئی شوق نہیں؟''

''پڑھنے کا شوق تو تب ہو جب پیٹ بھر کھانا اور پینے کو پانی میسر آ جائے۔ بچے اور عورتیں صبح نکلتے ہیں تو دوپہر تک تو پانی ڈھوتے رہتے ہیں۔''

''اور مرد کیا کرتے ہیں؟''

''مردوں کا تو یہ کام نہیں نا۔'' ایک مرد نے بڑے فخر سے بتایا۔

ہم نے دو کمروں پر مشتمل اس پرائمری سکول کا معائنہ کیا۔ عمارت نئی تھی لیکن گرد و غبار سے اٹی ہوئی۔ ایک کلاس کے تختہ سیاہ پر چھ ماہ پرانی تاریخ کے ساتھ پریڈ سٹیٹ لکھی تھی۔

کل طلبہ۔۔۔۔۔۔۔۔7

غیر حاضر۔۔۔۔۔۔۵

حاضر۔۔۔۔۔۔۱

کلاس روم سے باہر آئے اور برآمدے میں ڈاکٹر کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر صاحب مریضوں کو بھی دیکھتے جاتے اور ہماری معلومات کے لیے ہر مریض کے مرض پر تبصرہ بھی کرتے جاتے۔ زیادہ تر مریض ایسے تھے جن کا مرض پانی سے متعلق تھا' پینے کا صاف پانی نہ ملنے کی وجہ یا کم پانی پینے کی وجہ سے ہونے والے مرض عام تھے۔ گردوں میں انفیکشن' انتڑیوں میں زخم' معدے میں درد' پیٹ میں کیڑے' سڑے' دانت پیلے۔۔۔۔۔۔ پانی میسر نہ آنے کی وجہ سے ان کے ہاں نہانا دھونا یا کپڑے دھونا عیاشی میں شامل ہے اور غربت و افلاس کے مارے ان لوگوں کو یہ عیاشی کہاں میسر تھی۔ چنانچہ جلدی بیماریاں عام تھیں۔ خارش' سن برن (Sun Burn)' جلد کا پھٹنا' پھنسیاں پھوڑے۔ کیمپ شام تک جاری رہا۔ رات کو بھی ڈاکٹر صاحب بڑی دردمندی سے علاقے کے مسائل بیان کرتے رہے۔

ایک نوجوان لڑکی کو سانپ نے کاٹ لیا۔ تھر کے سانپ بھی کم بخت زہریلے ہوتے ہیں۔ آس پاس کہیں طبی امداد میسر نہ تھی۔ (فوج کے یہ چند افراد اور ڈاکٹر صاحب تو بعد میں آئے) لوگوں نے لڑکی کے منگیتر سے کہا کہ وہ اسے چھور لے جائے۔ ذرائع آمد و رفت صحرا میں ناپید ہیں۔ صرف کیکڑا سروس چلتی ہے۔ اتفاق سے ایک کیکڑا پاس کے گاؤں میں آیا ہوا تھا۔ ڈرائیور سے بات کی۔ اپنے روٹ سے ہٹ کر مسافروں کو چھوڑ کر چھور جانے اور واپسی کے اس نے پانچ ہزار روپے طلب کئے۔ لڑکی کا منگیتر انگلیوں پر حساب کرنے لگا۔ پانچ ہزار آنے جانے کے' تین چار ہزار ڈاکٹر کی فیس اور ہزار بارہ سو دواؤں کے۔

''اتنے پیسوں میں تو مجھے کوئی اور لڑکی مل جائے گی۔ اس کا کیا بھروسہ' راستے ہی میں مر جائے۔'' منگیتر نے فیصلہ سنایا۔

اتفاق سے فوج کا ایک میجر وہاں آیا ہوا تھا۔ اس نے لڑکی کو جیپ میں بٹھایا اور کھوکھراپار روانہ ہو گیا۔ وائرلیس پر اطلاع دی گئی کہ وہاں سے ڈاکٹر کو دوائیں اور انجیکشن دے کر گڈرو کی طرف روانہ کر دیا جائے۔ راستے میں جیپ اور ایمبولینس کا ملاپ ہوا۔ انجیکشن دیا گیا' زخم کو صاف کر کے مرہم پٹی کی گئی۔۔۔۔۔۔ ایک انسانی جان بچ گئی۔

دوسرے دن ہم نے صبح واپس روانہ ہونا تھا۔ تیار ہو کر ناشتے سے فارغ ہو کر باہر آئے تو پتہ چلا کہ کچھ مریض ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔

ہم سے کیوں؟

پتہ چلا کہ کل کے مریضوں میں یہ بات پھیل گئی ہے کہ ہم ''بڑے ڈاکٹر'' ہیں۔ ڈاکٹر صاحب جو مستقل کنسٹری فرماتے رہے تھے اور ہمیں ''سر'' کہہ کر خطاب کرتے تھے تو سمجھنے والوں نے یہی سمجھا کہ ہم بڑے ڈاکٹر ہیں جن کی ہدایات کی روشنی میں ''چھوٹا ڈاکٹر'' نسخہ لکھتا تھا۔ پہلے تو ہم نے وضاحت کرنا چاہی لیکن پھر سوچا' مفت میں ڈاکٹری مل رہی ہے' مریضوں کو دیکھنے میں کیا ہرج ہے۔ سمجھ میں آیا تو ٹھیک ورنہ ''چھوٹے ڈاکٹر'' کو ریفر کر دیں گے۔ ہم نے مریضوں کو پاس بلایا۔ ایک بوڑھے نے پیشاب میں جلن کی شکایت کی۔ اسے پیاس بھی بہت لگتی تھی۔ اس طرح کے ایک مریض کا علاج ہم سعودی عرب میں کر چکے تھے اور اس کا تفصیلی حال ''جنٹلمین اللہ اللہ'' میں لکھا ہے۔ وہی نسخہ بابا جی کو بتایا۔ ''کھانے کے آدھ پون گھنٹے بعد ایک گلاس پانی میں آدھا لیموں نچوڑ کر پیا کریں۔''

''لیموں۔۔۔۔۔۔ یہ کیا ہوتا ہے؟''

ہم نے ان کے ساتھ آنے والے نمبردار کو قریب بلایا اور اسے ترجمانی کے فرائض سونپے۔ لیموں کا نام سن کر وہ بھی ہنسنے لگا۔ ہم نے تعجب سے اسے دیکھا' بولا۔

''سر' لیموں تو ہمارے ملک میں نہیں ہوتا۔''

اس کے نزدیک ملک' ضلع قسم کی کوئی چیز تھا۔ اس کی جغرافیائی معلومات سے استفادے کے لیے ہم نے پوچھا۔

''اچھا تو کس ملک میں ہوتا ہے لیموں؟''

''وہ تو سندھ میں ملتا ہے۔''

اس کے نزدیک تھر' سندھ سے الگ ایک ملک تھا۔

''اچھا تو سندھ کا قریب ترین شہر کون سا ہے جہاں سے لیموں مل سکتا ہے؟''

''عمر کوٹ''

''اور عمر کوٹ سے لیموں منگائے جائیں تو کتنے کا پڑے گا؟''

نمبردار صاحب نے تھوڑی دیر حساب کتاب کیا اور بتایا کہ ایک لیموں تقریباً پندرہ روپے میں پڑے گا۔

بے چارہ بوڑھا اتنے مہنگے لیموں کہاں برداشت کر سکتا تھا۔ مفت دواؤں کے لیے ہم نے اسے ''چھوٹے ڈاکٹر'' کو ریفر کر دیا۔

ان مریضوں میں وہ لڑکی بھی شامل تھی جسے سانپ نے کاٹا تھا اور جس کی جان فوجیوں نے بچائی تھی۔ رنگین کپڑوں میں ملبوس' اپنی چنریا سے چہرے کو چھپائے وہ شرمائی لجائی ایک طرف کھڑی تھی۔ پاس بلایا' ایک بزرگ خاتون کے ساتھ ساتھ چلتی قریب آئی اور

خاموش کھڑی ہوگئی۔ پوچھا ”کیا حال ہے اب کیسی طبیعت ہے؟“ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں احساس تشکر کی نمی تیر رہی تھی بولی نہیں نظریں جھکا کر پیروں کے انگوٹھوں سے ریت کریدنے لگی۔

”سانپ نے کہاں کاٹا تھا؟“

اس نے پھر نظریں اٹھائیں اور وہ ہاتھ جس سے چنریا کا نقاب بنا کر چہرے کو چھپائے ہوئے تھی چھوڑ دیا نقاب گر گئی۔ اس کی آنکھوں کی نمی آنسو بن کر چھلکنے لگی تھی۔

”بھئی سانپ نے کہاں کاٹا تھا؟“ ہم نے پوچھا۔

وہ چنریا کا پلو مروڑتی رہی پیروں سے ریت کریدتی رہی۔ تب اس کی ماں نے اپنی زبان میں اسے کچھ کہا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو اس نے خود بڑھ کر اسے شانوں سے پکڑا اس کا رخ بدلا اور اس کی شلوار کا پائنچہ اونچا کر دیا۔ ایڑی سے ذرا اوپر پنڈلی پر دانتوں کے نشان تھے۔

”اب درد تو نہیں؟“

لڑکی نے رخ بدلا کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی۔ سرگوشی میں اپنی ماں سے کچھ کہا۔ ماں نے جل کر اسے ڈانٹ پلائی جیسے کہہ رہی ہو کہ خود بتاؤ ڈاکٹر صاحب کو۔ تب اس نے رکے رکے لہجے میں بات کرتے ہوئے اپنی کلائیاں دکھائیں چوڑیوں بھری کلائیوں کے درمیان سے جلد دکھانے کے لیے وہ چوڑیوں کو الگ الگ کرتی تھی اور ہم سوچتے تھے کہ جغرافیائی ماحول کا کلچر پر کتنا اثر ہوتا ہے۔ عرب علاقوں میں کھجوروں کی بہتات ہوتی ہے۔ ظہور اسلام کے بعد نکاح کے وقت کھجوروں سے مہمانوں کی تواضع ہوتی تھی اور یہی روایت برصغیر پاک و ہند بھی ابھی تک باقی ہے نکاح کے وقت چھواروں کی تقسیم کی صورت۔ صحرا میں سورج آگ برساتا ہے اور یہاں کی عورتیں بازوؤں تک چوڑیاں چڑھائے رکھتی ہیں۔ فیشن کا فیشن سورج کی کرنوں سے تحفظ اور کام کرنے میں رکاوٹ بھی نہیں ------ تو لڑکی اپنی کلائیاں دکھا کر بولی کہ جب سے اسے انجکشن لگا ہے اس کے بدن پر خشکی بہت ہے اور ہر وقت خارش ہوتی رہتی ہے۔ انجکشن کا خشکی سے کوئی تعلق نہیں تھا اس نے تو صرف سانپ کے زہر کو بے اثر کیا تھا۔ اسے بتایا کہ وہ روزانہ نہا کر سرسوں کا تیل مل لیا کرے اور کپڑے بدل لیا کرے۔ خشکی بھی ختم ہو جائے گی خارش بھی۔

”روز نہاؤں ------ روز کپڑے بدلوں؟“ اس نے حیرت سے پہلے ہمیں پھر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ اور ہمیں اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ جہاں پانی پینے کے لیے دن بھر بھاگ دوڑ کرنا پڑتی تھی وہاں روزانہ نہانے کا مشورہ حماقت ہی تھی نا۔

”اچھا ہفتے میں ایک آدھ بار نہا لیا کرو۔“ ہم نے رعایت دی۔

اس نے پھر ماں کی طرف دیکھا جیسے پوچھتی ہو کہ ہو جائے گا اتنے پانی کا انتظام۔ ماں نے پچکارتے ہوئے کچھ کہا لگا جیسے کہہ رہی ہو فکر نہ کر ہو جائے گا۔ اس نے شکریہ ادا کیا سلام کیا اور رخصت ہوگئی۔

ہم دوسرے مریضوں کی طرف متوجہ ہوئے لیکن جانے کیوں دھیان اسی میں پڑا رہا۔ اس کے سامنے ایک صحرا تھا اور ایک ٹیلہ تھا جس پر وہ چڑھتی تھی۔ ان دو کی نسبت جو اس کے ساتھ تھے وہ جوان تھی اور توانا تھی لیکن اس کی رفتار سست تھی۔ وہ ان دونوں کے پیچھے تھی اور بار بار اس کے قدم رکتے تھے اور وہ مڑ مڑ کر اپنے محسنوں کو دیکھتی تھی اور اس کے سامنے ایک ٹیلہ تھا اور اس کے بڑے پار اتر چکے تھے اور وہ ابھی تک ٹیلے کی بلندی پر تھی۔ اس نے آخری بار مڑ کر دیکھا۔ اس وقت عادتاً وہ اپنی چنریا کو ہاتھ میں لیے نقاب لیے ہوئی تھی۔ اچانک اس کا ہاتھ یوں گرا جیسے بے جان ہو گیا ہو اس میں چنریا تھامنے کی سکت نہ ہو۔ خدا حافظ کہنے کے انداز میں ہاتھ ہلایا اور ٹیلے کے پار اتر کر صحرا کی وسعتوں میں کھو گئی۔ اسے جو دوسری زندگی ملی تھی وہ بھی صحرا کے نام تھی۔

◆◆◆

گوشۂ ادب

نئی کتابوں کے لیے ایک نئی تجویز

آج کی تقریب کے منتظمین یقیناً یہ امید لگائے بیٹھے ہوں گے کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے میں ان کا شکریہ ادا کروں۔ اتنی خوبصورت تقریب منعقد کرنے پر انہیں مبارکباد کہوں اور جن مقررین نے میری کتابوں کے حوالے سے سچ سچ باتیں کہی ہیں اور جس خاتون نے منظوم خراج تحسین پیش کیا ہے' ان سب کو جھٹلاتے ہوئے یہ عرض کروں کہ بندہ تو اس قابل نہ تھا۔۔۔۔۔۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں اقبال خالد صاحب' مسز مقصود صاحبہ اور دیگر منتظمین کا قطعی شکر گزار نہیں ہوں اور اس کے لیے میرے پاس بڑے معقول دلائل ہیں۔ اس تقریب کے اہتمام پر میں ایک سخت الجھن کا شکار ہوں' ایک تشویش ہے جو مجھے لاحق ہے' ایک فکر ہے جو مجھ پر مسلط ہے' ایک اضطراب ہے جس میں میں مبتلا ہوں۔ میں اس کی تشریح کرتا ہوں اور آپ فیصلہ کیجئے کہ آیا میری تشویش اور اضطراب بجا ہے یا نہیں۔

جیسا کہ آپ نے پڑھا اور سنا ہے کہ یہ تقریب ایک قلمکار کے اعزاز میں برپا کی گئی ہے۔ میرے مشاہدے اور تجربے کی حد تک قلمکاروں کے اعزاز میں تقریبات صرف دو صورتوں میں منعقد ہوتی ہیں۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ قلمکار صاحب حیثیت ہو اور دوسری صورت یہ کہ وہ انتقال فرما جائے۔ صاحب حیثیت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اتنا با اثر ہو کہ اپنی لکھی ہوئی کتاب یا دیوان کے بارے میں دو چار ایسی ادیب نما شخصیتیں فراہم کر سکے جو سر عام یہ اعلان کریں کہ ایسی کتاب اس سے پہلے دنیائے ادب میں نمودار نہیں ہوئی۔ پھر کسی انجمن کے عہدیداروں سے مل کر تقریب رونمائی منعقد کرا سکے اور اتنا صاحب مال ہو کہ وہ ایسی تقریب پر اٹھنے والے اخراجات اپنے دائیں ہاتھ سے اس طرح ادا کرے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔

آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یہ تقریبات رونمائی زمانہ حال کا چسکا ہے۔ قیام پاکستان کے بہت بعد تک ایسی تقریبات کا سراغ نہیں ملتا۔ دراصل ہر انسان میں خودنمائی کا جذبہ موجود ہوتا ہے اور ہر ایک کو یہ شوق ہوتا ہے کہ وہ کسی تقریب کا مرکزی کردار ہو۔ معاشرے نے اس بات کا اہتمام کر رکھا ہے کہ ہر شخص کو کم از کم دو موقعے ایسے ضرور دیئے جائیں جب وہ کسی تقریب کا مرکزی کردار ہو۔ ایک موقع تو انسان کی شادی کا ہوتا ہے جب وہ بارات کا دولہا ہوتا ہے' دلہن کے لیے بھی یہی صورت ہوتی تھی لیکن بیوٹی پارلروں نے اس معاملے میں کافی گڑبڑ کر دی ہے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ دولہا یا دلہن کی اماں مرکزی کردار بن جاتی ہے۔

اور بہت سی باراتی خواتین بھی بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر آتی ہیں اور نکاح کے گواہوں کو پوچھنا پڑتا ہے کہ نکاح کے ہم کاروں کے لیے وہ کس سے رجوع کریں۔ شادی گھروں میں اس مسئلے کا حل یہ نکالا گیا ہے کہ ایک اسٹیج بنا دی جاتی ہے جس پر سجی سجائی دو کرسیاں رکھی جاتی ہیں۔ ایک دولہا کے لیے ایک دلہن کے لیے۔ اس انتظام کا نقصان یہ ہوا ہے کہ وہ دلہن جو سات پردوں میں اپنے سسرال پہنچتی تھی اور جسے دیکھنے کو زیر و زبر دھڑکنوں کے ساتھ دولہا بڑے اشتیاق سے گھونگھٹ اٹھاتا تھا' اب ''شمع محفل'' بن جاتی ہے اور اٹھنے والی نگاہوں کی تپش سے جھوٹی ہو کر گھر پہنچتی ہے۔ غیرت وحمیت کی بات ہے۔

حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

یہ سب جہالت کی علامتیں ہیں' اندھی تقلید کے فیشن۔۔۔۔۔۔۔ جب علم بڑھے گا' اسرار خودی آشکار ہوں گے' اپنی تہذیب کی رفعتوں سے آشنائی بڑھے گی تو یہ تہذیب آپ اپنے خنجر سے خودکشی کرے گی اور اچھے لوگ جان لیں گے کہ شرم وحیا ایمان کا حصہ ہے اور ایمان کھوئی جانے والی چیز نہیں ہے۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ انسان کے مرکزی کردار بننے کے دو موقعے ہوتے ہیں۔ ایک جب اس کی شادی ہوتی ہے اور دوسرا جب اس کا جنازہ اٹھتا ہے۔ یعنی ایک مرنے سے پہلے' دوسرا مرنے کے بعد۔ انتقال پر ملال کے بعد جو ''تقریبات'' ہوتی ہیں ان میں بھی مرکزی موضوع سخن' مرنے والے کی ذات گرامی ہی ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو راجہ مہدی علی خان کی زبان میں ایک ایسی تقریب کا حال۔۔۔۔۔۔

بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ
ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ
رضیہ! گرم ذرا چاول تو لانا
ذکیہ ذرا ٹھنڈا پانی پلانا
جمیلہ! مجھے روغنی نان دینا
وہ فرنی اٹھانا وہ پکوان دینا
جدائی میں اس کی ہوا دل دوانا
کہ لگتا ہے اچھا نہ پینا نہ کھانا
منگانا پلاؤ ذرا اور خالہ

بڑھانا ذرا قورمے کا پیالہ
جدھر دیکھتے ہیں ادھر غم ہی غم ہے
کریں اس کا جتنا بھی ماتم وہ کم ہے
پڑا ہے پلاؤ میں گھی ڈالڈے کا
خدا تو ہی حافظ ہے میرے گلے کا
دلہن سے کہو آہ اتنی نہ روئے
بیچاری نہ بیکار میں جان کھوئے
اری بوٹیاں تین سالن میں تیرے
یہ بچھڑا لکھا تھا مقدر میں میرے
بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ
ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ

دونوں قسم کی تقریبات پر اخراجات تقریباً یکساں اٹھتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں جنت یا جہنم مقدر کی بات ہے۔ دونوں صورتوں میں انسان کو چپ لگ جاتی ہے اور دونوں حالتوں میں اپنی حرکتوں اور آمدنی سے متعلق حساب کتاب دینا پڑتا ہے۔

ملی جو پہلی تنخواہ ریس میں ہاری
''گنوا کے آیا کہاں ہے مجھے جواب تو دے''
کہا یہ بیوی نے جل کر ''یہ کی ہے کس کی نذر
تو پیسے گر نہیں دیتا نہ دے حساب تو دے''

بات ہو رہی تھی ذوق نمود کی۔ اب کچھ لوگوں میں نمود و نمائش کی خواہش اتنی شدید ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں محض ایک تقریب سے مطمئن نہیں ہو پاتے بلکہ بار بار نگاہوں کا مرکز بننا چاہتے ہیں۔ شریعت نے ایسے فرد کے لیے چار مواقع کی گنجائش رکھی ہے لیکن عدل کی شرط کے ساتھ۔ جب عدل کو بھی جنگ وجدل کا سامنا ہو تو سہل ترین نسخہ یہ ہے کہ انسان ایک کتاب لکھے (یا لکھوائے) اور اس کی تقریب رونمائی کی آڑ میں خود نمائی کا اہتمام کرے۔ بعض لوگوں کے ہاں کتاب کی اشاعت سے زیادہ تقریب رونمائی کی فکر دامن

گیر رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کتاب کی اشاعت موخر اور تقریب رونمائی مقدم ہو جاتی ہے۔ آپ میں سے جن خواتین وحضرات کو تقریر کا ملکہ حاصل ہے اگر ان سے یہ درخواست کی جائے کہ وہ کسی کتاب کو دیکھے بغیر اس پر تقریر کریں تو وہ کیا کہیں گے؟

ان گناہگار آنکھوں کو ایک ایسی ہی تقریب دیکھنے کی سعادت حاصل ہے۔ تقریب مری کے ٹاؤن ہال میں منعقد ہوتا تھی۔ ہم مری سے کچھ دور کالج آف آرمی ایجوکیشن میں تعینات تھے۔ بہت دن پہلے سے یہ حال تھا کہ جب بھی مری آنا ہوتا' مصنف مال روڈ پر چہل قدمی کرتے ملتے اور یاد کرواتے کہ تقریب رونمائی فلاں دن ہو رہی ہے' ضرور تشریف لایئے گا۔ موسم گرما میں مال روڈ پر خاصی چہل پہل رہتی ہے۔ مصنف نے جانے کتنے ہزار افراد کو شرکت کی دعوت دی ہو گی۔ ان کی محنت رنگ لائی۔ وقت مقررہ پر ہم مری پہنچے تو ٹاؤن ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ صدارت ایک وفاقی وزیر نے کرنا تھی اور آزاد کشمیر کی ایک اہم شخصیت مہمان خصوصی تھے۔ اب یہ نہیں معلوم کہ سامعین سے بھرے ہوئے ہال میں ادب کے شیدائی کتنے تھے اور وفاقی وزیر اور کشمیر کی شخصیت سے درخواستوں پر دستخطوں کے طالب کتنے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ٹاؤن ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لیکن مصنف بڑی بے قراری کے عالم میں جنرل پوسٹ آفس کے سامنے ٹہل رہے تھے۔ جب کافی دیر تک تقریب شروع نہ ہوئی تو ہم صورت حال جاننے کے لیے نیچے آئے اور ان سے ان کے اضطراب کا سبب پوچھا۔ انہوں نے سڑک پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''سر! دعا کیجئے ۔۔۔۔۔۔ کتاب ابھی تک چھپ کر نہیں آئی۔ پبلشر نے وعدہ تو کیا تھا کہ وقت پر کتابیں لے کر پہنچ جائے گا' جانے کہاں مر گیا۔''

اب معلوم نہیں کہ یہ صاحب سادہ دل تھے کہ پبلشر کے وعدے پر اعتبار کر بیٹھے یا تقریب رونمائی کا شوق ان کے ہاں فروزاں تھا۔

اب ہوا یہ کہ صاحب صدر بھی تشریف لے آئے' مہمان خصوصی بھی پہنچ گئے' سامعین بھی موجود تھے اور مقررین بھی زور خطابت دکھانے کے لیے بے چین ۔۔۔۔۔۔ گویا سارے لوازمات پورے تھے۔ اب محض ایک چھوٹی سی کتاب کے نہ ہونے سے تو تقریب رونمائی رک نہیں سکتی تھی۔ ہم مبہوت ہو کر ان مقررین کو سن رہے تھے جو کتاب پڑھے بغیر نہیں' دیکھے بغیر ہی فصاحت و بلاغت کے دریا بہا رہے تھے۔ اس سے پہلے یہ تو دیکھا اور سنا تھا کہ لوگ کتاب کا دیباچہ یا فلیپ پڑھ کر ہی کتاب پر تبصرہ لکھ مارتے تھے لیکن کتاب دیکھے بغیر اس پر اچھی خاصی تقریر کر ڈالنا بڑی ہمت کا کام ہے۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

آپ یقیناً یہ جاننا چاہیں گے کہ آخر مقررین کہہ کیا رہے تھے۔ ملاحظہ فرمایئے ایک تقریر سے اقتباس:

''معزز سامعین! اگرچہ میں نے کتاب نہیں دیکھی لیکن میں مصنف کے قلم کی کاٹ سے بھی آگاہ ہوں اور ان کے خیالات کی روانی سے بھی واقف۔ وہ جب لکھتے ہیں تو دریاؤں کی روانی شرمندہ ہو جاتی ہے اور ہواؤں کی سرسراہٹ رک جاتی ہے۔ پہاڑوں کی بلندیاں سرنگوں ہو جاتی ہیں اور زمین کی وسعتیں ان کے احاطہ قلم میں آ کر سمٹ جاتی ہیں۔''

خواتین وحضرات! ایسی تقریر تو آپ کتاب کا نام جانے بغیر بھی کر سکتے ہیں لیکن اگر نام معلوم ہو جائے تو پھر مجبوری یہ آ پڑتی ہے کہ گفتگو موضوع سے متعلق ہو۔ ہم جس تقریب کا ذکر کر رہے ہیں اس میں جو کتاب موضوع سخن تھی وہ مری کی تاریخ سے متعلق تھی۔ ایک صاحب جو مصنف سے زیادہ مہمان خصوصی کا دل جیتنے کے چکر میں تھے' گویا ہوئے۔

''گرچہ میں نے یہ کتاب نہیں دیکھی لیکن مجھے یقین ہے کہ اس میں مہمان خصوصی کا ذکر ضرور ہو گا چونکہ ان کے بغیر یہ کتاب مکمل ہو نہیں سکتی۔ مہمان خصوصی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے جہاد کشمیر میں پہلی گولی چلائی۔ کشمیر کے پہاڑ مری سے صاف نظر آتے ہیں۔ میں جب بھی انہیں دیکھتا ہوں تو مہمان خصوصی کی پوری داستان حریت میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔''

ہم دل تھام کر یہ تقریریں سنتے رہے اور اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ دیکھیں مہمان خصوصی کیا کہتے ہیں کہ وہ حق کی خاطر لڑنے اور سچ کہنے کے لیے مشہور ہیں۔ آخر میں جب انہیں خطاب کی دعوت دی گئی تو کتاب کے بارے میں ذکر ان کے پہلے فقرے میں موجود تھا اور یوں انہوں نے کتاب کی تقریب رونمائی کا مہمان خصوصی ہونے کا حق ادا کر دیا۔ وہ فقرہ تھا۔ ''میں جب تاریخ مری کی تقریب رونمائی کے لیے آ رہا تھا تو ۔۔۔۔۔۔''

کتاب کے بارے میں مہمان خصوصی کے ارشادات عالی بس اسی فقرے تک محدود تھے۔ آپ جاننا چاہیں گے کہ ''تو'' کے بعد کیا ہوا تو دراصل یہاں ادبی تقریب کا اختتام ہوتا ہے اور آغاز ہوتا ہے ایسی کارروائی کا۔ مہمان خصوصی کا پورا فقرہ یوں تھا۔ ''میں جب تاریخ مری کی تقریب رونمائی کے لیے آ رہا تھا تو مجھے مال روڈ کے فلاں بیریئر پر روک لیا گیا اور باوجود اصرار کے میری گاڑی کو مال روڈ پر آنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ پاکستان میں میری نقل وحرکت پر اس طرح کی پابندی لگائی گئی ہے۔''

اب جاننے والے جانتے ہیں کہ موسم گرما میں مری کی مال روڈ پر لوگوں کا اتنا اژدحام ہوتا ہے کہ یہ ہر طرح کی ٹریفک کے لیے بند کر دی جاتی ہے۔ صرف ملک کے صدر اور وزیراعظم کی گاڑی مال پر جا سکتی ہے۔ تو جب آزاد کشمیر کی اس شخصیت نے بتایا کہ انہیں مال پر جانے سے روکا گیا تو درخواست گزاروں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگانے شروع کر دیئے اور آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کسی

صاحب نے مہمان خصوصی کو کندھوں پر اٹھالیا اور تمام سامعین ایک جلوس کی صورت اس بیریئر کی طرف روانہ ہوگئے جہاں گاڑی روکی گئی تھی۔ بیریئر پر موجود سرکاری اہلکاروں کو خبر ہوئی کہ ایک سیلاب بلاخیز ان کی طرف بڑھ رہا ہے تو کچھ فرار ہوگئے' کچھ نعرے لگاتے ہوئے جلوس میں شامل ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد بیریئر اٹھا کر اس کے پرخچے اڑا دیئے گئے۔ یوں ایک کتاب کی تقریب رونمائی ایک جلوس میں بدل گئی جسے ہم کتاب کا جلوس کہہ سکتے ہیں۔ جلسے سے جلوس تک کا یہ سفر تو ناگہانی تھا لیکن اس میں سبق ہے نئے مصنفین کے لیے کہ تقریبات رونمائی تو اب پرانی بات ہوگئی' آئندہ نئی کتابوں پر جلوس کا اہتمام ہونا چاہیے کہ لوگ روز روز کی رونمائیوں سے کافی اکتا گئے ہیں۔

ہماری اس بات کی تائید وہ تمام سامعین کریں گے جنہیں حال ہی میں کسی تقریب رونمائی میں شرکت کا حوصلہ ہوا ہو۔ ابھی چند روز پہلے ہمیں ایک ایسی تقریب میں شرکت کے لیے باصرار بلایا گیا جو ایک دو نہیں بلکہ پورے پانچ ادیبوں اور شاعروں کے اعزاز میں بہ یک وقت منعقد ہو رہی تھی۔ ایسی تقریبات چونکہ عام طور پر دیر سے شروع ہوتی ہیں اس لیے ہم ازراہ احتیاط ایک گھنٹہ تاخیر سے پہنچے۔ لیکن وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ لوگ ہم سے بھی زیادہ محتاط ہیں۔ تین سونشستوں کے ہال میں صرف تین افراد تھے۔ ایک مصنف' ایک صاحب صدر اور ایک اسٹیج سیکرٹری۔ ان کے آنے کی ترتیب ہمیں نہیں معلوم۔ ویسے اس دن خیال آیا کہ کسی سے تنہائی میں راز کی باتیں کرنی ہوں تو بہترین جگہ کسی ادبی انجمن کے زیراہتمام ہونے والی تقریب ہی ہے جہاں انسان مقررہ وقت پر پہنچ جائے تو خلوت کے دو تین گھنٹے بڑی آسانی سے میسر آسکتے ہیں۔ ہم جس تقریب کا ذکر کر رہے ہیں' وقت مقررہ سے دو گھنٹے بعد اس کا یہ حال تھا کہ جن کے اعزاز میں تقریب ہو رہی تھی' ان کے واقف کاروں' ادبی انجمن کے عہدیداروں اور وڈیو فلم بنانے والے کیمرہ مینوں سمیت کل افراد ہال میں لگی ہوئی ٹیوب لائٹوں کی تعداد سے بھی کم تھے اور ظاہر ہے کہ تقریب کے آغاز کے آثار دور دور تک ناپید تھے۔ اس سے زیادہ صبر ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ ہم مقررین کے ارشادات عالیہ سے مستفیض ہوئے بغیر ہی واپس آگئے۔ دوسرے دن بجائے اس کے کہ دو گھنٹے صبر کی داد ملتی' الٹی شکایات سننے کو ملیں کہ آپ ''جائے واردات'' سے فرار کیوں ہوگئے تھے۔ بس آپ گئے ہیں تو ہال بھر گیا اور اتنی زبردست تقریریں ہوئی کہ۔۔۔۔۔۔۔ کچھ نہ پوچھیں۔ ہم نے کچھ نہیں پوچھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے پوری روداد سنا ڈالی۔ اس دن کے بعد سے ادبی تقریبات میں جانا ہم نے اور بھی کم کر دیا ہے۔ ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ منتظمین کو پتہ چل گیا کہ اصل سامعین ہمارے جانے کے بعد آئیں گے تو کہیں وہ ہمیں اٹھا ہی نہ دیں۔

تو سامعین کرام! بات یہاں سے چلی تھی کہ میں اس تقریب کے منتظمین کا قطعاً شکر گزار نہیں ہوں اس لیے کہ ایک الجھن ہے جو دور نہیں ہو پا رہی۔ میں نے کہا کہ قلمکاروں کے اعزاز میں تقریب صرف دو ہی صورتوں میں منعقد ہوتی ہے۔ ایک صورت یہ کہ

مصنف ''صاحب حیثیت'' ہو اور دوسری صورت یہ کہ قلمکار انتقال فرما جائے۔ بحیثیت قوم ہمارا وطیرہ یہی ہے کہ سچے قلمکاروں کی قدر ہمیں ان کے مرنے کے بعد ہی آتی ہے۔ زندگی میں ہم ان کے ساتھ جو کچھ کرتے ہیں' آپ خود اس کے گواہ ہیں۔ بقول غالب:

ہے غنیمت کہ بامید گزر جائے گی عمر

نہ ملی داد مگر روز جزا ہے تو سہی

تو سامعین! اپنے ان تجربات اور مشاہدات کے پس منظر میں جب مجھے اقبال خالد صاحب کے پیامبر نے کارڈ لا کر دیا جس کے مطابق اس تقریب میں مجھے بطور مہمان خصوصی شرکت کرنا تھی تو میں نے خود سے سوال کیا کہ کیا تم صاحب حیثیت ہو۔۔۔۔۔۔ جواب نفی میں ملا۔ کچھ لوگ کرنیل ہونے کے ناتے شاید ہمارا شمار بھی صاحب حیثیت لوگوں میں کر گزریں لیکن وہ جو خبر رکھتے ہیں جانتے ہیں کہ ایک کرنل' صاحب حیثیت خاص حالات ہی میں ہو سکتا ہے۔ جب تک وہ بیرک کی زندگی تک محدود ہے' اس کا حکم صرف اپنے جوانوں پر چلتا ہے کہ خوش ہوئے تو چھٹی سے واپس آنے والوں کو پھر چھٹی بھیج دیا اور ناراض ہوئے تو سال بھر چھٹی کے انتظار میں بیٹھے جوانوں کی چھٹی مزید بند کر دی۔ کبھی جوش چڑھا تو ایک آدھ مورچہ کھود ڈالا' فائرنگ رینج پر جا کر تڑا تڑ گولیاں برسا دیں یا رسوں پر چڑھنا اترنا شروع کر دیا۔ صاحب حیثیت تو وہ تب بنتا ہے جب باجماعت شہر کا رخ کرے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب فوجی بیرک چھوڑ کر شہر آتے ہیں تو کن کرسیوں پر قابض ہوتے ہیں۔ تو ایسی صورت حال تو قطعاً موجود نہیں۔ تو پھر کیا ہم انتقال فرما چکے تھے۔ نبضیں ٹٹولیں' دھڑکنوں کو پرکھا اور جب یقین ہو گیا کہ سانسوں کی آمدورفت جاری ہے تو ایک حیرت نے مجھے آلیا اور یہ حیرت اب تک مجھ پر طاری ہے اور حیرتوں کے عالم میں انسان کو شکریے کے الفاظ کہاں سوجھتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ تو منتظمین سے معذرت کے ساتھ اسے کسی اور وقت کے لیے ملتوی کرتے ہیں۔ اس سے ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم کسی اور تقریب کے تمنائی ہیں۔ یقین جانیں ہمیں اس سامعین کی طلب ہے جو کتاب کا جلوس نکال دیں اور نہ ان سناٹوں اور ویرانیوں کی' جن میں بیٹھ کر سامعین کا انتظار کیا جائے۔ ہمیں وہ قارئین کافی ہیں جنہیں ہم جانتے تک نہیں' جنہیں دیکھا نہ سنا لیکن جن کی محبتیں ہمیں حاصل ہیں' جو شوق سے ہماری تحریروں کا انتظار کرتے ہیں اور بڑا رسک لے کر اپنی بچت کے پیسے کتاب کی خریداری پر یوں لٹا دیتے ہیں جیسے جوانی!

محبت میں لٹ جاتے ہیں دین و ایماں

بڑا تیر مارا' جوانی لٹا دی

(بہاولپور سے تبدیلی پر آرٹس کونسل کے زیراہتمام ہونے والی الوداعی تقریب میں پڑھا گیا مضمون)

◆◆◆

دلاور فگار کو پاک فوج کا سلیوٹ

دلاور فگار کو بجا طور پر شہنشاہ ظرافت کہا گیا ہے اور ان کے انتقال سے بلاشبہ طنز و مزاح کی راج دہانی ویران سنسان ہو کر رہ گئی ہے۔ مزاح لکھنا' وہ بھی شستہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مزاح اور پھکڑ پن میں بڑا نازک سا فرق ہے۔ جو اس فرق کو نہیں جانتے وہ حد ادب سے گزر کر بدتمیزی' بدگوئی بلکہ یاوہ گوئی' لاف زنی اور فحاشی کے دائروں میں داخل ہو جاتے ہیں لیکن انہیں خود احساس نہیں ہوتا کہ وہ کب اور کہاں غلط موڑ مڑ گئے۔ ادب اور خاص طور پر طنز و مزاح میں نفاست و شائستگی کا احساس سرمایہ ادب ہے اور یہ احساس وسیع مطالعے' گہرے مشاہدے' غور و خوض اور برسوں کی ریاضت سے پیدا ہوتا ہے۔

دلاور فگار ایک پڑھے لکھے آدمی تھے۔ معمولی نہیں بہت زیادہ پڑھے لکھے (آج وہ ہم میں موجود ہوتے تو میں قدرے بے باکی سے بیان کر سکتا کہ وہ اپنے چہرے بشرے سے جتنے سادہ اور کورے نظر آتے تھے' دراصل اس سے کہیں زیادہ پڑھے لکھے اور ذہین و فطین شخص تھے) اتنے بلند قامت شاعر کے بارے میں یہ جاننا کہ انہوں نے آگرہ یونیورسٹی سے اردو میں فرسٹ ڈویژن میں فرسٹ پوزیشن لے کر ایم اے کیا' شاید تعجب کا باعث نہ ہو لیکن یہ یقیناً حیرت کی بات ہے کہ اس یونیورسٹی سے انہوں نے معاشیات میں بھی ایم اے کیا اور انگریزی ادب کا پریویس (Previous) بھی مکمل کیا۔ بی اے تک انہوں نے فارسی بھی پڑھی تھی اور اس طرح انہیں چار زبانوں یعنی اردو' فارسی' انگریزی اور ہندی پر عبور حاصل تھا۔ فارسی میں مہارت کی بات میں محض اس بنا پر نہیں کر رہا کہ انہوں نے بی اے تک فارسی پڑھی تھی بلکہ اس کی ٹھوس شہادت موجود ہے۔ کہتے ہیں کسی زبان میں مہارت اور قادر الکلامی کا دعویٰ وہی کر سکتا ہے جو اس زبان کی شاعری اور گیت سمجھ سکے اور اس زبان میں گالیاں دے سکے۔ دلاور فگار نہ صرف فارسی شاعری سمجھتے ہیں بلکہ خود بھی فارسی میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور جہاں تک دوسری شرط کا تعلق ہے تو اپنے کلام میں وہ یہ شرط بھی پوری کرتے نظر آتے ہیں لیکن اسی نفاست اور شائستگی کے ساتھ جس کے بارے میں' میں نے پہلے عرض کیا کہ ان کے بغیر ادب ادب نہیں رہتا' بے ادبی' ابتذال اور پھکڑ پن میں شمار ہوتا ہے۔ دو شعر ملاحظہ فرمائیے۔

بھولتی جاتی ہے دنیا اب یہ قول مستند
عقل چوں پختہ شود انسان احمق می شود

فطرتاً احمق ہو جو انسان نہیں ہوتا وہ بد
اس سے اعلیٰ قسم کے احمق کو کہتے ہیں چغد

بال ڈانس کے بارے میں ایک بند:

اس رقص میں مذاق کی بھی ہو گئی تھی حد
عاشق دراز قد تھا تو معشوق پستہ قد
سر کو بصد نیاز جھکاتا تھا یہ چغد
تا بوسہ بر جبیں بت پستہ قد دہد

ایک اور شعر ہے:

حشر نزدیک آمدہ' امن و اماں از شہر رفت
شامت اعمال پبلک' صورت لیڈر گرفت

اساتذہ کے نزدیک تو عربی اور فارسی کے الفاظ میں بھی باہم اضافت جائز نہیں جو کہ اردو زباں کی امائیں ہیں لیکن دلاور فگار صاحب نے اس شعر میں انگریزی کی رفوگری اتنی نفاست سے کی ہے کہ کوئی استاد اس شعر کو مسترد نہیں کر سکتا۔ ہاں' اسے سند جواز دینے کے لیے اسے نئے دلائل ڈھونڈنا ہوں گے۔

انگریزی الفاظ انہوں نے اپنی شاعری میں بکثرت استعمال کئے ہیں اور انہیں دو تین طرح سے استعمال کرتے ہیں۔ کہیں ایسے جیسے کھانے میں نمک۔

ایک لڑکا ہے اصیل النسل عالی خاندان
عمر ہے لڑکے کی ففٹی سکسٹی کے درمیان
آنکھ کی اک شمع روشن' دوسری تھوڑی سی گل
مختصر یہ ہے کہ لڑکا ہے بہت ہی بیوٹی فل
یہ سلیقہ صرف ٹی اینڈ ٹی کو ہے مولیٰ کی دین
ایک فائل کو کیا اتنے برس تک مین ٹین

کہیں وہ انگریزی زبان کو ایسے استعمال کرتے ہیں جیسے کھچڑی میں گھی۔

اک یونیورسٹی میں کسی سوٹ پوش سے
میں نے کہا کہ آپ ہیں کیا کوئی سارجنٹ
کہنے لگے کہ آپ کو معلوم بھی نہیں
آئی ایم دی ہیڈ آف دی اردو ڈیپارٹمنٹ

اور کہیں ایسے جیسے دودھ میں پانی

دی نیشن ٹاکس ان اردو دی پیپل فائٹ ان اردو
ڈیئر ریڈرس ڈیٹ از وہائی آئی رائٹ ان اردو
نہ ہو جب ہارٹ ان دی چیسٹ پھر ٹنگ ان دی ماؤتھ کیوں
ٹو بیوٹی فل دس لائن تھرو سم لائٹ ان اردو
فگار ان دس غزل تیری زبان اردو ہو یا انگلش
مگر یو ہیو ٹائیڈ قافیے کیا ٹائٹ ان اردو

زبان پر قادرالکلامی نے ان کی شاعری کا کینوس (Canvass) بھی وسیع کر دیا ہے۔ کوئی ایسا موضوع نہیں جو ان کی زد بلکہ فوجی اصطلاح میں کہیے تو مہلک زد یعنی Effective Killing Range سے باہر ہو۔ شہری مسائل تو طنز و مزاح کے عام موضوعات ہیں۔ ان کے ہاں بھی "گھی کا قحط" ہے' دودھ کا مسئلہ ہے' ملاوٹ ہے اور "کراچی کے قبرستان" کی تصویر کشی۔

ایک ہی تابوت ہو گا اور مردے آٹھ دس
آپ اسے تابوت کہیے یا پرائیویٹ بس
ایک ہی تربت میں سو جائیں گے محمود و ایاز
دور ہو جائے گا فرق بندہ و بندہ نواز
شاعر مرحوم جب زیر مزار آ جائے گا
دوسرے مردوں کو ہیبت سے بخار آ جائے گا

چینی کی نایابی کے بارے میں انہوں نے کہا۔

کوئی تو صورت امید اب نظر آ جائے
خدا کرے مجھے پیشاب میں شکر آ جائے

غرض شہری مسائل تو ان کے موضوعات ہیں ہی' وہ قومی و بین الاقوامی معاملات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس کے لیے باقاعدگی سے اخبار پڑھتے ہیں۔ (واقعہ ارتحال کے دن بھی وہ گھر سے اخبار لینے ہی نکلے تھے) وہ اخبارات کو سرسری نگاہ سے نہیں پڑھتے۔ ان کی نظر کبھی یہاں رکتی ہے' کبھی وہاں۔ اخبارات میں بکھرے ہوئے متنوع مضامین انہیں دعوت سخن دیتے ہیں اور وہ ایسے ایسے موضوعات پر طبع آزمائی کرتے یں جو شاعری کے لیے نرالے اور عام شاعروں کے لیے بہت مشکل ہیں۔ بنگلہ دیش کے صدر زیر عتاب آئیں' امریکہ میں گنجے پن کا علاج دریافت ہو' کویت میں تیل کے کنوؤں میں آگ لگ جائے یا آسمان پر دمدار ستارہ نظر آئے' دلاور فگار صاحب کے ذہن میں پھلجڑیاں چھوٹتی رہتی ہیں۔

دمدار ستارہ جو نمودار ہوا ہے
جن کو نئے قسم کا آزار ہوا ہے
بانٹ آیا غریبوں کو جو کچھ گھر میں تھی کوکین
اب آٹھ پہر پڑھتا ہے بس سورۂ یٰسین
اب محو عبادت ہے یہ کردار کا غازی
دمدار ستارے نے بنایا ہے نمازی

علامہ اقبال کے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" کی بہت سی پیروڈیز لکھی گئی ہیں۔ دلاور فگار نے بھی کے ڈی اے سے شکوہ کیا ہے۔

کون کہتا ہے کہ نیچر ہے کراچی میں بخیل
کون کہتا ہے کہ قدرت کے وسائل ہیں قلیل
اک طرف بحر عرب' دوسری جانب اک جھیل
پھر بھی پانی کی یہاں رہتی ہے اکثر تعطیل
کے ڈی اے کچھ تو بتا کیوں یہ ستم رانی ہے
تو مسلمان ہے' یہ انداز مسلمانی ہے

جوابِ شکوہ کا ایک بند۔۔۔۔۔۔۔

ہم سے تم لوگ جو پانی کا گلہ کرتے ہو
یہ بھی سوچا کہ کبھی ٹیکس ادا کرتے ہو
بے وفا ہم ہیں کہ تم خون وفا کرتے ہو
تم سے کوئی نہیں کہتا کہ یہ کیا کرتے ہو
روڈ کے ٹل پہ بھی تم قبضہ جما لیتے ہو
کیسے شہری ہو کہ ٹونٹی بھی چرا لیتے ہو

دلاور فگار زرخیز ذہن کے مالک تھے۔ اخبارات اور مشاہدہ ہی انہیں موضوعات فراہم نہیں کرتا بلکہ وہ ذہن کے گوشوں سے اتنی دور کی کوڑی لاتے ہیں کہ عام شاعران کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ''سہرے میں مرثیہ' مرثیے میں سہرا'' ''چاند پر مشاعرہ'' اور ''ہکلے کا پیار'' جیسی نظمیں ان کے زرخیز ذہن کا شہکار ہیں۔ دلاور فگار ادب برائے ادب کے قائل نہیں تھے۔ زندگی کے بارے میں ان کا ایک خاص نظریہ تھا۔ ''مطلع عرض ہے'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

''میرا نظریہ اسلامی و آفاقی ہے کیونکہ اسلام خود ایک آفاقی مذہب ہے۔ ادب اور اس کی انسانی اور آفاقی قدریں مجھے عزیز ہیں...... سرورِ کائنات سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھے عشق ہے۔ میں دیگر مذاہب کے پیغمبروں اور بزرگوں کا بھی احترام کرتا ہوں اور قرآن مجید کے ساتھ ان صحیفوں پر بھی میرا ایمان ہے جو اور قوموں پر نازل ہوئے ہیں۔''

''خدا جھوٹ نہ بلوائے'' کے آغاز میں ایک انٹرویو شامل ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ ان کا پسندیدہ ٹی وی پروگرام کون سا ہے تو بولے۔ ''ادبی مجلہ یا جنگی معرکوں میں شہدائے افواجِ پاکستان کی جانبازی اور شجاعت پر مبنی فلمیں۔''

مسلح افواج سے ان کا تعلق صرف پسندیدگی کی حد تک نہیں تھا بلکہ انہوں نے ''نشانِ حیدر'' حاصل کرنے والے تمام جانبازوں پر نظمیں بھی لکھیں جنہیں جی ایچ کیو نے ''صلہ شہید کیا ہے'' کے نام سے بڑے اہتمام سے چھپوایا۔ اس دیوان کے مختصر سے دیباچے میں انہوں نے اپنی نظموں کو ''قلم کا قرض'' قرار دیا۔

میں ان کے اس قرض کو قرضِ حسنہ سمجھتا ہوں اور مسلح افواج پاکستان کی طرف سے انہیں سلیوٹ کرتا ہوں اور بات انہی کے ان شعروں پر ختم کرتا ہوں۔

حسن پہ اعتبار حد کر دی
آپ نے بھی فگار حد کر دی
گھر سے بھاگے تو کوئی بات نہیں
زندگی سے فرار حد کر دی

◆◆◆

(فروری ۱۹۹۸ء میں سوک سنٹر کراچی میں دلاور فگار کے اعزاز میں منعقد ہونے والے تعزیتی اجتماع میں پڑھا گیا)

جمال سے کمال تک

بظاہر ریڈیو کا تعلق صداکاری سے ہے اور ریڈیو پاکستان کے حوالے سے بلاشبہ بہت سی صدائیں ایسی ہیں جو امر ہو چکی ہیں۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پہلی ساعت' ستائیسویں رمضان کی مقدس شب' اسلامیان برصغیر نے اپنے خوابوں کی تعبیر کا پہلا اعلان مصطفیٰ علی ہمدانی کی آواز میں ہوا کی لہروں پر ہی سنا۔ ''یہ ریڈیو پاکستان ہے۔''

اور جب پاکستان اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا تو سماعت کے محاذ پر ایک توانا آواز تھی جو دلوں کی دھڑکنوں کو عزم نو عطا کرتی تھی' اب آپ شکیل احمد سے خبریں سنیے۔ ان دنوں رات کے اندھیروں میں ''تلقین شاہ'' دلوں کو گدگداتا تھا اور خوف کے سائے دور بھاگتے تھے اور پھر وہ آواز جو ادھوری رہ گئی۔ ''اس وقت مغربی پاکستان میں دن کے سات اور مشرقی پاکستان میں آٹھ بجے ہیں۔''

تو ریڈیو کا بظاہر تعلق تو صداکاری سے ہے لیکن صدائیں ہوا کے دوش پر سوار ہونے سے پہلے ضبط تحریر میں آتی ہیں اور یوں قلم کاری کا مرحلہ پہلے آتا اور ریڈیو پاکستان نے ہمیشہ ہمیں اچھے قلمکار دیئے ہیں۔ ریڈیو پاکستان کے پہلے ڈائریکٹر جنرل نے قلمکاری کے ذریعے طنز و مزاح میں جو مقام پیدا کیا وہ لاثانی ہے۔ ٹیلیویژن کے پاکستان میں متعارف ہونے پر شروع شروع میں تمام لکھنے والے صداکار اور اداکار وہی تھے جو پہلے ریڈیو سے منسلک تھے۔ ریڈیو پاکستان کی نئی پیشکش جمال حیدر صدیق ہیں۔

ہمیں ریڈیو پاکستان کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے موصوف کو چترال جیسے علاقے میں تعینات کیا۔ ریڈیو سے وابستہ ہونے سے پہلے جمال' مسلح افواج کے ترجمان ہفت روزہ ''ہلال'' میں رہے ہیں اور بلاشبہ وہاں ان کے قیام کی یادیں خوشگوار بھی ہیں دل آرام بھی کہ وہ فعال کارکنوں میں تھے۔ انہیں کوئی ذمہ داری سونپنے کی نوبت نہیں آتی تھی کہ وہ بڑھ کر جام اٹھانے والوں میں سے تھے۔ تیشہ قلم چلانے کی مشقت کے عادی تو گویا پہلے سے تھے لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی طبیعت میں جلال اور قلم میں کمال چترال پہنچ کر ہی آیا۔ مناظر فطرت کے حسن اور وہاں کے عوام کی معصومیت نے شاید مہمیز کا کام کیا اور صاحب جمال شخص صاحب کمال ہوگیا۔ سبحان اللہ!

جمال صاحب نے خود بھی کتاب کی وجہ نزول بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''اسلام آباد سے چترال آنے کے چند روز بعد ایک بے تکلف دوست نے اپنے خط میں لکھا کہ میدانی علاقوں کے رہنے والوں پر پہاڑی علاقوں کا بہت قرض ہے' اس قرض کو کچھ کم کرنے کی

کوشش کرو۔ میں نے یہ کوشش یقیناً کی لیکن جب دو سال بعد واپسی کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ میں مزید مقروض ہو چکا ہوں۔ محبتوں کا یہ قرض چکانے کی کوششیں جاری رکھوں گا۔'' (صفحہ ۲۵۵)

''وادی چترال'' کو قرضوں کی ادائیگی کی پہلی قسط کہنا چاہیے لیکن آج کل تو ''قرض اتارو' ملک سنوارو'' کا موسم ہے۔ جمال صاحب دوسری قسط کی جلد ادائیگی کا اہتمام کریں کہ یہ وقت کی ضرورت بھی ہے' موسم کا تقاضا بھی۔

''وادی چترال'' پڑھ کر پہلی خوشگوار حیرت تو یہ ہوتی ہے کہ جمال حیدر صدیقی کو زبان و بیان پر مکمل عبور حاصل ہے۔ آج کل ایسے ایسے خواتین و حضرات بھی مصنفین کی صفوں میں شامل ہیں جنہیں شعر کے وزن سے واقفیت ہے نہ کسی محاورے کے برمحل استعمال سے۔۔۔۔۔۔۔ لیکن دولت کی ریل پیل یا پبلک ریلیشنگ کے زور پر نہ صرف وہ مصنف بن جاتے ہیں بلکہ ان کی تعارفی تقریبات بھی بڑے دھوم دھڑکے سے فائیو سٹار ہوٹلوں میں منعقد ہوتی ہیں۔ اتفاق کی بات کہ جمال حیدر صدیقی کی کتاب ہاتھ لگنے سے پہلے مجھے ایسی دو کتابیں پڑھنے اور تعارفی تقریب میں شامل ہونے کے عذاب سے گزرنا پڑا۔ طبیعت میں سخت انقباض تھا جب جمال صاحب کی کتاب ہاتھ آئی اور تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ گزشتہ دنوں اتفاق سے کراچی سے پنڈی جانا ہوا' آئی ایس پی آر ۔۔۔۔۔۔ ہلال کے ایڈیٹر ممتاز اقبال ملک سے ملنے ان کے دفتر گئے۔ خود غائب تھے ان کی میز پر کاغذوں کے پلندے تھے اور کتابوں کے ڈھیر۔ بہت سے سادہ دل مصنفین کو یہ خوش فہمی رہتی ہے کہ ملک صاحب ان کی کتاب پڑھ کر تبصرہ اپنے رسالے میں چھپوائیں گے۔ غالباً جمال صاحب بھی اسی خوش فہمی میں یہ کتاب ملک صاحب کو پیش کر گئے تھے۔ ہم نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا تو پہلی نظر میں اچھی لگی۔ ابھی اسے ''پار'' کرنے کی ترکیب پر دماغ سوزی کر رہے تھے کہ ملک صاحب دندناتے ہوئے اپنے دفتر میں آن براجے۔ ہم نے براہ راست ان سے طلب کر لی۔ تو پھر جیسے طوفان کا سامنا ہو تو ملاح کشتی کا بوجھ اتارا کرتے ہیں' ملک صاحب نے اپنی میز پر بڑھتی ہوئی کتابوں کے انبار کو نگاہ غلط انداز سے دیکھا اور ''مال مفت دل بے رحم'' پر عمل کرتے ہوئے کتاب ہمیں بخش دی لیکن ساتھ یہ شرط لگا دی کہ اس پر تبصرہ لکھئے گا۔ جب کسی کتاب پر تبصرہ لکھنا ہو تو وہ سلیبس کی کتابوں کی طرح خشک لگنے لگتی ہے اور ایک اچھے طالب علم کی طرح ہم نے بھی سلیبس کی کتابوں میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ گریجویشن میں ہمارا ایک مضمون جغرافیہ بھی تھا جو عام طور پر ایک خشک مضمون سمجھا جاتا ہے لیکن خوش قسمتی سے ہمیں ایک اچھے استاد مل گئے تھے جن کے حسن بیان نے اس مضمون میں ایسی دلچسپی پیدا کی جو ابھی تک برقرار ہے۔ جمال حیدر کی کتاب سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی کہ انہوں نے نہ صرف بھولے ہوئے سبق یاد کروا دیئے بلکہ بہت سی خالی جگہیں بھی پر کر دیں۔

ان کی تحریر میں شگفتگی بھی ہے اور سلاست بھی۔ بات سے بات نکلتی ہے۔ قاری ان کی تحریر میں ڈوبتا چلا جاتا ہے اور اسے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ جمال صاحب اس کا ہاتھ پکڑے اسے دنیا کی بلند ترین چوٹیوں' بلند ترین میدانوں اور حسین ترین وادیوں کی طرف لیے جا رہے ہیں۔

کوہ ہندوکش پاکستان کے شمال میں پھیلے ہوئے تین سلسلوں میں سے ایک کا نام ہے۔ یہاں چوٹیوں کی عام بلندی بیس ہزار فٹ سے زیادہ ہے اور ان میں ۱۳۵ ایسی ہیں جو ۲۴ ہزار فٹ سے بھی زیادہ ہیں۔ بلند ترین چوٹی ترچ میر ہے جس کی بلندی ۲۵۲۳۰ فٹ ہے۔ اسی سلسلے کے جنوب میں چترال واقع ہے جو رقبے کے لحاظ سے صوبہ سرحد کا سب سے بڑا ضلع اور صوبے کے پانچویں حصے کے برابر ہے۔

جمال حیدر کا کمال یہ ہے کہ وہ مارگلہ کی پہاڑیوں سے اڑتے ہیں تو ترچ میر کی بلند ترین چوٹی تک پہنچتے پہنچتے راستے کے سارے منظر' نشیب و فراز' رسم و رواج اور لوگوں کی حرکات و سکنات بڑی تفصیلات سے بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ پھلوں اور کھانوں کا ذکر تو وہ اتنے لذیذ انداز میں کرتے ہیں کہ رال بہنے لگتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''چترال کے انگور کے شیرے کو آٹے کے ساتھ گوندھ کر اس میں اخروٹ اور دوسرا میوہ شامل کر کے روٹی بھی پکائی جاتی ہے۔ یہ روٹی جسے مقامی زبان میں ''کیلادو'' کہتے ہیں بڑے اہتمام سے پکائی جاتی ہے اور مہمانوں کو پیش کی جاتی ہے۔'' (صفحہ ۸۱)

(کاش جمال صاحب یہ بھی بتاتے کہ چترال میں مہمان بن کر نازل ہونے کا آسان ترین نسخہ کیا ہے)

انہوں نے پھلوں اور کھانوں کا ایک الگ باب باندھا ہے۔ بتاتے ہیں کہ وادی چترال میں ۱۵۰ اقسام کا سیب ہوتا ہے۔ ۲۴ قسم کے انگور پیدا ہوتے ہیں۔ بعض انگوروں کا دانہ اخروٹ سے بھی بڑا اور خوشہ ایک فٹ کا ہوتا ہے۔ تاک انگور میں جانے اتنے ذائقے ہوتے ہیں یا نہیں لیکن جمال صاحب نے جو سماں باندھا ہے اس کے مطابق تو چترال میں دختر رز کے سلسلے دراز ہونے چاہئیں۔ تو ذکر میووں کا ہو رہا تھا' بتاتے ہیں وہاں ۲۲ قسم کی خوبانی' ۲۰ قسم کی ناشپاتی' دس قسم کا توت اور پانچ قسم کے انار ہوتے ہیں۔ سیبوں' انگوروں اور خوبانیوں سے روٹی بھی تیار کی جاتی ہے۔ چترال میں روٹی کی کم و بیش ۱۵۰ اقسام بتائی جاتی ہیں۔ سب اقسام کے الگ الگ نام اور پکانے کے الگ الگ طریقے ہیں۔ اسی طرح پھلوں' خشک میووں اور دودھ کی مختلف اشیاء شامل کر کے طرح طرح سے روٹی اور پراٹھے بنائے جاتے ہیں۔ ہماری تجویز ہے کہ ''وادی چترال'' کا یہ باب ہوم اکنامکس کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ اتنے بہت سے پھلوں اور کھانوں کو تو محض چکھنے کے لیے بھی ایک عمر دراز چاہیے اور یہاں حال یہ ہے کہ

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

ان سے لطف اندوز ہونے کا شارٹ کٹ تو یہی نظر آتا ہے کہ ریڈیو پاکستان میں ملازمت کی جائے یا بڈا لک بنا جائے۔ بڈالک وہ خوش قسمت نوجوان ہوتا ہے جسے موسم گرما کے آغاز میں منتخب کر کے مویشیوں کے ساتھ پہاڑوں پر بھیجا جاتا ہے۔ اس نوجوان کو اعلیٰ ترین خوراک فراہم کی جاتی ہے۔ جتنا عرصہ یہ منتخب نوجوان اس علاقے میں رہتا ہے' اتنے عرصے اس علاقے سے کسی بھی خاتون کا گزر ممنوع قرار پاتا ہے چاہے وہ خاتون اس نوجوان کی ماں ہی کیوں نہ ہو۔ (صفحہ ۲۹۹)

کالاش (کافرستان) کے بارے میں بہت سی داستانیں مشہور ہیں اور جمال صاحب نے بالکل درست کہا کہ بیشتر کہانیاں بیان کرنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے وادی کالاش تو کجا چترال کا رخ بھی نہیں کیا ہوتا۔ جمال صاحب کو وہاں رہنے کا موقع ملا اور خوب ملا۔ تحقیق و جستجو کے بعد انہوں نے درست معلومات فراہم کی ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں اور اس کے لیے آپ کو اصل کتاب سے رجوع کرنا ہوگا۔ وادی کالاش پر جمال صاحب نے ۱۹ ابواب تحریر کئے ہیں اور کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس پر سیر حاصل گفتگو نہ کی ہو۔

ڈھائی سو صفحوں کی یہ کتاب چترال کے جغرافیائی خدوخال' تاریخی پس منظر' لوگوں کے تصورات و توہمات' جنگلی حیات' آثار قدیمہ سے لے کر عام بول چال کے الفاظ' لوک داستانوں' چترال سکاؤٹس غرض چترال سے متعلق ہر پہلو کا کماحقہ احاطہ کرتی ہے۔

اسے پی پی اے پبلی کیشنز اسلام آباد نے شائع کیا ہے اور یہ دو سو روپے میں دستیاب ہے۔

جو لوگ خود خریدنے کی زحمت گوارا نہ کر سکیں لیکن کتابوں کے شیدائی ہوں وہ اپنے آس پاس کی لائبریریوں سے رابطہ کریں اور انتظامیہ کو بتائیں کہ اس کتاب کے بغیر ان کی لائبریری ادھوری ہے۔

◆◆◆

آٹھ بج گئے جناب

صاحبو!

فوجی زندگی ایک الگ زندگی ہے۔ اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ الگ زندگی ہے تو اس سے ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ فوجی حضرات ناک کی بجائے کانوں سے سانس لیتے ہیں یا کانوں کی بجائے شانوں سے سنتے ہیں' جی نہیں ۔۔۔۔۔۔ زندگی کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے وہ انہیں حواس خمسہ سے کام لیتے ہیں جن سے عام انسان۔ لیکن ان کے حواس خمسہ جس ماحول میں کام کرتے ہیں وہ یقیناً عام آدمیوں کی زندگی سے مختلف ہوتا ہے اور اس جسم ناتواں کو فوجی مشقتوں کی جس کٹھالی سے گزرنا پڑتا ہے اس سے عام آدمی کو یقیناً واسطہ نہیں پڑتا۔ عام آدمی کے لیے یہ تفصیلات جاننا ایک خوشگوار تجربہ ہے۔ بری فوج کے بارے میں تو کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں البتہ پاک فضائیہ اور پاک بحریہ کے بارے میں ابھی تک کوئی مبسوط تحریر سامنے نہیں آئی تھی۔

لیفٹیننٹ ارشد محمود مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بحری زندگی کے مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھایا اور بحریہ کے شب و روز پر ایک مفصل کتاب لکھی۔ ''آٹھ بج گئے جناب''

ابتدائی زندگی کی کہانی ہے ۔۔۔۔۔۔ اس کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب انہوں نے نیوی میں شمولیت کا اشتہار اخبار میں دیکھا اور انجام' جب چار سال کی تربیت کے بعد وہ کمیشن لے کر سب لیفٹیننٹ بن گئے۔ درمیان کی پوری کہانی آپ بیتی کی شکل میں جگ بیتی ہے کہ نیوی میں کمیشن حاصل کرنے والے تمام حضرات کو کم و بیش انہی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس دوران بحری زندگی کے واقعات دلچسپ پیرایے میں بیان کیے گئے ہیں۔

''نیوی میں آنے کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ تیراکی سیکھ لی اور شناوری سیکھنے کے مرحلے کیسے طے ہوئے' انہیں صحیح طور پر جاننے کے لیے آپ سوئمنگ پول میں اتر کر دیکھ سکتے ہیں۔ کئی بار چیف صاحبان جو ہمیں تیراکی سکھانے پر مامور تھے (اصل متن میں معمور لکھا ہے جو غلط ہے) کو سمجھایا کہ چیف صاحب' سنا ہے تیراک ہی ڈوبتا ہے تو ہم ایسے ہی بھلے لیکن ہماری کون سنتا تھا۔ سمندر کے پانی سے بھرے ہوئے پول میں غوطے پر غوطہ...... پھر ذرا سا منہ کھولا تو سیروں پانی نظام ہضم میں مداخلت کرتے ہوئے معدے کی صفائی کرنے پہنچ جاتا۔ سیلنگ بوٹس (Sailing Boats) پر طویل سفر کا تجربہ یادگار' دلچسپ اور خطرناک ہوتا ہے۔ سمندری بپھری ہوئی

لہریں اور کھلونے کی طرح ڈولتی کشتی۔ بس یہی احساس ہوتا ہے' اب گئے کہ اب گئے۔ کبھی لہروں کے فراز پر ہوں تو لگتا ہے پہاڑ کی چوٹی پر موجود ہیں اور کبھی نشیب میں آ جائیں تو لگتا ہے کشتی درمیان میں رکھ کر چاروں طرف لہروں کی دیواریں چن دی ہوں۔ (صفحہ ۶۰۔۶۱)

یوں تو ملاح کی زندگی سفر سے عبارت ہے۔ اسے دیس دیس گھومنے اور ملک ملک دیکھنے کے وافر مواقع میسر آتے ہیں لیکن ارشد اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ابھی وہ مڈشپ مین ہی تھے کہ انہیں آسٹریلیا کی دو سو سالہ تقریبات میں شرکت کے لیے سڈنی جانے کا موقع ملا اور راستے میں ملائشیا' تھائی لینڈ اور انڈونیشیا کی بندرگاہوں پر قیام بھی ہوا۔ ان دنوں آتش جوان بلکہ نوجوان تھا اس لیے اس نے اس سفر سے خوب لطف اٹھایا۔ لکھتے ہیں۔ ''نیل آرمسٹرانگ بھی چاند پر پہلا قدم رکھ کر اتنا ہی خوش ہوا ہوگا جتنا کہ میں ملائشیا کی سرزمین پر پہلا قدم رکھ کر خوش تھا۔'' (صفحہ ۷۴)

اور پھر جو حادثات جوانی میں رونما ہوتے ہیں ارشد کے ساتھ آخر کیوں نہ ہوتے۔

''ملائشیا میں ایک اور بات ہمارے لیے تحیر کن (حیران کن ہونا چاہیے تھا) اور خوش کن تھی وہ تھی ہمارے ہم عہدہ خواتین کی موجودگی۔ نیوی کا سفید ڈریس پہنے ہوئے خواتین افسروں کو دیکھ کر نگاہوں میں تازگی اور ماحول میں مزید اجلے پن کا احساس ہوتا تھا۔ پاکستان بحریہ میں صنف نازک صرف میڈیکل کے شعبے میں پائی جاتی ہیں' اگر جہازوں میں ان کا وجود ہوتا تو ملاحوں کو گھر کے کھانے کا مزہ جہاز میں ہی مل جاتا۔'' (صفحہ ۷۵)

ارشد صاحب کو شاید احساس نہ ہو کہ ان کی اس تحریر کے کتنے خطرناک نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ کھانے کے حوالے سے انہوں نے صنف نازک کے بارے میں محض باورچن یا خانساماں کا تصور باندھا ہے اور اس حرکت سے انہوں نے اپنا ذاتی مستقبل خاصا محدود' تاریک بلکہ دھواں دھار کر لیا ہے اور گھر کے حوالے سے انہوں نے ایک طرح سے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ اگر پاک بحریہ کے جہازوں میں خواتین کی نمائندگی دی گئی تو جہاز کے وہ کیبن کہ جن میں ایک عام صحت مند آدمی انگڑائی بھی نہیں لے سکتا' حجلہ ہائے عروسی میں تبدیل ہو جائیں گے۔ آخر گھر تو گھر والی ہی سے ہوتا ہے اور گھر کے کھانے پکنے کی نوبت تو تبھی آ سکتی ہے تا جب انسان گھر بسانے کے اس عمل سے گزر چکا ہو۔ افتخار عارف نے غالباً اس کرب سے گزرتے ہوئے کہا تھا۔

میرے مولا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

مصنف نے پوری کتاب میں صنف نازک کے بارے میں جو مودب پیرایہ اور نیاز مندانہ رویہ اختیار کیا ہے اور سفید یونیفارم میں ملبوس خواتین کی موجودگی کو ماحول میں اجلے پن سے تعبیر کیا ہے' اس کے پیش نظر عین ممکن یہی ہے کہ خواتین کو پاک بحریہ میں نمائندگی دے دی جائے تو ارشد صاحب ان کے سامنے چلمیں بھرتے ہی نظر آئیں گے۔ امور خانہ داری انہیں خود سنبھالنے پڑیں گے کہ بھاڑ جھونکنے کے عمل میں خواتین افسران کی دیدہ زیب وردیاں ہی میلی ہونے کا خطرہ ہوا تو "نگاہوں میں تازگی اور ماحول میں مزید اجلے پن کے احساس" کا کیا ہوگا۔

اس بات کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ امریکہ اور برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ممالک میں بھی بحری جہازوں پر خواتین کی موجودگی کا تجربہ کامیاب نہیں ہوسکا۔ گزشتہ چند مہینوں میں "نیوز ویک" اور "ٹائم" میں مسلسل ایسے مضامین شائع ہوئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بحری جہازوں پر کام کرنے والی خواتین کی اکثریت جہاز کے ساحل سے روانگی کے بعد خود کو غیر محفوظ اور مرد اہلکاروں کے ہاتھوں بے بس محسوس کرتی ہیں۔

آیئے ہم ارشد کے ساتھ سڈنی چلتے ہیں۔ ارشد صاحب جہاز سے اترتے ہیں اور اپنے ایک ساتھی کے ساتھ بندرگاہ سے باہر آتے ہیں اور ایک نیگرو سے لفٹ لے کر شہر کے ایک بارونق حصے کنگز کراس میں آ جاتے ہیں۔ انہیں یہاں آ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ تو کسی ایسی جگہ آ گئے ہیں جہاں دن اور راتیں یکساں جاگتی ہیں۔ لکھتے ہیں۔ "کنگز کراس کا اصل رخ محسوس کرتے ہی ہم باقی سیر ملتوی کر کے جہاز پر واپس آ گئے۔" کیا بچگانہ حرکت ہے۔

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

خیر یہ تو چند جملہ ہائے معترضہ تھے۔ ارشد نے بحری سفر کی تمام روایات اور تفصیلات مزے لے لے کر بیان کی ہی اور ان کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایک جگہ بتاتے ہیں کہ کسی بھی بحریہ کا کوئی جہاز جب خط استوا عبور کرتا ہے تو روایتی طور پر مختلف تقریبات اور ایک عدالت منعقد کی جاتی ہے جس کا مقصد محض تفریح طبع ہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کنگ نیپچون (۳۹۷ قبل مسیح میں اسے روم والوں نے پانی کے دیوتا کے طور پر پوجنا شروع کیا تھا) ایک دفعہ کسی جہاز پر سوار کہیں جا رہے تھے کہ اچانک زبردست سمندری طوفان نے جہاز کو آ لیا۔ کنگ نیپچون نے فیصلہ کیا کہ جہاز کے جتنے گنہگار بندے ہیں انہیں سزا دی جائے تا کہ سمندری طوفان ٹل جائے۔ ہم نے بھی ایک عدالت اور تقریب کا انعقاد کیا۔ کنگ نیپچون کے لیے ایک ادھیڑ عمر آفیسر کو منتخب کیا گیا۔ آسٹریلیا جاتے ہوئے ہم نے جب

خط استوا عبور کیا تو اسی عدالت کے لیے ہم نے اپنے ایک کورس میٹ کو ملکہ اور دوسرے کورس میٹ کو شہزادی بنایا تھا۔ (صفحہ ۱۱۰)
(ایک ہی فقرے میں "ہم نے" کی تکرار؟)

ایسی تقریبات بحری سفر کو یقیناً خوشگوار بناتی ہوں گی اور تمام مسافروں کے لیے تفریح طبع کا باعث بنتی ہوں گی۔ لیکن فوجی فوجی ہی ہوتے ہیں۔ وہ جب تک خطرات سے نہ کھیلیں' کوئی ایڈونچر نہ کر لیں' ان کا گزارہ نہیں ہوتا۔ ارشد بتاتے ہیں۔ "ایک خوشگوار صبح ہم سنگاپور سے ۳۴۳۲ سمندری میل کے فاصلے پر تھے۔ گن روم میں چائے سے شغل کرتے ہوئے محسوس ہوا کہ جہاز آگے کی جانب سفر نہیں کر رہا بلکہ سمندر میں ایک ہی جگہ کھڑے ہوئے ہچکولے لے رہا ہے۔ اعلان ہوا کہ تمام مڈشپ مین تیراکی کے لباس اور لائف جیکٹس پہن کر جہاز کی فوکسل (یعنی اگلے حصے) پر جمع ہو جائیں۔ سمندر کی لہریں کچھ یوں اچھل رہی تھیں جیسے نگل ہی تو جائیں گی۔ اب کمانڈنگ آفیسر کا حکم ہوا' جمپ اور کوارٹر ڈیک (یعنی جہاز کے پچھلے حصے) کی طرف تیراکی کریں اور وہاں سے رسے کی مدد سے جہاز کے اوپر آئیں۔"

غرض لیفٹیننٹ ارشد محمود نے چھوٹے چھوٹے واقعات کی خوبصورت مالا پروئی ہے اور بحری زندگی کی تمام تفصیلات دلکش انداز میں بیان کی ہیں۔ زبان کی غلطیاں جا بجا ملتی ہیں لیکن اس کے لیے مصنف نے شروع ہی میں معذرت کر لی ہے کہ ان کا زیادہ تر ذریعہ تعلیم انگریزی رہا ہے۔ (یہ وضاحت بھی کر دیتے تو بہتر تھا کہ آخر اردو نے ان کا کیا بگاڑا ہے) معلوم نہیں یہ معذرت زبان کے بارے میں حساس قارئین کے لیے قابل قبول ہوگی یا نہیں لیکن ارشد اگر کوشش جاری رکھیں تو یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر قابو نہ پایا جا سکے۔

◆◆◆

ایک ابنارمل خاتون کی کومل تحریر

صبیحہ شاہ ایک ابنارمل خاتون ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ایک عام عورت کی ضروریات کی معراج روٹی' کپڑا اور مکان ہے جو بفضل تعالیٰ انہیں میسر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تین چھوٹے چھوٹے بچوں کی امی ہوتے ہوئے' ایک بھرے پرے کنبے میں رہتے ہوئے' سسرال سے نباہ کرتے ہوئے اور تو اور خود اپنی ماں کی جھڑکیاں سہتے ہوئے کہ جو خود ساری زندگی شعبہ تعلیم میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہیں لیکن بیٹی کو ایم اے کی تیاری کرتے دیکھا تو بولیں۔ ''آخر ضرورت کیا پڑی ہے ان بکھیڑوں کی'' تو اس سب کچھ کے باوجود انہوں نے پہلے تو ایم اے کا امتحان دیا اور پھر کاغذ کا ایک جہاز فضا میں اچھالا ''سائبان شیشے کا'' یہ سب کچھ ان کے ابنارمل ہونے کی دلیل ہے اور اس کا اعتراف وہ خود کرتی ہیں۔ کہتی ہیں۔ ''بڑی سے بڑی خوشی میرے قریب سے بنا آہٹ گزر جاتی ہے' بہت چھوٹے چھوٹے دکھ گھنٹوں رلاتے ہیں۔ اچانک' بے سان و گمان ہونے والی باتوں' ملاقاتوں پر ذہن سپاٹ' بے تاثر ہو جاتا ہے۔ بہت چونکا دینے والی خبریں' معمول کی سی باتیں لگتی ہیں۔ پتہ نہیں ابنارمل ہونا خوبی ہے یا خامی۔۔۔۔۔۔ مگر ایمانداری کی بات ہے کہ میں ہوں ایسی ہی۔''

ویسے ایک ادیب کا ابنارمل ہونا ایک نارمل سی بات ہے۔ زندگی کی وہ خوش نمائیاں کہ جن سے ایک عام آدمی کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں' ادیب کی نظر میں بے وقعت ہوتی ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے واقعات جو عام آدمی کی نظر میں بھی نہیں آتے' ادیب کی آنکھ میں منجمد ہو جاتے ہیں جنہیں وہ اپنے قلب و جگر کی گرمی سے پگھلاتا ہے اور روشنائی کی مدد سے صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیتا ہے۔ تب قارئین چونکتے ہیں کہ ہیں۔۔۔۔۔۔؟ ان راہوں سے تو میں بھی گزرا تھا' یہ واقعہ تو میرے ساتھ بھی ہوا تھا' یہ حادثہ تو میں نے بھی دیکھا تھا۔۔۔۔۔۔ لیکن شاید مجھ میں زبان و بیان کی قدرت نہیں' انہوں نے اچھا لکھا۔

صبیحہ شاہ اچھا لکھتی ہیں' بہت اچھا ''سائبان شیشے کا'' ان کی پہلی کاوش تھی جو بارہ افسانوں کا مجموعہ تھی اور اب انہوں نے ایک ناول لکھا ہے ''گنج تخیل سراب ہے'' یہ ارتقاء کا سفر ہے' معنوی لحاظ سے بھی' ذہنی لحاظ سے بھی۔ افسانہ چھوٹا ہوتا ہے' پلاٹ مختصر اور کہنے والی بات کم' بہت ہی کم۔ لیکن ناول کا کینوس وسیع ہوتا ہے۔ کہانی پھیلی ہوئی ہوتی ہے جس میں بہت سے کردار بظاہر تو بکھرے ہوئے ہوتے ہیں لیکن انہیں مرکزی خیال سے جڑا رہنا چاہیے۔ کہانی کار کی گرفت ڈھیلی ہو تو تانوی کردار اولیت اختیار کر جاتے ہیں اور

مرکزی کردار پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ تقدیم و تاخیر کا یہ سلسلہ اچھے اچھے بھلے ناول کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ صبیحہ شاہ داد کی مستحق ہیں کہ ان کا ناول ان کوتاہیوں سے پاک ہے۔ کہانی اس ناول کی بہت بکھری ہوئی ہے' بہت پھیلی ہوئی' بے شمار کردار ہیں لیکن کہانی کی بنت میں کوئی جھول نہیں۔ مرکزی کردار ایک ہی ہے جودت حسین جو مسلسل نمایاں رہتا ہے جیسے تاروں میں چاند۔ دوسرے کردار دمکتے تو ہیں' لو دیتے رہتے ہیں' ایک آدھ کردار بہت زیادہ نمایاں بھی ہوتا ہے لیکن ایسے جیسے کوئی تارہ ٹوٹ کر بکھر جائے' روشنی کی ایک لکیر چھوڑتا ہوا' اس کا نظارہ زیادہ پرکشش تو ہوتا ہے لیکن وہ چاند کی جگہ نہیں لیتا۔

صبیحہ شاہ کے کرداروں کے حوالے سے ایک بات بہت اہم اور نمایاں ہے۔ معلوم نہیں انہوں نے سڈنی شیلڈن کو کتنا پڑھا ہے لیکن صبیحہ شاہ اور سڈنی شیلڈن کی تحریروں میں ایک زبردست مماثلت ہے اور وہ یہ کہ ان کے ہاں نسوانی کردار مردوں پر ہمیشہ حاوی رہتے ہیں۔ وہ نہ صرف بلند قامت ہیں بلکہ ہمیشہ ایک اونچے پلیٹ فارم پر نظر آتے ہیں۔ بیٹھے بھی ہوں تو ان کا قد بلند دکھائی دیتا ہے۔ سحر کا ذکر ہے' وہ آتی ہے تو عنابی بارڈر کی سرمئی ساری کا آنچل لہراتی جیسے مست بدلی کا کوئی ٹکڑا اور بیٹھتی ہے تو کیسے۔۔۔۔۔۔

''کرسی کی پشت سے کمر لگائے' راج ہنس کی سی گردن اٹھائے وہ جودت کے وجود سے بے نیاز بیٹھی تھی۔ کشادہ شانوں پر ٹکی خوبصورت ساری کے آنچل سے اوپر اونچی سفید گردن کے ڈنٹھل پر کھلا سجا وہ چہرہ۔۔۔۔۔۔ جتنی بار بھی اس پر نظر پڑتی' اتنی ہی مرتبہ اسے اپنا قد کم ہوتا' گھٹتا محسوس ہوتا۔''

میڈم ریحام ایک ''سرو قامت'' خاتون ہیں جو جہاں سے گزرتی ہیں' خوشبوؤں کی ایک لکیر چھوڑ جاتی ہیں' جودت کی ہیں لیکن اس کی دسترس سے دور دکھائی دیتی ہیں۔ نشاط ایک دانشور خاتون ہے جو ایلیٹ' کافکا اور ارسطو پر گھنٹوں بحث کر سکتی ہے اور سحر۔۔۔۔۔۔ ''زندگی کے تمام معاملات کے لیے سحر کے دماغ میں فلسفیوں' ادیبوں اور نقادوں کی آراء' خوبصورت اشعار اور جملے کمپیوٹر ڈسک کی طرح فٹ تھے جو وہ موقع محل کے لحاظ سے کوٹ کرتی تھی تو وہ دنگ رہ جاتا تھا۔''

نسوانی کرداروں کو سجانے' انہیں برتر دکھانے کی خواہش صبیحہ شاہ کے ہاں اتنی شدید ہے کہ وہ گوتم جیسے خالص مردانہ کردار سے بھی نسوانیت کا ایک پیکر تراشتی ہیں اور اسے Female Buddha کا نام دیتی ہیں۔

مردوں کے کردار کم ظرف ہیں' کمینے' ڈھیٹ' اکھڑ۔۔۔۔۔۔ مرکزی کردار جودت حسین کو ذہین' دانشور یا بقراط ٹائپ عورتیں اٹریکٹ تو بہت کرتی ہیں لیکن اس سے زیادہ تر ان کی بقراطیت ہضم نہیں ہوتی اور بقول صبیحہ ''اس ترقی پسند ادیب' جدیدیت پسند (جدت پسند چاہیے تھا) ادیب کے اندر در اصل ایک روایتی مرد چھپا بیٹھا تھا جو عورتوں کو ہاں میں ہاں ملاتے' اوڑھنی کی بکل مارے

اپنے مرد کے پاؤں داب‘ہانڈی بھونتے اور بچے تھپکتے ہی دیکھنا چاہتا تھا۔“

سڈنی شیلڈن کے ہاں تو پھر کہیں نہ کہیں مرد کی فوقیت نظر آ جاتی ہے جیسے”Windmills of the Gods“میں‘لیکن صبیحہ بڑی سخت ممتحن ہیں‘مردوں کو رعایتی نمبر دینے کے لیے بالکل تیار نہیں۔ان کا سارا زورِ تحریر عورتوں کا کیس پلیڈ کرتا ہے۔جودت حسین اکھڑ مزاج ہے‘ہرجائی ہے‘بے وفا ہے‘اس کا باپ درشت مزاج ہے۔اٹھارہ برس بعد وہ پہلی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے جو اس صدمے سے جاں بحق ہو جاتی ہے۔اس کے چالیسویں کے اگلے روز ہی نئی بیوی انبساط آراء بیگم ان کے پہلو میں کھڑی نظر آتی ہے جس نے انتظار کے اٹھارہ برس کاٹے ہیں۔اس کی ”ثابت قدمی“ کو خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر اسرار ایک مہربان دوست کی حیثیت سے متعارف کرایا جاتا ہے لیکن اس کی مہربانیاں بھی سرکاری سہولتوں کے ناجائز استعمال کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔عورتوں پر ان کا قلم بہت مہربان ہے‘لکھتی ہیں:

”باشعور عورتوں میں انا کا کلف نہیں لگا ہوتا۔

وہ موم ہوتی ہیں۔

وہ اپنے مرد کی نگاہ کو پہچانتی ہیں۔اس کا موڈ جانتی ہیں اور یوں دن بھر میں ان کا وجود کئی روپ دھارتا ہے۔“

مرد کے بارے میں اس سیدانی کا رویہ دیکھیے۔

”جب میڈم ریحام گہری عنابی‘سادہ مگر پُرکار ساری میں ملبوس‘خصوصی اہتمام سے تیار ہو کر جودت کے سامنے سے بے نیازی سے نکل کر چلی گئی تو جودت کے اندر بیٹھا کمینہ مرد اتنی دیر میں کئی کہانیاں بن چکا تھا۔وہی کہانیاں‘جو ایک بدگمان گھٹیا ذہنیت کا مرد‘باہر نکلنے والی ہر عورت‘اس عورت سے ہنس کر بات کرنے والے ہر مرد کے حوالے سے سوچتا ہے۔“

میں مردوں کا دفاع کر رہا ہوں نہ ان کی پیروی کہ عورتوں کی عدالت میں مردوں کا کوئی کیسا جیتا نہیں جا سکتا۔صرف امرِ واقعہ کا بیان ہے کہ صبیحہ شاہ کے ہاں نسوانی کردار مردوں سے بہت بلند ہیں۔جہاں تک ہماری اپنی رائے کا تعلق ہے تو ہمارا ووٹ صبیحہ شاہ کے ساتھ ہے۔مردوں کی اس دنیا میں کوئی تو ہو جو عورتوں کا وکیل ہو ورنہ ہمارے ہاں کی بہت سی خواتین ادیبوں نے بھی مرد بن کر ہی لکھا ہے۔ویسے عورت بپھرتی ہے تو بڑے سے بڑے قصرِ صدارت کو بھی ایک مرتبہ تو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔

یہ تو تھا کرداروں کے حوالے سے ایک تجزیہ۔۔۔۔۔۔صبیحہ شاہ کو زبان پر بھی مکمل عبور حاصل ہے۔نئے لکھنے والوں میں اس کا فقدان نظر آتا ہے۔ان کے ہاں سلاست بھی ہے‘فصاحت بھی۔خوبصورت الفاظ‘نت نئی تراکیب‘ترشے ترشائے فقرے‘تشبیہات‘

استعارے‘بڑی روانی کے ساتھ وارد ہوتے ہیں۔

”سفید سوتی لباس‘پُرسکون چہرے پر ان غلافی پپوٹوں میں ایک کائنات کا سکون‘گھنی پلکوں کی باڑ پر سر دھرے سو رہا تھا۔“

”ساری کی فال مور پنکھ کی طرح لہرائی۔“

”دھیرے دھیرے‘بے آواز قدموں سے بادِ صبا کی پُرکیف سرسراہٹ کی مانند نمازی‘صبح کی ملگجی روشنی یارات کے ملگجے‘رخصت ہوتے اندھیرے میں ایک ایک کر کے آتے افراد‘عرش سے اترتے فرشتے سے لگے۔“

”بچوں خصوصاً بیٹی کے معاملے میں اس کا رویہ موم سا نرم‘بادِ صبا کی طرح خوشگوار اور صبح کے سورج کا سا مہربان تھا۔“

”شبنم سا سلوک

صبا سا التفات

طوفان کی سی شوریدہ سری۔۔۔۔۔۔ایک ہی شخصیت میں ایسی نفاست و فنکاری یکجا کبھی نہیں دیکھی۔“

صبیحہ شاہ خوبصورت تشبیہات استعمال کرتی ہیں لیکن کہیں کہیں تشبیہات و استعاروں کا یہ استعمال جائز حدود سے تجاوز کرنے لگتا ہے مثلاً ”اک خوش گمانی کی تتلی اس کی بند مٹھی میں اکثر دھیرے سے پھڑپھڑایا کرتی“ تتلی جیسی نازک چیز بند مٹھی میں کہاں پھڑپھڑا سکتی ہے اور وہ بھی اکثر۔ایک اور جگہ لکھتی ہیں۔”عنابی بارڈر کی سرمئی ساری کا آنچل لہراتی وہ مست بدلی کا ایک ایسا ٹکڑا لگی جو آس کی کونپل بن کر برستی ہے۔“ کونپلیں برسا نہیں کرتیں‘پھوٹا کرتی ہیں۔بدلی سے بارش کے علاوہ کچھ اور برسانا ہی تھا تو موتی برسائے جا سکتے تھے۔

ایک استعارہ ”زندگی کوئی پرانے اخبارات کا پلندہ‘گھی کا خالی ڈبہ نہیں ہے کہ استعمال کے بعد ردی پیپر والے کے ہاتھ بیچ کر چار پیسے کھرے کر لیے جائیں۔“ یعنی کہ چہ؟ بعض حالتوں میں استعمال سے پہلے تو انسانوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے لیکن یہ استعمال کے بعد زندگی کا بیچنا قابلِ فہم بات ہے۔

اسی طرح گھنٹیوں کی ٹھنٹھناہٹ‘لڑیوں کی بجائے زنجیر کی کڑیوں میں موتی پروئے جانے کا عمل پہلی بار پڑھنے کو ملا۔لیکن ادب کی یہ خلاف ورزیاں‘نئے لکھنے والے ان شہزادوں کے مقابلے میں بہت کم ہیں جو ٹریفک سگنلز کی پرواہ کیے بغیر ادب کی شاہراہ پر اندھا دھند ڈرائیونگ کرتے ہیں۔صبیحہ کی تحریر کا مجموعی تاثر کول ہے‘خوبصورت ہے۔

صبیحہ صرف الفاظ کی فنکار نہیں ہیں بلکہ ان کا مشاہدہ گہرا اور نظر عمیق ہے۔زندگی کے بڑے بڑے فلسفے انہوں نے بڑی سادگی

سے بیان کئے ہیں۔ مرد اور عورت ہمیشہ سے ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور یہ کوشش آج بھی جاری ہے۔ صبیحہ شاہ کی رائے ہے کہ

''مرد بیوی میں ماں تلاش کرتا ہے۔۔۔۔۔۔ ماں جو شفقت' محبت اور ایثار کی علامت ہے۔ وہ بیوی میں بہن بھی ڈھونڈتا ہے جو چڑائے' چھیڑے' ستائے اور جو اس سے بےلوث محبت کرے۔

مرد بیوی میں دوست تلاش کرتا ہے جس سے وہ اپنے مسائل شیئر کرے' اپنے دکھ کہے' جس کو اپنی خوشیوں میں شریک کرے راحت محسوس کرے جس سے وہ گفتنی' ناگفتنی' سب کہے سب سنے اور۔۔۔۔۔۔ کبھی وہ بیوی کو زر خرید لونڈی بھی دیکھنا چاہتا ہے' بلا چوں و چراں حکم مانے' ہر زیادتی سہے اور اف نہ کرے۔ اس کی آنکھ کا اشارہ بھی پہچانے۔۔۔۔۔۔ اور عورت کتنی آسانی سے' کیسی خوبی سے یہ سارے روپ بدل لیتی ہے۔''

محبت کے بارے میں صبیحہ شاہ کا انداز بیاں۔۔۔۔۔۔

''محبت تو حسن ہے' خوشبو ہے' رعنائی ہے' سورج کی گرمی' چاندنی کو ملتا ہے محبت

محبت تو حیوان کو بھی مہذب بنا دیتی ہے۔

دلوں کو گداز عطا کرتی ہے۔

محبت کرنے والوں کا دامن و دل تو اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ اس میں سمٹے ہوئے محبت کے پھول دنیا بھر میں بانٹ کر بھی ختم نہیں ہوتے۔''

پورے ناول میں مختلف کرداروں کی بنت سے وہ زندگی کی ٹھوس حقیقتیں آشکار کرتی نظر آتی ہیں۔ مرکزی کردار جودت حسین کے اکھڑ پن میں اس کے بچپن کی محرومیوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس کے باپ کے ظلم و ستم نے اسے بھی سنگدل بنا دیا ہے۔ صبیحہ شاہ نے بڑی خوبصورتی سے سمجھایا ہے کہ جن گھروں میں بچوں کو ماں باپ کی محبت نہیں ملتی' ان کی شخصیت ادھوری رہ جاتی ہے۔ تب ان کی زندگی کا ہر کام ادھورا رہتا ہے۔ وہ ساری زندگی وحشتوں میں بسر کرتے ہیں اور بچپن میں جمع کیا ہوا سارا کھردرا پن ارد گرد بانٹتے پھرتے ہیں اور یہاں میں صبیحہ شاہ کی ایک رائے سے اختلاف کی جرات کروں گا۔ انہوں نے اپنی پہلی کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے۔ ''ادب میرے نزدیک نہ تو کوئی نظام ہے کہ اس کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کا کام لیا جائے' نہ یہ ناصح ہے' نہ مشیر یا قاضی' البتہ یہ ضرور ہے کہ ادب انسان کی تہذیب کرتا ہے۔ ''پڑھنے'' کا خوگر کچھ بھی نہ پڑھنے والے کے مقابلے میں ہمیشہ زیادہ مہذب اور باشعور ہوتا

ہے۔''

اس بیان میں بجائے خود ایک تضاد موجود ہے۔ ادب برائے زندگی کی نفی کرتے ہوئے انہوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ یہ انسان کی تہذیب کرتا ہے' انسان کے اندر چھپے ہوئے بھیڑیئے کو سدھا کر' مہذب انسان بنانا بہت بڑی اصلاح ہے بی بی ۔۔۔۔۔۔ اور ادب یہ کام کرتا ہے' یہ ناصح بھی ہے' مشیر بھی' وزیر بھی' سفیر بھی۔ اور آپ میری رائے سے اختلاف کر سکتی ہیں۔ آپ کی تحریر میرے موقف کی حمایت کرتی ہے۔

◆◆◆

توشۂ ادب

قیامت کے نامے

بہت پہلے کی بات ہے' طالب علمی کا دور تھا۔ پڑوس میں آئی ہوئی ایک مہمان لڑکی ہمارے گھر آئی۔ ہاتھوں کی مہندی' کپڑوں کی سج دھج اور ہونٹوں پر پھیلی مسکان سے پتہ چلتا تھا' عروس نو ہے۔ بولی' کسی کام سے آئی ہوں۔ پوچھا' کس کام سے؟ تو لاج سے دوہری ہوتی چلی گئی۔ دوپٹے کا پلو دانتوں تلے دبا لیا۔ نظریں زمین پر گڑ گئیں اور پیر کے انگوٹھے سے فرش مسلنے لگی۔ پھر پوچھا' کیا کام ہے؟ سو چپ کی ایک چپ۔ بڑے اصرار کے بعد اس نے نظریں جھکائے جھکائے مہندی بھرا ہاتھ آگے بڑھا کر کھول دیا۔ ''ذرا یہ خط پڑھ دیں۔''

پتہ چلا شادی کے تیسرے دن اس کا دولہا نئے خوابوں کی صورت گری کے لیے دبئی سدھار گیا۔ اس کا خط تھا۔ کافی دن پہلے آیا لگتا تھا اور جان سے زیادہ عزیز رکھا گیا تھا۔ پسینے سے جا بجا حروف مٹ چکے تھے۔ بند مٹھی کی گرفت نے بھی اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔

''اس سے پہلے تم نے یہ خط کسی سے پڑھوا کر نہیں سنا؟''

''سنا ہے۔''

''تو مجھے بیوقوف بنا رہی ہو؟'' ترشی سے میں نے خط اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس نے نظریں جھکا لیں۔ میرا ہاتھ پھیلے کا پھیلا رہ گیا۔ تب مجھے اس کی بے بسی کا احساس ہوا۔ بہت سے خط پڑھے جانے کے بعد اپنی افادیت کھو دیتے ہیں' ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ کچھ خط ایسے ہوتے ہیں جو تنہائیوں کے رفیق' خوشبوؤں کے سفیر اور قربتوں کے امین ہوتے ہیں۔ بار بار پڑھے جانے کے باوجود ان کے الفاظ باسی ہوتے ہیں نہ ان کی شگفتگی میں کمی آتی ہے اور یہ بات پہلی بار میں نے اسی ''جاہل'' لڑکی سے سیکھی۔

خط ''میں یہاں پر خیریت سے ہوں اور تمہاری خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب چاہتا ہوں'' سے شروع ہوتا تھا اور ''لکھنے والے کی طرف سے پڑھنے والے کو سلام'' پر ختم ہوتا تھا۔ درمیان میں اور باتوں کے علاوہ دلہن کے لیے آئندہ ملاقات پر سونے کے ہار کی خوشخبری بھی تھی۔

''آپ نے کوئی تاریخ نہیں لکھی اس میں؟'' سونے کے ہار کی نسبت پیا سے ملنے کی آس زیادہ سندر تھی۔

”یہ سوال تم نے پہلے بھی کسی سے پوچھا ہوگا؟“

”ہاں۔۔۔۔۔۔شاید ان سے ٹھیک پڑھا نہ ہوگیا ہو'اس لیے آپ سے پوچھتی ہوں۔“

جمعہ جمعہ آٹھ دن اس کی روانگی کو ہوئے نہیں تھے' آنے کی تاریخ کا سراغ کہاں ملتا۔ جب تک وہ پڑوس میں رہی وہی ایک خط روزانہ سنا کرتی۔ پہلے پہل تو ایک دوبار اس نے خط پڑھنے کو کہا پھر بغیر کچھ کہے سنے اس کے اور ہمارے درمیان ایک خاموش معاہدہ سا ہوگیا۔ ہم سکول کی کتابوں میں مصروف ہوتے' وہ آتی تو خط چھپائے گھر والوں سے باتیں کرتی رہتی' باتیں بھی کیا۔۔۔۔۔۔

افسانے یونہی تیرے میرے

انکھیوں سے ہمیں دیکھتی رہتی۔ بہت بے تاب ہوتی تو اتنا پوچھ لیتی' کتنا کام رہ گیا۔ کبھی ہم درمیان ہی میں اسے دعوت دے ڈالتے کہ لاؤ تمہارا خط پڑھ دیں اور وہ جھپاک سے ہم پر مسلط ہو جاتی۔ کبھی سکول کا کام زیادہ ہوتا تو اسے انتظار کرنا پڑتا' کبھی ہمیں خیال نہ رہتا' کام ختم کر کے کھیلنے نکل جاتے اور اس کا خط رہ جاتا۔ اس بے چاری نے کبھی شکایت نہیں کی۔ البتہ جواب نہ آنے پر شکایت کیا کرتی۔ ”فلاں سے لکھوایا تھا تو کھٹ سے جواب آ گیا تھا۔“

”تو اسی سے جا کر لکھوا لو۔“ ہم جل بھن کر جواب دیتے۔

”ناراض نہ ہو بابو'میں اس لیے پوچھتی ہوں کہ پتہ تو ٹھیک لکھا تھا نا؟“

بے چاری تھوڑی بہت پڑھی لکھی ہوتی تو ہماری محتاج نہ ہوتی۔

دوستوں کی حسین رفاقتیں اور اپنوں کی محبتیں چھوڑ کر پرائے دیس جانا بظاہر آسان لگتا ہے لیکن جانے والوں پر کیا گزرتی ہے اس کا حال بس وہی جانتے ہیں۔ ہر کسی کے بس میں نہیں کہ واردات قلب ٹھیک سے بیان کر سکے۔

نئے دوستوں کی دھن میں تیری دوستی کو چھوڑا
کوئی تجھ سا بھی نہ پایا' تیرے شہر سے نکل کر

جانے والے تو چلے جاتے ہیں پیچھے رہ جانے والے چند دن آنسو بہاتے ہیں پھر آنے والوں کے تصور میں لدا پھندا لوٹتے دیکھ کر گنگنانے لگتے ہیں۔

اس گنگناہٹ سے چونکہ فسادات پھوٹنے کا خدشہ ہوتا ہے اس لیے بڑے بڑے ٹیپ ریکارڈروں کی فرمائش لکھی جاتی ہے جن کی جگہ آج کل ڈیک نے لے لی ہے۔ انہیں پورے والیوم سے کھول کر فراق کے گیت سنے جاتے ہیں۔

واسطہ ای رب دا تو جائیں وے کبوترا
چٹھی میرے ڈھول دی لیائیں وے کبوترا

پردیس میں اپنوں کی فرمائش ایک تسلسل سے وصول ہوتی رہتی ہیں۔ بقول شاعر ایک بیوی کا خط دیارِ غیر میں شوہر کے نام:

ملا ہے جب سے خط پیارے کہ چھٹی آ رہے ہو تم
مرے خوابوں میں صبح و شام اکثر آ رہے ہو تم
بہت وزنی سے ایک دو بیگ پیارے ہاتھ میں ہوں گے
اٹیچی کیس دس بارہ یقیناً ساتھ میں ہوں گے
میرے بھیا کی راڈو واچ اب کے بھول نہ جانا
مری تو خیر ہے باجی کی ساڑھی بھول نہ جانا
وہاں سے لکس صابن بس کوئی دس بیس لے آنا
گرم کوٹوں کے کپڑے کے صرف چھ پیس لے آنا
تم آ جاؤ خیریت سے تو پھر کیا چاہیے مجھ کو
شریک زندگی آ جائے تو پھر کیا چاہیے مجھ کو

ضروری نہیں کہ ہر میاں بیوی میں خط و کتابت کے مستحکم رشتے ہی استوار ہوں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے غم روزگار کے بہانے ایک شوہر پردیس ملا۔ جدائی کی گھڑیاں آئیں تو بیوی نے باصرار کہا۔ ”جاتے ہی خط لکھنا۔“

اچھا' اچھا“ میاں نے بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ضرور لکھنا چاہے ایک ہی سطر کیوں نہ ہو۔“ بیوی نے تاکید کی۔

میاں نے فرمائش کی لاج رکھی۔ منزل پر پہنچ کر ایک سطری خط لکھا۔

”ڈیئر۔۔۔۔۔۔۔میں خیریت سے پہنچ گیا ہوں۔۔۔۔۔۔۔والسلام“

اور بیوی نے جواب میں صرف اتنا لکھا۔

”اچھا۔۔۔۔۔۔۔“

اور لفظوں کو ترسا ہوا شوہر جل بھن کر رہ گیا۔ لیکن گندم کے بیج بو کر مٹر کی پھلیاں تو نہیں اتاری جاسکتیں' جو بوؤ گے سو کاٹو گے۔

ایسے افراد بھی ہیں جو جدائیوں کے تمام ترلمحے بس خط لکھنے میں گزارتے ہیں۔ شاید آپ کو یہ بات مبالغہ نظر آئے لیکن یہ سچ ہے کہ ہم نے خود اپنی پارسا آنکھوں سے ایسے گناہگار لوگوں کو دیکھا ہے جو خط کی سزا میں مبتلا تھے۔ تین تین چار چار دن میں ایک خط مکمل ہوتا تھا۔ بعض اوقات تو مدت ایک ہفتے بلکہ دس دس دن تک بھی بڑھ جاتی تھی۔ بے شمار صفحات کے ایسے خطوں کے آخر میں یہ فقرہ بھی دیکھنے میں آتا۔ ''تھوڑے لکھے کو زیادہ سمجھنا'' یا ''اس خط کو خط نہ سمجھنا تار سمجھنا۔''

ہمیں نہیں معلوم سمجھنے والوں نے نسیم حجازی کے ان ناول نما خطوں کو کیا سمجھا البتہ یہ سوچ کر کانپ گئے کہ محکمہ ٹیلی گراف کو ایسی تاریں ادھر سے ادھر پہنچانی پڑیں تو ان کی کارکردگی کا کیا عالم ہوگا۔

محکمہ ٹیلی گراف کی یہ منطق بھی سمجھ میں آئی کہ وہ تار بھیجنے پر ہر ہر لفظ کے الگ الگ سے پیسے کیوں وصول کرتے ہیں۔ اگر وہ جملوں کے حساب سے پیسے طلب کرتے تو ہمارے ہاں ایسے اہل ہنر کی کمی نہیں جو صفحوں کے صفحوں لکھ مارتے لیکن فل سٹاپ کی نوبت نہ آتی۔ ہمارے حلقہ رفاقت میں ایسے دوست بھی ہیں جو ''آپ کا خط ملا' شکریہ'' جیسے جملوں کو یوں ادا کرتے ہیں۔

''ہر موئے بدن کا سر احساس تشکر سے خم ہے کہ آپ نے اس زمانہ بیگانگی میں اپنے اوقات ثمینہ سے فرصت کے لمحات کریمہ مستعار دے کر مجھ ایسے کمترین' ذرہ ناچیز' ارذل الناس' اسفل السافلین کو اس گستاخی اور جسارت کے جواب میں کہ بصورت ترسیل خط مجھ سے سرزد ہوئی اپنے دست مبارک سے شفقتوں اور محبتوں کے پیغام دل فزا سے سرفراز کیا۔''

ایسے حضرات اگر شاعری پر اتر آئیں تو ان کے شعروں کی بحر بھی بحر الکاہل سے کم نہیں ہوتی۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

رنگ و بو کی اک نئی دنیا میں گم ہوتے ہوئے
جل تھل سمندر کے خروش بے کراں سے متصل آباد لوگ
قہقہوں کی جھنجھناہٹ چار سو لذت فشاں ہے
وقت کی لہروں پہ جیسے بج رہا ہو ارغنوں

طویل خط اور ان میں اس نمونہ کلام سے ہمیں ایک اور خطرہ لاحق ہے۔ روزانہ کسی نئی مشین کی ایجاد کی خبر آتی ہے' کیا خبر لفظ تولنے والی کوئی مشین معرض وجود میں آجائے۔ ایسا ہو گیا تو عین ممکن ہے محکمہ ڈاک جہت سے شرط عائد کرے کہ دو روپے کے لفافے میں زیادہ سے زیادہ دس لفظ ہی بھیجے جاسکتے ہیں' ہر زائد لفظ پر اتنے زائد پیسے وصول کئے جائیں گے۔

طویل نویسی کی بات چلی ہے تو ایک واقعہ یاد آیا۔ مختلف رسالوں میں متن کے ساتھ ساتھ جا بجا چوکھٹوں میں دلچسپ واقعات'

لطیفے یا اشعار دیئے جاتے ہیں۔ پہلے تو صحافت کی زبان میں انہیں Filler کہتے تھے اور یہ صرف وہیں استعمال کئے جاتے تھے جہاں ایک مضمون مکمل ہونے کے بعد جگہ بچ جائے اور دوسرا مضمون شروع نہ کیا جاسکے۔ آج کل باکس آئٹم یا چوکھٹے کی شکل میں رنگا رنگی اور تنوع پیدا کرنے کے لیے دیئے جاتے ہیں۔ گویا قارئین کے لیے ایک ٹکٹ میں دو مزوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ تو ایک مرتبہ ایک اخبار میں دیکھا کہ صفحے کے ایک کونے پر علامہ اقبال کے چند اشعار درج ہیں لیکن نیچے علامہ اقبال کے نام کی جگہ لکھا تھا ''قائداعظم''

ایڈیٹر سے تعلقات اچھے تھے' رگ ظرافت پھڑکی تو انہیں لکھ بھیجا۔ ''قائداعظم شاعر بھی تھے۔۔۔۔۔۔۔ کم از کم مجھ پر اس کا انکشاف پہلی بار ہوا ہے۔ مزید انکشافات کی توقع رکھی جائے؟''

جواب میں خط نہیں' بھونچال آیا' طوفان آیا' طوفان باد و باراں' تند و تیز۔۔۔۔۔۔۔ ہم نے آج تک اسے سنبھال رکھا ہے۔ پہلے تو انہوں نے اس بات پر گرفت کی کہ ہم نے غلطی کی نشاندہی کی تو کیوں۔۔۔۔۔۔۔ لکھا:

''ایسا تو عموماً وہ لوگ کیا کرتے ہیں جو صحافت کے نشیب و فراز اور اس کے ''اندرونے'' سے واقف نہیں ہوتے لیکن آپ ان اسرار و رموز سے بے بہرہ نہیں۔ پھر پیشے کے حوالے سے آپ ہماری ہی برادری کے ایک معزز رکن شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ کی طرف سے تو ہمیں ایک ہلکی سی مسکراہٹ کافی ہوتی کہ اس میدان میں ایسے لطیفے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔''

پھر غلطی کا جواز پیش فرمایا۔

''ایسی غلطی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہوتی ہے۔ کئی منزلہ عمارت جو تعمیر کے دوسرے سال گر جائے' تربیلا ڈیم لیک کرنے لگے' پاکستان کا دستور بار بار معطل ہو جائے اور خورد و لخت' غلطی صرف کسی چیف انجینئر یا لیڈر کی نہیں ہوتی بلکہ اس میں بہت سے پردہ نشینوں کے نام شامل ہوتے ہیں۔

انفرادی غلطی کے مشاہدے آپ نے فوجی زندگی میں بارہا کئے ہوں گے۔

جب کوئی وردی پوش کبھی بیلٹ یا ٹوپی کے بغیر باہر نکل آتا ہے۔ کبھی تائکل شولڈرز' رِبن یا سٹار الٹے لگ جاتے ہیں (بے تکلفی معاف) کبھی پتلون کے بٹن کھلے رہ جاتے ہیں۔ کانفرنس یا انٹرویو پر جاتے وقت ضروری کاغذات کہیں رہ جاتے ہیں۔ اصلی یا مشقی جنگ میں اسلحہ کہیں تو بارود کہیں پہنچ جاتا ہے۔

غلطی کہاں نہیں ہوتی' غلطی کون نہیں کرتا؟ جب انسان خطا و نسیان کا مرکب ہے تو وہ ان سے مبرا رہنے کا دعویٰ کیسے کرسکتا

ہے۔سب سے بری اور پہلی غلطی تو ابلیس سے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار میں ہوئی۔ پھر آدم سے جو نافرمانی سرزد ہوئی وہ بھی اسی کی ترغیب کا نتیجہ تھی۔ نوبت ہبوط آدم تک پہنچی اور اولاد آدم آج تک غلطیاں کرتی اور ان کی سزا بھگتتی چلی آ رہی ہے۔ بندہ ہونے کی حیثیت سے انسان ہر روز جانے کتنی ہی غلطیاں' بے انصافیاں' گناہ ہائے صغیرہ و کبیرہ' فرشتوں سے نامہ اعمال میں قلم بند کرانے چلا جا رہا ہے۔جس کا حساب کتاب یوم الحساب ہوتا ہے۔"

اور آخر میں انہوں نے غلطی کو غلطی ماننے سے صاف انکار کر دیا' لکھا۔ "حیرت ہے کہ آپ پر قائداعظم کے شاعر ہونے کا انکشاف پہلی مرتبہ کیوں ہوا؟ ہمیں اور کم از کم مجھے تو ان کے شاعر ہونے میں مثقال بھر شبہ بھی نہیں۔ وہ پاکستان ہی کے نہیں بلکہ دنیا کے بہت بڑے شاعر بلکہ ملک الشعراء تھے۔ قائداعظم کی کہی ہوئی ہر بات ایک شعر ہے جس میں صداقت ہی صداقت ہے' حسن ہی حسن ہے۔ یہ اور بات ہے کہ قائد نے اپنی اپنی شاعری کے لیے میٹر' قوافی اور ردیف کا استعمال نہیں کیا۔ آزاد شاعری کی ہے اور اسی سے آزادی حاصل کی ہے اور یہ بھی انہی کی شاعری کا فیض ہے کہ آج ہم جو کچھ بھی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ ہیں!"

صاحبو! اس خط کے بعد سے ہم قائداعظم کو شاعر بھی مانتے چلے آ رہے ہیں۔ واضح رہے کہ مدیر موصوف کا پورا خط نقل نہیں کیا گیا۔

کہیں کہیں سے سنائے ہیں ہم نے افسانے

یہ تو تھا "قادر الکلام" لوگوں کا تذکرہ' لیکن انسان کی زندگی میں ایسی کیفیات بھی آتی ہیں جب زبان پر قدرت رکھنے کے باوجود لفظ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ زبانی گفتگو ہو تو آنکھوں میں جھلملاتے آنسو یا چہرے کے بدلتے رنگ دل کی ترجمانی کر جاتے ہیں۔ مرحلہ خط و کتابت کا ہو تو بڑی مشکل ہوتی ہے۔ الفاظ کا انتخاب بجائے خود ایک امتحان بن جاتا ہے۔ سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد بھارت و پاکستان کے درمیان ڈاک بحال ہوئی تو بھارت سے ایک مسلمان ایڈیٹر کا خط لاہور میں ایک ہفت روزے کے مدیر کے نام موصول ہوا۔ بس دو جملے تھے۔"

"حادثہ فاجعہ سے پہلے آپ کا پرچہ ہمارے نام آتا تھا' اب بھی آنا چاہیے۔"

ان دو جملوں میں لکھنے والے نے اپنے درد و غم بھی سمو دیے۔ اپنائیت کی ترجمانی بھی کر دی اور ٹوٹے ہوئے سلسلے بحال کرنے کی ضرورت کا اظہار بھی۔ مافی الضمیر کا اظہار کم سے کم الفاظ میں کرنا بھی ایک خوبی ہے۔ عربی زبان کا محاورہ ہے۔ "احسن الکلام ماقل و دل" (بہترین کلام وہ ہے جو مختصر ہو اور رہنمائی کرے)

مختصر ترین خط و کتابت ایک مصنف اور اس کے پبلشر کے درمیان ہوئی۔ کتاب شائع ہونے کے بعد کی بات ہے۔ مصنف بے چین تھا یہ جاننے کے لیے کہ قارئین نے کتاب کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ اس نے پبلشر کو خط لکھا۔۔۔۔۔۔ "؟"

جواب آیا۔۔۔۔۔۔۔ "!"

مصنف تھا مشہور ناول وکٹر ہیوگو اور یہ خط و کتابت دنیا کے طویل ترین ناول "Los Miserables" کے بارے میں تھی جو ۱۹۹۵ صفحات پر مشتمل تھا۔

اور یہ اپنے ہاں کی بات ہے۔۔۔۔۔۔۔ ایک ادیب تھے۔ ہیں تو وہ ماشاء اللہ بقید حیات لیکن "تھے" کا لفظ ہم نے اس لیے استعمال کیا کہ جس خط و کتابت کا ہم ذکر کرنے چلے ہیں اس کے بعد سے انہوں نے نہ صرف ادب سے توبہ کر لی ہے بلکہ اکثر عدم کا یہ شعر گنگناتے سنائی دیتے ہیں۔

جتنے بھی بے وقوف انساں ہیں
مجھ کو سارے ادیب لگتے ہیں

واقعہ ہے کہ اس وقت کا جب ان پر ادب سوار تھا۔ اپنے منتشر خیالات یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کیے تو ان کا خیال تھا کہ قومی پریس میں ایک ارتعاش برپا ہو جائے گا' ادبی حلقے مضطرب ہو جائیں گے اور مورخین ان کی سوانح حیات جاننے کے لیے بے چین ہو جائیں گے۔ لیکن جب مذکورہ بالا قسم کا کوئی سانحہ رونما نہ ہوا اور ہر سو چین کی بنسی بجتی نظر آئی تو انہوں نے خود ہی ناشر سے خط لکھ کر پوچھا۔ "کوئی خط آیا؟"

"ہاں' آپ کے ایک ہم نام صاحب کا جنہوں نے مطالبہ کیا ہے کہ اخبارات میں اشتہار دے کر یہ وضاحت کی جائے کہ یہ کتاب انہوں نے نہیں لکھی۔"

جنرل رومیل اپنی بیوی لوسی ماریا کو بڑی باقاعدگی سے خط لکھتا تھا۔ یہ معمول وہ میدان جنگ میں توپوں کی گھن گرج اور ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ میں بھی نبھاتا رہا۔ کبھی کبھار تو وہ عین میدان جنگ سے ایک ہی دن میں دو دو' تین تین خط بھی لکھا کرتا۔ اس کا ایک مطلب تو خود بخود یہ نکلا کہ فوج میں جنرل کے رینک تک کے آدمی کو اتنی فرصت ہوتی ہے کہ چاہے وہ میدان جنگ ہی میں کیوں نہ ہو گھر باقاعدگی سے خط لکھ سکتا ہے۔

چرچل۔۔۔۔۔۔۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ کو میسر نہ آتا تو پورے یورپ کی تاریخ مختلف

ہوتی کہ ہٹلر نے ایک ہی ہلے میں پورے مغربی یورپ کو تاراج کر دیا تھا۔ برطانیہ کا وزیر اعظم بنا تو سیاست اس کا اوڑھنا بچھونا بن گئی۔ اس کی بیگم کلیمنٹائن ہوزیئر کو سیاست اور چرچل کے سیاسی دوستوں سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چرچل سیاست نہیں چھوڑ سکتا تھا اور ہوزیئر سے چرچل نہ چھوڑا جاتا تھا۔ وہ زیادہ تر وقت لندن کے مضافات میں واقع اپنے گھر یا فرانس میں گزارا کرتی۔ دور ہوتا تو چرچل بڑی باقاعدگی سے گھر خط لکھا کرتا' بڑے مفصل' محبت بھرے خط۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سول ملازمتوں میں وزارت عظمٰی تک کے عہدوں پر فائز حضرات کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیویوں کو باقاعدگی سے خط لکھ سکیں۔

ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ مسز رومیل اور مسز چرچل اپنے شوہروں کے خطوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی تھیں' کتنی بار پڑھتی تھیں اور کیا جواب لکھتی تھیں' البتہ ایک ایسے گمنام فوجی کی خط و کتابت کا سراغ ملا ہے جو اپنے گاؤں سے ہزاروں میل دور محاذ پر لڑ رہا تھا۔ بیوی کا خط آیا۔

''گھر میں کوئی مرد نہیں' بوائی کا موسم گزرتا جا رہا ہے۔۔۔۔۔۔ کھیتوں میں ہل کون چلائے؟''

''خبردار' کھیتوں کی کھدائی ہرگز نہ کروانا' ان کھیتوں میں کچھ اہم کاغذات دفن ہیں' میں خود آ کر نکالوں گا۔'' فوجی نے جواب میں لکھا۔

جنگ کے دن تھے' سنسر کا نفاذ۔۔۔۔۔۔ خط خفیہ ایجنسیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہوں نے کھیتوں کا چپہ چپہ کھود ڈالا۔ ایک بار نہیں' کئی بار۔ بیوی سے پوچھ گچھ کی' لاحاصل۔ سراسیمہ بیوی نے محاذ پر خط لکھا۔

''تم نے کن کاغذات کی بات کی ہے؟ انہوں نے کونہ کونہ چھان مارا' کچھ نہیں ملا۔''

''فوجی راز جاننے کی جستجو میں مت رہا کرو بیوقوف' کھدے ہوئے کھیتوں میں بیج ڈال دو۔ اتنا تو کر سکتی ہو؟''

اور وہ لطیفہ تو آپ نے سنا ہو گا کہ دو دوست آپس میں فون پر بات کر رہے تھے۔ گفتگو کے دوران ایک دوست نے یاد دلایا کہ یار جو پیسے تم نے ادھار لیے تھے وہ اب تک واپس نہیں ہوئے۔ دوسرے نے جواب میں چیخنا شروع کر دیا۔

''ہیلو۔۔۔۔۔۔ ہیلو۔۔۔۔۔۔''

''یار! میں کہہ رہا تھا وہ دو ہزار روپے جو تم نے ادھار لیے تھے' واپس بھجوا دینا۔''

''ہیلو' ہیلو۔۔۔۔۔۔ آواز نہیں آ رہی۔''

جب گفتگو نے طول کھینچا تو آپریٹر نے مداخلت کی اور سننے والے کو بتایا کہ آواز تو آ رہی ہے۔ یہ صاحب پیسے مانگ رہے ہیں۔''

''تمہیں آواز آ رہی ہے؟'' آپریٹر سے پوچھا گیا۔

''ہاں' مجھے تو بالکل صاف آ رہی ہے۔''

''تو بھجوا دو اسے پیسے''

خطوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی کو ادھار دے بیٹھیں تو اسے خط ملنے بند ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست ہیں' ہمیں معلوم تھا کہ ضرورت مند ہیں۔ ان کے مانگے بغیر انہیں کچھ رقم بھجوا دی۔ ان کا شکریے کا خط آیا جس میں یہ وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ وہ ایک سال بعد یہ رقم قسطوں میں لوٹا دیں گے۔ دو سال گزر گئے۔ ہم نے دو خط لکھے' جواب نہ آیا۔ تب انہیں تیسرا خط لکھا جس کے ساتھ ایک ڈرافٹ لیٹر بھی بھیجا کہ اگر انہیں خود جواب لکھنے کی فرصت نہیں تو کم از کم اسے دستخط کر کے ہی بھجوا دیں۔ خط کا متن کچھ یوں تھا۔

''ڈیئر اشفاق!

السلام علیکم! تمہارے دونوں خط مل گئے تھے لیکن شاید مصروفیت کی وجہ سے جواب نہیں دے سکا۔

پولٹری فارم ٹھیک جا رہا ہے' گرمیوں میں کچھ کام ڈھیلا پڑ گیا تھا لیکن آج کل انڈوں کی مانگ زیادہ ہے اور مرغیاں بھی بڑے شوق سے انڈے دے رہی ہیں۔ برائلر بھی ٹھیک جا رہے ہیں۔ آج کل لیئرز کی تعداد۔۔۔۔۔۔ اور برائلر کی تعداد۔۔۔۔۔۔ ہے۔ ڈیری فارم میں ۔۔۔۔۔۔ جانور ہیں۔ روزانہ ۔۔۔۔۔۔ کلو دودھ ہو جاتا ہے۔ جس میں ۔۔۔۔۔۔ کلو پانی ملایا جاتا ہے۔

والسلام

خیر اندیش''

ہمیں یہ ڈرافٹ لیٹر ان کے دستخطوں کے ساتھ واپس مل گیا۔ پہلے فقرے کو کاٹ کر لکھا تھا' عرصے سے تمہارا کوئی خط نہیں ملا' انتظار ہے۔ خالی جگہوں کو پر کیا گیا تھا اور آخری فقرہ غالباً بزنس سیکرٹ ایکٹ کے تحت سنسر کر دیا گیا تھا۔ اس کے پیچھے ایک نوٹ لکھا گیا تھا بزبان انگریزی۔۔۔۔۔۔ (ترجمہ) ''ایک تجربہ کار اور تعلیم یافتہ افسر کی طرف سے قدرے بہتر ڈرافٹ کی توقع تھی جو پوری نہیں ہوئی۔ زبان کا معیار قابل برداشت ہے لیکن متن حسب معمول کمزور ہے۔ امید ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید تجربہ حاصل ہو گا تو ڈرافٹنگ بہتر ہو جائے گی۔ موجودہ ڈرافٹ کو بوجھل دل کے ساتھ منظور کیا جاتا ہے۔''

ایک دفعہ اسلام آباد سے ایک ماہنامے کے مدیر کا خط آیا کہ آپ کا فلاں مضمون ہفت روزہ ''ہلال'' میں پڑھا۔ مجلس ادارت کو

آپ کا مضمون پسند آیا چنانچہ اسے آپ کی اجازت سے ہم شائع کر رہے ہیں۔ آپ اپنی ایک تصویر بھیج دیجئے۔ اس کے بغیر مضمون نہیں چھپے گا' مجبوری ہے۔

ہم نے لکھا۔۔۔۔۔۔۔

نکیلے اور باوقار طلبہ کے اس نکھرے نکھرے رسالے کی مجلس ادارت کو ایک فوجی کا مضمون پسند آنا ایک اعزاز سے کم نہیں اور اس میں جگہ پانا تو یقیناً خوش قسمتی ہے لیکن مضمون کی اشاعت کے لیے آپ نے تصویر کی شرط مجبوری کے نام پر لاگو کی ہے یعنی جو تھوڑی بہت عقیدت قارئین کو مضمون پڑھنے کے بعد ہو سکتی ہے آپ تصویر چھاپ کر اسے بھی ضائع کرنا چاہتے ہیں۔ نہ صاحب نہ ہم باز آئے تصویر چھپوانے سے' آپ مضمون چھاپ لیجئے' بشکریہ یہ بلال"

کافی دنوں بعد ان سے اتفاقیہ ملاقات ہوئی۔ بڑے حیران ہوئے۔ بار بار پوچھتے رہے کہ آپ ہی "جنٹلمین بسم اللہ" کے مصنف ہیں۔ اثبات میں جواب پا کر بولے۔ "آپ اتنے بدصورت تو نہیں۔"

"وردی کا کمال ہے۔" ہم نے جواب دیا۔

پچھلے دنوں بہاولپور سے ایک طالب علم کا خط آیا۔

"جب آپ کی پہلی کتاب شائع ہوئی تھی تو میں تین سال کا تھا۔ اب میں حضرت عیسیٰ تو تھا نہیں کہ پنگھوڑے میں بولتا اور آپ کی کتاب تعریف کرتا۔ بچپن سے بہن بھائیوں کو آپ کی کتابیں پڑھتے دیکھتا رہا۔ ابھی میٹرک سے فارغ ہوا ہوں۔ آپ کی کتاب پڑھی' اچھی لگی اور اس وقت تک پڑھتا رہا جب تک ختم نہ کر لی۔"

یقیناً یہ اعزاز کی بات ہے کہ میرے ملک کے نوجوان اپنی عمروں کا حساب میری کتابوں کی اشاعت سے یاد رکھیں لیکن کبھی کبھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں ملک میں گرتے ہوئے معیار تعلیم کی ذمہ داری ہم پر نہ عائد ہو جائے۔ گوجرانوالہ سے ایک طالب علم کا خط آیا۔

"آج کل امتحان سر پر ہیں۔ ابو نے سختی سے منع کر رکھا ہے کہ کورس کی کتابوں کے علاوہ کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاؤں۔ اخبار بھی بند ہیں۔ اس مارشل لائی حالت میں آپ کی کتاب "جنٹلمین بسم اللہ" ہاتھ لگی۔ اسے کورس کی کتابوں میں چھپا کر پڑھا۔ آپ کی باقی کتابوں کی تلاش جاری ہے۔"

ہم نے جواب میں اس طالب علم سے درخواست کی کہ وہ ہم پر' اپنے والدین پر اور ملک پر رحم فرمائے اور عین امتحان کے دنوں میں ہماری کتابوں کی تلاش کی بجائے نصابی کتابوں پر توجہ مرکوز رکھے اور اپنے والد کا کہا مانے۔ جواب میں اس برخوردار نے

لکھا۔

"کرنل صاحب! آپ کی کتابیں پڑھ کر میں یہ سمجھا تھا کہ آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں اور اس بات کو خوب سمجھتے ہوں گے کہ بیچارہ طالب علم سارا دن کورس کی کتابیں پڑھ پڑھ کر بور ہو جاتا ہے اور تازہ دم ہونے کے لیے کورس کی کتابوں کے علاوہ اگر تھوڑا بہت ادھر ادھر کی چیزیں پڑھ لے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن آپ تو میرے ابو جیسے نکلے۔"

ہم اب تک حیران ہیں' سمجھ میں نہیں آیا کہ زور کس بات پر ہے۔ ہماری کتابوں کے "ادھر ادھر کی چیزیں" ہونے پر یا ہمارے اور اس کے ابو کی مماثلت پر۔۔۔۔۔۔ اور جانے اس کے ابو ہیں کیسے؟

ایک کرم فرما سے ایک تقریب میں ملنے کا وعدہ کیا۔ لیکن چند مجبوریوں کی وجہ سے جا نہ سکے۔ ان کا منظوم شکایت نامہ

ایک تقریب تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
سینکڑوں دل جہاں پر اکٹھے ہوئے
کچھ سے شکوے ہوئے کچھ سے ٹھٹھے ہوئے
ہم بھی پہنچے وہاں' کر کے لمبا سفر
راستہ تھا اگرچہ بہت پر خطر
تجھ سے ملنے کی خواہش جو غالب رہی
راہ کی ٹھوکروں میں بھی راحت رہی
بہت روشنی تھی بڑی جگمگاہٹ
کہیں ساز و نغمہ کہیں مسکراہٹ
مگر آنے پائی نہ کچھ تیری آہٹ
سب سے پوچھا کئے راستہ تیرے آن کا دیکھا کئے
تو نہ آیا مگر وہ شب و روز سارے ہی ضائع ہوئے
جو تجھ سے ملنے کی خواہش نہ پوری ہوئی

زندگی اپنی جیسے ادھوری رہی
"نے مژدۂ وصال' نہ نظارۂ جمال"
اتنا لمبا تو نہ تھا تیرا راستہ
کیا ختم ہو گیا سابقہ واسطہ؟

اور آخر میں ایک اور منظوم خط......

میری جاں!
تم پر سلامتی کرے وہ رب کن فکاں
ایسا بھی کیا' نہ خط نہ کوئی نامہ و پیام
سونی ہے صبح' صبح سے بڑھ کر اداس شام
کیوں یار مہربان-------

تم بھی ہجوم زیست میں کھوئے گئے ہو کیا
رشک فلک تھے خاک پہ روئے گئے ہو کیا
کیا حادثہ ہوا؟

غم ہائے روزگار بھی دلکش تو تھے مگر
ہم کو عزیز تر تھا کسی اجنبی کا نام
بعد انتظار لکھا تھا اک خط تمہارے نام
اک نامہ طویل-------
(شاید سکوت شب میں کمی کی ہو کچھ سبیل)
شاید تمہارے پیار کے سوتے ابل پڑیں
پتھر پگھل پڑیں

شاید بنے وہ راہ محبت میں سنگ میل
وہ نامہ طویل-------
جس میں حریف شام وفا تھی فضائے لفظ
جس میں نظر فریب تھی اک اک ادائے لفظ
جس میں دھڑکتا دل ہی رکھا تھا بجائے لفظ
لیکن اسے میں سمجھتا کن منزلوں کے نام؟
کس نامہ بر کے ہاتھ؟
ملتا وہ نامہ تم کو تو تم دیتے کچھ جواب
میں نے ہی اپنے دل کو صبر آزما کیا
دیکھو تو "میں نے درد سے بازو چھڑا لیا"
دیکھو تو "میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال"
لیکن اب ان آنکھوں میں ہے انتظار اور
اتنا کرو کہ بس مجھے فی الفور خط لکھو
اور یوں لکھو کہ دل سے نہیں دور تم ذرا
پہلے کی طرح آج بھی اس دل کے پاس ہو

اچھا تو-------والسلام

◆◆◆

ضرورت رشتہ

صاحبو! ہر شخص پر عمر کا ایک دور ایسا آتا ہے جب ''ضرورت رشتہ'' کے اشتہاروں میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ یہ دلچسپی عمر کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی ہے۔ شروع شروع میں تو یہ اشتہار نظر ہی نہیں آتے۔ پھر نظر آتے ہیں تو دبی دبی مسکراہٹوں کے ساتھ انہیں پڑھا جاتا ہے اور بس۔ اس کے بعد نظر جمتی ہے تو بس انہی کالموں پر' دوسری تمام خبریں اداریے فکاہیے' ڈائریاں اور اشتہارات بے مقصد' بے مزا اور روکھے پھیکے نظر آتے ہیں اور پھر وہ مرحلہ بھی آتا ہے جب اخبار خریدا ہی اس لیے جاتا ہے کہ اس میں ضرورت رشتہ کے اشتہار ہوتے ہیں۔ تب ایسے لوگ سوچتے ہیں کہ جب ضرورت رشتہ کے اشتہار نہیں چھپتے تھے تو اخباروں میں کیا چھپتا تھا۔

اخبارات معاشرے کے عکاس ہوتے ہیں۔ ان کی مثال اس کھڑکی کی سی ہے جس میں سے آپ کسی بھی معاشرے کے اندر دور تک جھانک سکتے ہیں۔ مثلاً ہمارے اخبارات میں ضرورت رشتہ کے جو اشتہارات چھپتے ہیں ان میں اکثر وضاحت ہوتی ہے۔ ''والدین جلد ملیں' سرپرست رابطہ پیدا کریں' شادی اداروں سے معذرت'' وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے ہاں ابھی تک زیادہ تر شادیاں والدین کی معرفت ہی انجام پاتی ہیں اور اخبارات اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔

عرب ممالک میں شادی کی مشکلات ہمارے ملک کے بالکل برعکس ہیں۔ وہاں لڑکی کے والدین باچھیں کھلائے اور لڑکے کے والدین منہ چھپائے پھرتے ہیں۔ لڑکیاں کھلی کھلی رہتی ہیں۔ لڑکے ڈرے ڈرے سہمے سہمے۔ وجہ اس کی یہ کہ لڑکیوں کے مہر دن بہ دن اونچے ہوتے جا رہے ہیں۔ بڑے شہروں میں تو یہ اچھے بھلے صاحب استطاعت لڑکوں کی پہنچ سے بھی باہر ہو گئے ہیں۔ سعودی عرب کے اخبار ''عکاظ'' نے حال ہی میں مہروں کی بڑھتی ہوئی رقم پر طنز کرتے ہوئے ایک کاٹ دار اداریہ لکھا۔

''ایسا لگتا ہے کہ ریاض اور حائل کی لڑکیوں میں اپنی ''قیمتیں'' بڑھانے کا مقابلہ جاری ہے۔''

اس اداریے سے پتہ چلتا ہے کہ سعودی عرب کے ان دو علاقوں میں مہر کی رقم ایک لاکھ ریال تک جا پہنچی ہے۔ یہ رقم اس رقم کے علاوہ ہے جو لڑکا نکاح کی رات دلہن کے والد کو ادا کرتا ہے۔ اخبار اس رقم کو ان ''اخراجات کا حساب کتاب'' قرار دیتا ہے جو لڑکی کے ماں باپ نے لڑکی کی پیدائش سے اس کی شادی تک لڑکی پر کیے ہوں۔

سعودی عرب میں مہر اور دیگر اخراجات کی رقم اتنی تشویش ناک حد تک بڑھ چکی ہے کہ یہ مسئلہ وہاں کے قومی مسائل میں سر فہرست

ہے۔ مختلف تنظیموں اور قبیلوں کی طرف سے اس کے حل کی کوششیں ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً ایک اور اخبار ''الجزیرہ'' کا ایک تراشہ ہمارے سامنے ہے۔ سعودی عرب کے ایک جنوبی منطقے عسیر کے دارالحکومت ابہا سے ان کا نامہ نگار محمد السید خبر دیتا ہے۔

''یہاں بیشہ قبیلے کا ایک اجتماع ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ کنواری لڑکیوں کا مہر دس ہزار ریال' اور بیوہ' مطلقہ عورتوں کا مہر آٹھ ہزار ریال سے زیادہ نہ ہوگا۔ یہ بھی طے ہوا کہ دولہا کے ساتھ آنے والے باراتیوں کی تعداد بیس سے پچیس تک ہوگی۔''

یہ معاہدہ تصدیق کے لیے امارہ الحمر اور امارہ منطقہ عسیر کو بھیجا گیا جس میں درخواست کی گئی ہے کہ اس علاقے کے لیے اس معاہدے کو قانونی شکل دے دی جائے اور اس سلسلے میں ضروری احکامات صادر کیے جائیں۔ قبیلے نے اس بات پر بھی اتفاق کیا کہ ارباب اختیار کو یہ حق حاصل ہوگا کہ جو بھی مقرر مہر سے زائد رقم ادا کرے اسے بحق سرکار ضبط کر لیا جائے اور جنوب کی 'جمعیہ البر'' کے حساب میں جمع کر دی جائے۔ (جمعیہ البر کا مطلب ایسی تنظیم ہے جو نیکیوں کے فروغ کے لیے قائم کی گئی ہو۔ ایسی سوسائٹیاں سعودی عرب کے تمام علاقوں میں قائم ہیں یہ غریبوں کی مدد اور قیدیوں کی رہائی کے لیے کام کرتی ہیں یعنی ان قیدیوں کا جرمانہ ادا کرتی ہیں جو عدم ادائیگی کی وجہ سے جیل میں ہوں)

مصر کے اخبارات میں چھپنے والے ''ضرورت رشتہ'' کے اشتہارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں شقہ یعنی رہائشی فلیٹ کی اہمیت دولہا سے بھی زیادہ ہے۔ لڑکیوں کی طرف سے ''سرو قد حسین و جمیل اور خوش بدن'' ہونے کی نوید سنانے کے بعد لڑکے کے لیے جو پہلی شرط لگائی جاتی ہے یہی ہے کہ وہ ''صاحب شقہ'' ہو یعنی اپنے فلیٹ کا مالک ہو۔ لڑکوں کی طرف سے جو اشتہارات آتے ہیں فلیٹ کا مالک ہونے کی شکل میں نہ صرف اس کا ذکر سب سے پہلے کیا جاتا ہے بلکہ یہ وضاحت بھی کی جاتی ہے کہ فلیٹ اتنے بیڈ روم' ڈرائنگ کم ڈائننگ' کچن اور اتنے باتھ رومز پر مشتمل ہے۔ کچھ منچلے تو ''غرفتہ الزفاف'' یعنی حجلہ عروسی کا بھی بطور خاص ذکر کرتے ہیں کہ بڑی محنت اور عرق ریزی سے سجایا گیا ہے' بس دلہن کا انتظار ہے۔

بھارت کے انگریزی جریدے ''انڈیا ٹوڈے'' نے اس سلسلے میں ایک دلچسپ خبر شائع کی ہے۔

''ایک بھارتی فرم کے انجینئر مسٹر اے وی آر آویگا نے جو برہمن ایسوی ایشن کے صدر بھی ہیں بنگلور میں ایک ''بروکھیا تقریب'' کا اہتمام کیا ہے۔ اس میں مناسب رشتوں کی متلاشی تین سو برہمن لڑکیوں اور سو کے قریب لڑکوں نے شرکت کی۔ سوئمبر کی اس ماڈرن تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ایسوی ایشن کے ایک رہنما پیجاورمت سوامی جی نے جہیز کی لعنت اور شادی کے معاملات میں زائچوں کو بلا ضرورت اہمیت دینے پر سخت تنقید کی اور دونوں جنسوں کی مساوات پر زور دیا۔

یہ الگ بات ہے کہ ہر لڑکی سے بطور رجسٹریشن بیس روپے فیس وصول کی گئی تھی جبکہ لڑکوں کا داخلہ مفت تھا۔ مسٹر آویگا نے اس کی توجیہہ ''طلب و رسد'' کے قانون کے تحت یہ بیان کی ہے کہ اچھے بر کی متلاشی تین سو لڑکیوں کے لیے بمشکل سو لڑکے آئے تھے۔ ان سے بھی فیس کا مطالبہ کیا جاتا تو ان میں سے کئی بھاگ لیتے۔

مسٹر آویگا نے اس تقریب کو زبردست کامیابی قرار دیا۔ انہوں نے بتایا کہ دس جوڑے تو دیکھتے ہی ایک دوسرے پر فدا ہو گئے۔ ان کی شادی کی تاریخیں طے پا چکی ہیں۔ جب کہ بیس جوڑوں میں ابتدائی مذاکرات جاری ہیں۔

طریقہ کار یہ تھا کہ لڑکیاں ریشمی ساڑھیوں اور زیورات میں ملبوس قطار در قطار لڑکوں کے سامنے بیٹھی تھیں۔ ان کے والدین پچھلی قطاروں میں تشریف فرما تھے۔ ہر لڑکے اور لڑکی کے سینے پر مختلف رنگوں کے بیج آویزاں کئے گئے تھے جن پر ان کی ذات پات اور کوڈ نمبر درج تھے۔ مسٹر آویگا کوڈ نمبر کے حوالے سے ہر شخص کی عمر، قد، روزگار، آمدنی، پیدائش کا ستارہ اور ترجیح۔ کوئی ہو تو بیان کرتے جاتے تھے۔ والدین کو کاغذ پنسل کی سہولتیں مہیا کی گئی تھیں کہ وہ اپنی ضرورت سے مطابقت رکھنے والے لڑکوں کا لڑکیوں کے کوڈ نمبر نوٹ کرتے جائیں۔

جب یہ مرحلہ ختم ہوا تو والدین اپنے ممکنہ دامادوں سے ملاقاتوں کے لیے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ انتظامیہ نے قناتوں کی مدد سے چھوٹے چھوٹے حجروں کا انتظام بھی کر رکھا تھا کہ خواہش مند لڑکے اور لڑکیاں چاہیں تو اپنے معاملات حتمی طور پر طے کرنے سے پہلے بالمشافہ گفتگو کر سکیں۔

اچھے رشتوں یعنی ڈاکٹروں، انجینئروں اور چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ حضرات کو درجن درجن بھر لڑکیوں کے لواحقین نے گھیر رکھا تھا۔ اس طرح دوسری طرف ایسی حسینائیں بھی تھیں جن کے ہاتھ پکڑنے کے خواہاں حضرات ایک دوسرے سے دست بہ گریباں تھے۔

اس سوئمبر میں ایک پچپن سالہ بیوہ خاتون بھی ایک بیالیس سالہ رنڈوا ہم سفر ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئیں۔ واضح رہے کہ وہ چار بالغ بیٹوں کی ماں ہیں۔

یہ تو تھیں مختلف معاشروں میں بذریعہ اخبارات ''تاک جھانک'' کی مختصر رپورٹ۔ آیئے اب آپ کا تعارف ایک ایسے صاحب سے کروائیں جن کی صحبت نے ہمیں ضرورت رشتہ کے اشتہارات پر نظر رکھنے کی لت ڈالی۔

سردیوں کی دھوپ تھی، چھٹی کا دن۔ میس کے سبزہ زار میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ میز پر اخبار بکھرے تھے۔ یہ صاحب بہت دیر سے مسلسل ایک ہی اخبار گھورے جا رہے تھے۔ جب ہم انتظار سے اکتا گئے تو پوچھا۔

''کوئی خاص خبر ہے؟''

''ہاں ہاں یہ دیکھیں۔۔۔۔۔۔۔ مصر میں لڑکیوں کی شادی کی عمر کی اوسط تینتیس سال ہو گئی ہے۔ پچھلے سال یہ اوسط بتیس سال شمار کی گئی تھی۔ البتہ ملائیشیا میں لڑکیاں پڑھ لکھ کر بھی تیس سال کی عمر میں شادی کر ڈالتی ہیں۔''

''کوئی اور خبر۔۔۔۔۔۔۔؟''

''الزبتھ ٹیلر ساتویں شوہر کی تلاش میں ہے۔''

''آپ سے مطلب؟''

''بھئی ہمارا مطلب ہے، ہم ابھی تک۔۔۔۔۔۔۔'' انہوں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور پھر اخبار پر جھک گئے۔

''امریکہ کے شہر فلاڈلفیا میں ایک جوڑے نے پیراشوٹ کی مدد سے چھلانگ لگا کر فضا میں ایک دوسرے کو شادی کی انگوٹھیاں پہنائیں۔''

''اپنے ملک کی بھی خبر چھپی ہے اس میں کوئی؟'' ہم نے پوچھا۔

''گولڑہ شریف کے قریب ایک گاؤں میں دلہن باراتیوں کو سوتا چھوڑ کر اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی۔ پولیس نے رپورٹ درج کر لی ہے۔ تحقیقات جاری ہے۔''

پھر انہوں نے تبصرہ کیا۔

''جانے ہمارے ملک میں یہ وحشت ناک خبریں کیوں چھپتی رہتی ہیں اور یہ لڑکیاں فرار ہی کیوں ہوتی رہتی ہیں؟''

تب ہم نے انہیں خبر کی تعریف سمجھائی کہ کوئی عام سا کتا کسی عام سے انسان کو کاٹ لے تو یہ کوئی خبر نہیں۔ یہ اخباروں میں جگہ کبھی نہ پائے گی۔ لیکن کوئی اچھا بھلا آدمی کسی بھلے مانس کتے کو کاٹ کھائے تو یہ خبر ہے کہ صحافت کے باوا آدم لارڈ نارتھ کلف نے خبر کی تعریف ایسے ہی کی تھی۔ اس لیے ہمارے ہاں کی لڑکیاں جب شرماتی مسکاتی چپ چاپ دولہا کے ساتھ رخصت ہو جاتی ہیں تو کوئی خبر تخلیق نہیں ہوتی۔ ہاں ان کی تصویریں چھپ جاتی ہیں، جھکے جھکے نینوں کے ساتھ، دولہا کے سنگ۔

انہوں نے خالی خالی نظروں سے ہمیں دیکھا اور پھر اخبارات میں جھک گئے۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ ہم نے پھر کچھ سنانے کی فرمائش کی۔

بولے۔ ''گریجویٹ لڑکے کو ایسا رشتہ مطلوب ہے جو لڑکے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھجوا سکیں۔''

”ان صاحب کولڑکی چاہیے یا ویزا؟“ ہم نے پوچھا۔

”ایسی لڑکی جو ویزا دلوا سکے۔“

”پاسپورٹ آفس میں ٹیلی فون آپریٹر ہیں‘ مناسب رہیں گی۔“ انہوں نے پھر ہمیں گھورا۔ کچھ دیر سکوت رہا‘ پھر خود ہی پڑھنے لگے۔

”ضرورت ہے ۷۳ سالہ نوجوان کے لیے کسی ڈاکٹر یا ایم بی بی ایس کے فائنل ایئر کی طالبہ کی۔“

”یہ نوجوان ہے؟“ ہم نے پوچھا۔

”کیوں۔۔۔۔۔۔؟“ وہ پھنکارے۔

”جو شخص ۷۳ سال کی عمر میں نوجوان ہے اس پر شباب کس عمر میں آئے گا؟“

انہوں نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور اگلا اشتہار پڑھنے لگے۔

”بیرون ملک مقیم ایک انجینئر کے لیے خوبرو دوشیزہ کا رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکا صرف دو ہفتوں کے لیے پاکستان آیا ہوا ہے۔ فوری طور پر لکھیں۔“

”اس اشتہار کا عنوان کیا ہے؟“ ہم نے سوال کیا۔

”ضرورت رشتہ۔۔۔۔۔۔ کیوں؟“

”کچھ اور ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔“

”مثلاً۔۔۔۔۔۔؟“

”پھر نہ کہنا خبر نہ ہوئی“

وہ سچ مچ ناراض ہو گئے۔ ہم نے ویٹر کو بلایا اور کریم والی کافی کا آرڈر دیا صرف اپنے لیے اور وہ جلدی سے مان گئے۔ ہمیں کافی کا آرڈر بڑھانا پڑا۔ وہ پھر اشتہارات پڑھنے لگے۔

”اعلیٰ عہدے پر فائز ایک نوجوان کے لیے بائیس سالہ خوبصورت‘ سرو قد‘ تعلیم یافتہ‘ با اخلاق‘ امور خانہ داری میں ماہر دوشیزہ کا رشتہ مطلوب ہے۔“

”کیا یک طرفہ کارروائی ہے۔“ ہم نے کہا۔

”کیسے۔۔۔۔۔۔؟“

”اپنے بارے میں صرف اتنا فرمایا۔ ”اعلیٰ عہدے پر فائز“ اور لڑکی کے لیے عمر کے تعین کے ساتھ ساتھ اتنی بہت سی شرائط بھی گنوا دیں۔“

یہ جانے کیوں ہر لڑکے کے وکیل صفائی بنے بیٹھے تھے‘ بولے۔

”ظاہر ہے لڑکا جوان ہی ہوگا۔“

”یہ ظاہر کیسے ہے؟ ایک شاعر نے اپنے جاننے والے ایک لڑکے کا اشتہار یوں دیا تھا۔۔۔۔۔۔

ایک لڑکا ہے اصیل النسل‘ عالی خاندان۔۔۔۔۔۔ عمر ہے لڑکی کی ففٹی سکسٹی کے درمیان۔

تم اسے ”لڑکا“ کہو گے؟ اور یہ اس اونچے عہدے کی بلندی آپ کو کیا معلوم۔۔۔۔۔۔ ہیڈ کانسٹیبل یا ہیڈ ویٹر حضرات بھی تو خود کو اعلیٰ عہدے پر فائز ہی سمجھتے ہیں۔“

وہ کافی پی چکے تھے۔ باقاعدہ ناراض ہو کر اخبار پٹختے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ہمیں شہر جانا تھا‘ منانے کی کارروائی شام تک ملتوی کر دی۔

دن چھپے ہم لوٹے تو منانا یاد آیا۔ دیکھا کہیں جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ انہیں گھیر گھار کر انٹی روم میں لے گئے۔ جلد ماں جانے والوں میں سے تھے‘ مان گئے۔ تب ہم نے پوچھا‘ ضرورت رشتہ کے اشتہاروں اور شادی کی خبروں میں ان کی غیر معمولی دلچسپی کا سبب؟ بتایا ان کے رشتے کے ایک کزن اس شہر میں ٹرانسفر ہو کر آئے ہیں۔ شادی کا اصل بھوت تو ان پر سوار ہے اور ان کی صحبت میں رہتے رہتے انہیں بھی یہ شوق چرایا ہے۔ ہم ان سے ملاقات کے طالب ہوئے تو پتہ چلا کہ وہیں کا قصد ہے۔ میس سے نکلے‘ ٹیکسی لی اور جھپاک سے ڈاکٹر ابوالہول کے ہاں پہنچ گئے۔ یہی ان کے کزن ڈاکٹر تھے۔ ایم بی بی ایس نہیں‘ یہ پی ایچ ڈی والے‘ کیمسٹری میں ڈاکٹریٹ جرمنی سے کر کے آئے تھے۔

تعارف ہوا‘ شادی کے غم گھلے جا رہے تھے۔ لیکن لڑکی کی پسند کا مسئلہ طے نہیں پا رہا تھا۔ گفتگو میں پہلے تو جھجکتے رہے لیکن بالآخر کھل گئے۔ تب انہوں نے ہمیں ایک رجسٹر دکھایا جسے دیکھ کر ہم سکتے میں آ گئے کہ لڑکی کے انتخاب میں یہ نوبت بھی آ سکتی ہے۔

اس رجسٹر کا ہر صفحہ ایک لڑکی کے لیے مخصوص تھا۔ ہر صفحے پر بے شمار کالم تھے اور ہر کالم کے پانچ نمبر۔ جو رشتہ آتا یا جس لڑکی کے لیے گھر والے رشتہ طے کرنے کی بات کرتے‘ اس کے بارے میں کرید کرید کر معلومات جمع کی تھیں۔ پھر کوائف کے مطابق ہر کالم میں نمبر دیے جاتے۔ صفحے کے آخر میں ہر لڑکی کے حاصل کردہ مجموعی نمبر تھے۔ کالموں کی تفصیل کچھ یوں تھی۔

رنگت -------------	کل نمبر -------	حاصل کردہ نمبر
سفید گوری چٹی -------	۴	
سفید سرخی مائل -------	۵	
گندمی کھلتی ہوئی -------	۳	
گندمی سنولائی -------	۲	
سانولی -------	۱	
کالی -------	صفر	

نظر -------------------	کل نمبر
۶x۶ ----------------	۵
عینک گورے رنگ کے ساتھ -------	۴
عینک گندمی رنگ کے ساتھ -------	۳
عینک سانولے رنگ کے ساتھ -------	صفر

بہن بھائیوں کے نمبر -------	کل نمبر
پہلوٹھی -------------	۳
منجھلی -------------	۵
آخری -------------	۳
اکلوتی -------------	۲

حساب کا یہ استعمال ہم نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اکا دکا سوالات کئے مثلاً پہلوٹھی کی لڑکی ہونے پر دو نمبر کیوں کاٹے گئے؟

بولے۔ ''ماں باپ پہلے بچے سے لاڈ پیار کچھ زیادہ ہی کرتے ہیں اور بے جا لاڈ پیار بچے کو بگاڑ دیتا ہے اور عام طور پر پہلا بچہ بگڑا ہوا ہوتا ہے۔

''اور آخری اولاد ہونے پر نمبر کاٹنے کی وجہ؟'' ہم نے جاننا چاہا۔

''آخری بچہ ہونے تک ماں باپ بچوں کے ہاتھوں تنگ آ چکے ہوتے ہیں۔ معاشی الجھنیں بڑھ چکی ہوتی ہیں۔ بچے کو وہ محبت اور شفقت نہیں مل پاتی جو شخصیت کی نشوونما کے لیے ضروری ہے۔ ایسا بچہ نظر انداز شدہ بچہ کہلاتا ہے۔''

کچھ اس طرح کی وجوہات انہوں نے اکلوتی لڑکی کے بارے میں بھی گنوا دیں۔

کیمسٹری میں ڈاکٹریٹ کر کے نفسیات میں اتنا درک حاصل کرنے پر ہم نے انہیں بے تحاشا داد دی اور رجسٹر کی ورق گردانی کرنے لگے۔ معلوم ہوا جس لڑکی سے بھی رشتے کی بات چیت چلتی ہے اس کے کوائف منکر نکیر سے بھی زیادہ باریک بینی کے ساتھ وہ اپنے رجسٹر میں درج کرتے ہیں۔ یہ کوائف لڑکی کی ذاتی خوبیوں سے شروع ہو کر اس کے بہن بھائیوں اور ان کے شادی شدہ ہونے کی صورت میں ان کے سسرالی رشتہ داروں تک پھیلے ہوئے تھے۔

ذاتی کوائف میں' قد کے ضمن میں لڑکی کا سرو قد ہونا ڈس کوالیفیکیشن تھا کہ موصوف کا اپنا قد چھوٹا تھا۔ اور دراز قد بیگم کے ہمراہ چلنے پر لوگوں کی پھبتیوں کا خطرہ تھا۔ پست قد ہونے پر بھی دو نمبر کٹتے تھے کہ ہونے والی اولاد کے بارے میں بہت زیادہ چھوٹے رہ جانے کی فکر تھی۔ بالوں کے کالم میں گھنے' سنہرے' سیاہ اور مختصر ہونے کا ذکر تھا جبکہ ناک کا کالم ستواں' چپٹی اور پچکی ناک میں بٹا ہوا تھا۔ تعلیمی کوائف میں ایف اے' بی اے اور ایم اے کے تین کالم تھے اور ان کی مزید تشریح کہ اگر بی اے باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے کالج سے کیا ہے تو پورے پانچ نمبر' پرائیویٹ کیا ہے تو تین نمبر کم۔ بقول ان کے کالج میں داخلے سے ملنے جلنے کا سلیقہ' اٹھنے بیٹھنے کا طریقہ اور زندگی رکھ رکھاؤ سے گزارنے کا قرینہ آتا ہے لیکن ایم اے یونیورسٹی سے باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے کرنے پر دو نمبر کم ہوتے ہیں۔

''کالج میں طالب علم ہونا کوالیفیکیشن اور یونیورسٹی میں ڈس کوالیفیکیشن؟''

بولے۔ ''یونیورسٹی میں پڑھائی' کم ہڑتالیں زیادہ ہوتی ہیں۔''

''یہ لڑکیاں کیا گائے بھینسیں ہوتی ہیں؟'' ہم نے پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' وہ حیران ہوئے۔

''یہ بتایئے اتنی تلاش اور جستجو کے بعد جس لڑکی کے بارے میں آپ مطمئن ہوں گے کہ وہ آپ کے معیار پر پوری اتر رہی ہے' کیا ضروری ہے کہ وہ لڑکی بھی آپ کو پسند کر لے؟''

’’جی۔۔۔۔۔۔‘‘ سمجھتے ہوئے بھی وہ انجان بن گئے۔ہم نے انہیں ’’پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ‘‘ کی نصیحت کی اور چلنے کا قصد کیا کہ اچانک ایک اور صاحب نازل ہو گئے۔ یہ ڈاکٹر ابوالہول کے واقف کاروں میں سے تھے اور اسی مرض میں مبتلا تھے جس میں ڈاکٹر صاحب گرفتار تھے۔معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی بیٹھک تو کنواروں کا ڈیرہ ہے جہاں ہفتے عشرے کنواروں کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔گزشتہ کارگزاری کی رپورٹ پیش کی جاتی ہے۔اور آئندہ کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی۔

ان نئے صاحب کی بغل میں کچھ فائلیں سی دبی ہوئی تھیں۔ہم سمجھے کہ یہ بھی کوئی رجسٹر کھولے ہوئے ہیں۔کیوں نہ لگے ہاتھوں ان کا ’’طریقہ واردات‘‘ بھی معلوم کرلیا جائے۔لیکن معلوم ہوا کہ انہوں نے رجسٹر تو نہیں کھول رکھا البتہ شرائط کی چھ ہیں۔

لڑکی کے بارے میں:

ا۔حسین ہو بے تحاشا۔

۲۔پڑھی لکھی ہو کم از کم گریجویٹ انگریزی بولتی ہو فر فر' کسی یورپی زبان میں مہارت' اضافی قابلیت سمجھی جائے گی۔

۳۔محفل میں اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ آتا ہو۔’’بڑے لوگوں‘‘ سے بلا جھجک مل سکتی ہو۔

۴۔فائن آرٹ کی دلدادہ' ادبی ذوق کی مالک ہو۔شعر کہہ نہ سکے تو سمجھ ضرور ہی لیتی ہو۔

۵۔مذہب سے لگاؤ ہو' دینی امور میں گہرا درک رکھتی ہو۔

۶۔شوہر کا احترام کرنا جانتی ہو۔

’’یعنی بغیر ہیل والی جوتی پہننے کی عادی ہو۔‘‘ہم نے ان کی آخری شرط سن کر کہا۔

ہم نے انہیں احساس دلانے کی کوشش کی کہ ان کی شرائط ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔مثلاً مذہب سے گہرا لگاؤ رکھنے والی لڑکی شمع محفل بن کر کیسے جگمگا سکتی ہے؟ یورپی زبانوں میں مہارت رکھنے والی لڑکی دیوداسی بن کر شوہر کے چرنوں میں کیسے رہ سکے گی؟ اور پھر فائن آرٹ کی دلدادہ' ادبی ذوق کی مالک لڑکی کے سینے میں دل بھی تو رکھتی ہو گی۔حساس' دھڑکتا ہوا اور ظاہر ہے اچھے شعر تو تبھی کہے جاتے ہیں جب یہ دھڑکتا ہوا دل بری طرح دھڑکا ہو کسی کے لیے۔انہیں اپنی سیکنڈ ہینڈ حیثیت منظور تھی؟‘‘

ڈاکٹر ابوالہول اور ان کے دوست منہ پھاڑے ہمیں دیکھ رہے تھے۔انہیں ہمہ تن گوش پا کر ہماری رگ تقریر پھڑک اٹھی' گویا ہوئے۔

لیلیٰ کی رنگت کالی تھی۔ پڑھائی لکھائی میں اس نے صرف قیس لکھنا سیکھا تھا لیکن اس کا پیار امر ہو گیا۔انسان سے انسانیت کی امید رکھو۔اسے احساس مروت کو کچل دینے والے آلات کی طرح مت پرکھو۔یہ تو دلوں کے رشتے ہیں جو تمام تر جہاں گیریوں کے باوجود کچے دھاگوں کی طرح نازک ہوتے ہیں۔

دلوں کا رشتہ نازک' یہ احتیاط ذرا
حضور ٹوٹ نہ جائے' حضور ٹوٹ گیا

ہماری تقریر ختم ہوئی تو چھ نکاتی شرائط والے صاحب نے پسینہ پونچھنے کے لیے چشمہ اتارا تو ہم ایک بار پھر دم بخود رہ گئے۔’’بے تحاشا حسین‘‘ لڑکی کی فکر میں گھلنے والے اس نوجوان کی اپنی حالت یہ تھی کہ

آنکھ کی ایک شمع روشن' دوسری تھوڑی سی گل

ناک پر دبیز' رنگین شیشوں والی نظر کی عینک' چہرے پر زری اور دانشوری کی ملی جلی پرچھائیاں اور بال کسی مصنوعی فلسفی کے خیالوں کی طرح الجھے ہوئے۔مزید گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا' انگریزی فر فر بولنے والی لڑکی کا متلاشی یہ نوجوان:

بات انگریزی نما اردو میں کر لیتا ہے صاف
کاؤ اور کالج پہ لکھ سکتا ہے کچھ پیراگراف

مزید کوائف کی تفصیل کچھ یوں بنی۔

عمر۔۔۔۔۔۔پاکستان کی عمر سے کچھ زیادہ۔

مشاغل۔۔۔۔۔۔عاشقی' مے کشی' پرستش ناز روڈ انسپکشن۔

کاروبار۔۔۔۔۔۔گیسو ہائے دراز کی مشاطگی۔

آئندہ کے عزائم۔۔۔۔۔۔سسرال کی طرف سے بیرون ملک بھیجے جانے پر یا بلا لیے جانے پر آسمان کے تارے توڑ بیگم کے قدموں میں ڈھیر کرنا۔

شریک سفر سے برتاؤ۔۔۔۔۔۔اس کے حق میں دل سے فوری طور پر دستبردار' اس کے اشارۂ ابرو پر اپنے آپ کو یکسر بدل دینے کو تیار اور اس کے سنگ سات سمندر پار جانے کو ہمہ وقت مستعد اور ہر دم تیار۔

کچھ دیر بعد یہ محفل برخاست ہو گئی۔

کچھ دنوں بعد سر راہ ڈاکٹر ابوالہول سے ملاقات ہو گئی۔شکن آلودہ چہرہ' رنگت اڑی اڑی سی' گیسو کھلے کھلے سے' گھبرائے گھبرائے

لہجے میں بولے۔

”آپ سے ایک مشورہ کرنا ہے ابھی چلیے ہمارے ساتھ۔“

ہم ساتھ ہو لیے۔ گھر لے گئے اور اٹھا لائے اپنا رجسٹر۔ صفحے الٹ پلٹ کر انہوں نے ہمیں دو نام دکھائے کہ قطار در قطار کالموں میں ایک کے حاصل کردہ نمبر ایک سو انہتر تھے اور دوسری کے ایک سو ستر تھے۔ پوچھا کہ مسئلہ کیا ہے۔

بولے۔

”آپ کی بات ہمارے دل کو چبھ گئی ہے جانے پھر کوئی لڑکی ہمیں قبول کرے نہ کرے' بس تحقیقات کا دور اب ختم ہوا۔ اب ہم جلدی سے کوئی فیصلہ کر ڈالنا چاہتے ہیں۔ آخری انتخاب ان دو میں سے کرنا ہے۔ آپ بتائیے کس کا انتخاب کریں؟“

”فیصلہ تو خود بخود ہو چکا ہے۔ آپ نے جس سائینٹفک انداز سے رجسٹر میں اندراجات کر رکھے ہیں اس میں شک وشبے والی گنجائش ہی کہاں ہے۔ بس دھڑلے سے ایک سو ستر والی کا انتخاب کر لیجیے۔“

”ارے صاحب یہی تو مسئلہ ہے۔ نمبر اس کے زیادہ ہیں لیکن دل ایک سو انہتر والی کی طرف مائل ہے۔ وہ با اخلاق بھی ہے اور جب مسکراتی ہے تو اس کے گالوں پر گڑھا پڑ جاتا ہے۔“

”تو ایسا کیجیے کہ مارکنگ دوبارہ کر لیجیے۔ شاید اس کے نمبر بڑھ جائیں' اس کے کم ہو جائیں۔“

”ارے صاحب! گزشتہ دو ہفتوں سے ہم مارکنگ ہی تو کر رہے ہیں اس کا کوئی نمبر بڑھتا ہے نہ اس کا کم ہوتا ہے۔ عجیب شش و پنج میں مبتلا ہیں اور اسی لیے آپ کو بلایا ہے کہ اس مسئلے کا حل نکالیے۔“

”تو ایسا کریں کہ جہاں آپ نے اتنے بے شمار کالم بنائے ہیں اس میں ایک کالم اور بڑھا لیجیے۔ عنوان اس کا رکھیں ”دل“ جس کی طرف یہ زیادہ مائل ہو اسے زیادہ نمبر دیں باقی کو کم اور آپ کا مسئلہ حل۔“

”لیکن سائنس دل کو نہیں مانتی۔ یہ تو صرف خون پمپ کرنے کا ایک آلہ ہے۔“

”تو سائنس جلد کی رنگت کو مانتی ہے؟ قد کو ماپتی ہے؟ زلفوں کی سیاہی کو دیکھ کر کردار پر کوئی حکم لگاتی ہے؟ باپ کی آمدنی کا حساب لگا کر بیٹی کے مزاج کا پتہ دیتی ہے؟“

ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہے پھر معذرت کرتے ہوئے ہمیں ڈیوڑھی تک چھوڑنے آئے۔ آثار کہہ رہے تھے انہیں ہماری تجویز پسند آئی تھی نہ تلخ نوائیاں۔

پھر عرصے تک ان سے ملاقات نہ ہو سکی اور ہمارا ٹرانسفر کہیں اور ہو گیا۔ برسوں بعد ان کے شہر جانا ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ شادی کا مرحلہ طے کر گزرے۔ چھٹی کا دن تھا۔ بہت اشتیاق سے ہم ان سے ملنے گئے۔ گھر پہنچے تو عجیب منظر تھا۔ بیگم صاحبہ گلابی ساڑھی میں ملبوس' کہیں جانے کو تیار کھڑی تھیں۔ گلے میں چمکتا نیکلس' کانوں میں دمکتے بندے' جوڑے میں قیمتی کلپ۔ ڈاکٹر صاحب بنیان اور پاجامے میں ملبوس تھے۔ پائنچے چڑھائے ہوئے' ہاتھ میں بھیگی جھاڑو لیے کھڑے تھے' غالباً کسی کمرے کا فرش دھوتا چھوڑ کر آئے تھے۔ بیگم صاحبہ شاپنگ کے لیے بازار جانے سے پہلے لنچ کے بارے میں آخری ہدایات دے رہی تھیں جس پر ان کی چند سہیلیاں مدعو تھیں۔

”برتنوں پر کوئی دھبہ نہ ہو۔“

”نیپکن استری کر لینا۔“

”گلاسوں میں ستاروں کی چمک ہونی چاہیے۔“

بیگم صاحبہ جانے کے لیے مڑیں تو ہمیں مین گیٹ پر کھڑے پایا۔ کھا جانے والی نظروں سے ہمیں دیکھا اور پھنکارتے ہوئے پوچھا۔

”کس سے ملنا ہے؟“

”کسی سے نہیں جی' میٹر ریڈنگ کرنی ہے۔“

”بائی آل مینز“

میڈم نے سراپا مسکراہٹ بن کر کہا۔ ہم نے غور سے دیکھا' مسکراتے ہوئے ان کے چہرے پر ڈمپل نہیں پڑتے تھے۔ صاف ظاہر تھا ڈاکٹر صاحب نے ایک سو ستر والی کا انتخاب کیا تھا۔ ہم نے ان سے مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

◆◆◆

اور اسے خدا مل گیا

فضلو درزی شمالی علاقوں کے پہاڑوں میں گھرے ہوئے ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتا تھا۔ قصبے کی آبادی چند گھرانوں پر مشتمل تھا۔ لوگ سیدھے سادے تھے اور آپس میں پیار محبت سے مل کر رہا کرتے تھے۔ فضلو پہاڑوں کی آغوش ہی میں پیدا ہوا تھا اور بچپن سے اب تک ساری زندگی اس نے انھی وادیوں اور آبشاروں میں گزاردی تھی۔ چیڑ کے لمبے لمبے درخت اس کے بچپن کے ساتھی تھے اور پہاڑوں کے خوبصورت دامن اس کے اداس لمحات کے مسکن۔ آبشاروں کی گنگناہٹ نے اسے موسیقی سے آشنا کیا تھا اور کھلتے پھولوں' مسکراتی کلیوں نے دل کے لطیف جذبات کو جلا بخشی تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ سے اس پر اک سرور سا طاری ہو جاتا اور وہ اکثر اپنا کام کاج چھوڑ کر ان وادیوں میں گھوما کرتا جہاں ساری زندگی گزار کر بھی ہر چیز اس کے لیے نئی نئی سی تھی۔

گاؤں کا ماحول اگرچہ مذہبی تھا لیکن مذہب کے بارے میں لوگوں کی تمام تر معلومات کے ماخذ وہ خطبے تھے جو قریبی قصبے کی بڑی مسجد میں جمعے کے جمعے مولوی صاحب دیا کرتے۔ ایک جمعے کو فضلو نماز پڑھنے گیا تو مولوی صاحب دین کی اہمیت پر وعظ فرما رہے تھے۔ پہلے تو فضلو دوسرے نمازیوں کی طرح ادب سے صرف سنتا رہا اور اس کے دل کے کسی گوشے میں عمل کی کوئی تحریک نہ ابھری۔ لیکن جب مولوی صاحب نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث سنائی کہ رسول خدا نے فرمایا کہ ''نیکی کر گزرو' چاہے چھوٹی ہی کیوں نہ ہو' ہو سکتا ہے آخرت میں یہ چھوٹی چھوٹی نیکیاں جمع ہو کر نجات کا سامان بن جائیں اور بدی سے بچ جاؤ' چاہے چھوٹی ہی کیوں نہ ہو' ہو سکتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی برائیاں جمع ہو کر اتنا انبار بن جائیں کہ ان کا بوجھ اٹھائے نہ اٹھے'' تو فضلو نے فیصلہ کر لیا کہ آج سے کم از کم چھوٹی چھوٹی نیکیاں تو شروع کر ہی دی جائیں۔

مولوی صاحب کی باقی تقریر کے دوران وہ صرف یہی سوچتا رہا کہ یہ کیا نیکیاں ہو سکتی ہیں۔ اور جمعہ کی نماز ختم ہوئی تو وہ صرف یہی فیصلہ کر پایا کہ مولوی صاحب سے مل کر ''عم کا پارہ'' یا کوئی اور سادہ سی مذہبی کتاب لے لی جائے اور روزانہ کچھ دیر اس کا مطالعہ کیا جائے۔ چنانچہ نماز کے بعد وہ مسجد ہی میں ٹھہر گیا اور جب لوگ چلے گئے تو وہ مولوی صاحب کے پاس گیا ادب سے مصافحہ کیا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ مولوی صاحب نے کچھ دیر تو پوچھ گچھ کی اور اس بات پر بڑے خفا ہوئے کہ وہ اتنا بڑا ہو گیا ہے اور اسے ابھی تک قرآن شریف پڑھنا نہیں آتا۔ تاہم انہوں نے دین سیکھنے کی خواہش پر بڑی مسرت کا اظہار کیا اور وعدہ کیا کہ آئندہ جمعہ کو وہ اسے اردو میں ابتدائی دینیات کی کوئی کتاب لا دیں گے۔

قصبہ جہاں سے شروع ہوتا تھا فضلو وہیں رہتا تھا۔ کچے رستے سے ہٹ کر ایک اونچے سے ٹیلے پر اس کا مکان تھا اور کھڑکی سے قصبے میں داخل ہونے اور باہر جانے والے ہر شخص پر اس کی نظر رہ سکتی تھی۔ موسم سرما شروع ہو چکا تھا۔ وہ اکا دکا سیاح جو سیر و تفریح کے لیے آئے تھے' رخصت ہو چکے تھے۔ گاؤں کے لوگ کھیتوں پر کام کرتے یا پھر سردی کے مارے گھروں میں دبکے بیٹھے رہتے۔ فضلو کا معمول بھی بدل چکا تھا۔ جوانی ڈھل چکی تھی اور سردی کے اس عالم میں پہلے کی طرح ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے وادیوں میں گھومنے پھرنے کا یارا اس میں نہ رہا تھا۔ وہ صبح سے شام تک انگیٹھی میں کوئلے دہکائے سلائی میں مصروف رہتا اور جب سورج مغرب کی وادیوں میں روپوش ہو جاتا تو وہ اپنا کام سمیٹ کر لالٹین کی مدھم روشنی میں حدیث کی وہ کتاب پڑھا کرتا جو مولوی صاحب نے اسے شہر سے لا دی تھی۔

ایک دن حسب معمول اس نے اپنا کام سمیٹا۔ سلے ہوئے کپڑے تہہ کئے اور ان سلے کپڑوں کو قرینے سے رکھا۔ کترنیں وغیرہ جمع کر کے ایک کونے میں ڈال دیں اور وضو کر کے مغرب کی نماز پڑھی۔ رات نے اپنی زلفیں بکھیر دی تھیں۔ اندھیرا بڑھ چلا تھا اور اس کی کٹیا کے باہر لگی رات کی رانی اور مولسری کے پیڑوں کی ملی جلی خوشبو چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ اس نے پہلے سے صاف کی ہوئی لالٹین کو جلایا اور طاق پر رکھ دیا۔ پھر بڑے ادب سے جزدان میں لپٹی ہوئی حدیث کی کتاب نکالی۔ عربی تو وہ پڑھنا جانتا نہ تھا' رک رک کر بمشکل اردو ترجمہ پڑھا۔ دو چار سطریں پڑھ کر بڑا خوش ہوتا اور انہیں بار بار پڑھتا۔ اس نے آج کا سبق شروع کیا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ کے ہاں ایک انسان پیش ہوگا تو باری تعالیٰ اس سے پوچھیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔اے ابن آدم! میں بیمار رہا' تو میری عیادت کو نہ آیا۔۔۔۔۔۔۔''

اور فضلو ساکت ہو کر رہ گیا۔ اس نے تو کبھی یہ جاننے کی کوشش بھی نہ کی تھی کہ اللہ تعالیٰ رہتا کہاں ہے۔ اسے کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ بیمار کب ہوا۔ لرزتے لرزتے اس نے اگلی سطریں پڑھیں۔

''اللہ تعالیٰ پوچھیں گے۔۔۔۔۔۔۔اے ابن آدم! میں بھوکا تھا' تیرے پاس آیا' تو نے مجھے کھانے کو نہ دیا۔''

فضلو حیران رہ گیا اور سوچنے لگا۔ ''اللہ تعالیٰ میرے پاس تو کبھی نہ آیا۔ میرے پاس آیا ہوتا تو میں خود بھوکا رہتا لیکن اللہ کا پیٹ تو ضرور بھر دیتا۔'' اور وہ سوچنے لگا۔۔۔۔۔۔۔۔فضلو ساری زندگی تو نے خدا سے بے نیازی میں گزار دی۔ تو نے کبھی اس کے بارے میں جاننے کی کوشش نہ کی۔ شاید خدا تجھ سے ناراض رہا۔ تبھی تو وہ بھوکا رہ کر بھی تیرے پاس نہ آیا۔ اسی فکر میں غلطاں اس نے اگلی سطریں پڑھیں۔

''اے ابن آدم! میں پیاسا تھا' تو نے میری پیاس تک نہ بجھائی۔''

اور فضلو میں مزید پڑھنے کی تاب نہ رہی۔ خدا کے لیے تو اس کے دل کے گوشے گوشے میں بڑی عزت تھی۔ نماز جمعہ پڑھنے جاتا تو اس نے بہت بعد میں شروع کیا تھا اور نماز اور دعا اس نے بہت بعد میں سیکھی تھی۔ لیکن خدا کی حمد وثنا تو وہ ہمیشہ کرتا چلا آیا ہے۔ ہاں البتہ اس نے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کبھی نہ کی تھی۔ اور اب وہ بری طرح پچھتا رہا تھا کہ وہ خدا جس کی اتنی عزت وہ کرتا رہا ہے اتنی تکلیفوں میں مبتلا رہا۔ بھوک و پیاس سے بے حال رہا لیکن اسے خبر نہ ہوئی۔ بیماریوں نے اسے ادھ موا کیے رکھا لیکن وہ اس کی عیادت کو نہ گیا۔

مولوی صاحب کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور آنکھیں میچ کر گڑگڑا کر خدا سے التجا کی کہ وہ اسے توفیق دے کہ وہ اس کے گھر کا پتہ چلا سکے۔ تب وہ اس کی عیادت کو آئے گا۔ اور یہ کہ وہ بھوکا یا پیاسا ہو تو بلا تکلف اس کے پاس چلا آئے۔

دعا کے بعد اسے یوں لگا جیسے خدا نے اس کی بات سن لی ہو۔ اور آئندہ خدا اس کے ہاں آئے گا اور وہ خدا کے استقبال کی تیاریوں کے منصوبے بناتا نیند کی وادی میں کھو گیا۔

دوسری صبح وہ منہ اندھیرے اٹھا' چاروں طرف کہر سی پھیلی ہوئی تھی۔ سخت سردی کا عالم تھا۔ برف روئی کے گالوں کی طرح گر رہی تھی اور ہر چیز پر سفیدی ہی سفیدی بکھر گئی تھی۔ تاریکی اتنی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اور فضلو یہ سوچ کر مسکرا دیا کہ شاید اللہ تعالیٰ سب کے سامنے اس کے ہاں نہیں آنا چاہتا اس لیے اس نے کہر اور دھند پھیلا دی ہے تاکہ چھپ کر آ سکے۔ اس نے کٹیا کو اچھی طرح صاف کیا' ہر چیز کو قرینے سے لگایا۔ انگیٹھی میں کوئلے دہکائے' کیتلی کو چمکا کر اس میں قہوے کا پانی رکھا اور پھر مشین پر بیٹھ کر سلائی کے ساتھ ساتھ خدا کا انتظار کرنے لگا۔

کرچ۔۔۔۔۔۔کرچ۔۔۔۔۔۔کرچ۔۔۔۔۔۔کرچ۔۔۔۔۔۔!

برف پر کسی کے چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ فضلو کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس نے ہاتھ روک لیا۔ کھڑکی میں سے جھانکنے کی کوشش کی لیکن کچھ دکھائی نہ دیا۔ تاہم قدموں کی چاپ قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ دیوانگی کے عالم میں باہر آ گیا اور آواز کی جانب لپکا۔ لیکن یہ تو کریمو تھا۔۔۔۔۔۔ گاؤں کا جولاہا' جو سارا دن اپنی کھڈی پر کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ لوگوں کے لیے کپڑے بنا کرتا۔ فضلو مڑنا ہی چاہتا تھا کہ کریمو کو زور سے کھانسی آئی اور وہ پیٹ پکڑ کر برف پر ہی بیٹھ گیا۔ فضلو آگے بڑھا' بازو پکڑ کر اسے سہارا دیا اور اپنے ساتھ کٹیا میں لے آیا۔ حال چال پوچھا تو معلوم ہوا کہ عرصے سے اسے کھانسی کا دورہ پڑتا ہے اور جب کھانسی آتی ہے تو وہ بالکل بے حال ہو جاتا

ہے۔ فضلو کو اس پر بڑا ترس آیا۔ اس نے کیتلی کو انگیٹھی پر رکھ دیا اور کریمو کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ اس نے کریمو سے پوچھا کہ اس نے اتنے دنوں تک اسے بتایا کیوں نہ تھا کہ وہ بیمار ہے۔ ایک طنزیہ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر گئی اور وہ بولا۔ ''کون کسی کی پروا کرتا ہے' فضلو! اپنے دکھ کسی کو سنانے سے فائدہ۔۔۔۔۔۔؟''

اور جیسے فضلو کے کلیجے پر ایک تیر سا جا لگا ہو۔ اس نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور انگیٹھی میں سلگتے کوئلوں کو جھاڑنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے چائے تیار کی اور بڑے اشتیاق سے کریمو کو پلائی۔ پھر وہ اندر والی کوٹھڑی میں گیا' اپنے بٹوے میں سے کچھ رقم نکال کر لایا اور چپکے سے کریمو کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔ ''کریمو! لو یہ تمہارے علاج کے لیے ہیں' میں کوئی احسان نہیں کر رہا ہوں۔ بس چپکے سے رکھ لو۔''

فضلو نے کچھ اس خلوص اور ادا سے اسے رقم دی تھی کہ وہ انکار نہ کر سکا اور اس نے پیسے لے لیے۔ فضلو سے چھوڑنے کے لیے باہر تک آیا۔ رخصت ہوتے وقت کریمو کے چہرے پر طمانیت کی سرخی بکھری ہوئی تھی۔

جونہی وہ اپنی نشست پر آ کر بیٹھا اسے اچانک خدا کا خیال آیا۔ خدا ابھی تک نہ آیا تھا۔ وہ سلائی میں مصروف ہو گیا کہ ابھی تو کافی دن پڑا ہے۔ ایک پہر ڈھلنے پر اس نے سلائی چھوڑی اور اپنا کھانا پکانے لگا۔ اس نے برتنوں کو خوب صاف کیا اور سالن کی مقدار بھی زیادہ رکھی' جانے کب خدا آ جائے۔ کھانا پکا کر اس نے ڈھانپ کر رکھ دیا اور پھر سلائی میں مصروف ہو گیا کہ خدا کے آنے پر اکٹھے ہی کھائیں گے۔ دوپہر ڈھل گئی اور خدا نہ آیا۔

تنگ آ کر اس نے کھانا کھا لینے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اپنی نشست سے اٹھا ہی تھا کہ اسے باہر کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی اور وہ بے اختیار باہر آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ملی سر جھکائے قصبے کی طرف گھر کو جا رہا تھا۔ چہرے پر نقاہت ہویدا تھی اور قدموں میں لڑکھڑاہٹ۔ انتظار کی اکتاہٹوں سے گھبرائے فضلو نے ملی کو آواز دی۔ اس نے اس کی طرف دیکھا اور چپ چاپ کھڑا رہا۔ وہ اس کے قریب گیا اور بغل میں ہاتھ ڈال کر اپنے ساتھ اندر لے آیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آج سارے دن کی دوڑ دھوپ کے بعد بھی اسے کوئی مزدوری نہ مل سکی تھی۔ وہ گھر جانا چاہتا تھا کیونکہ وہاں دو دنوں سے بھوک سے بلکتے بچے اس کے منتظر ہوں گے۔ اس کی وفا شعار بیوی جانے کیونکر انہیں بہلا رہی ہو گی۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ رات بھی بھوکے پیٹ ہی بسر کرنا ہو گی۔

فضلو دہل کر رہ گیا۔ اس نے کھانا نکالا' ملی کو پیٹ بھر کر کھلایا۔ دو دنوں کے بھوکے ملی نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا تو اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اور وہ انگیٹھی کے قریب ہی ٹانگیں پھیلا کر آرام سے گہری نیند سو گیا۔ فضلو اٹھا' بازار گیا اور کھانے پینے کی بہت سی

چیزیں خرید لایا۔ واپس آ کر ان تمام چیزوں کا اس نے ایک بنڈل بنایا۔ ملی ابھی تک خراٹے لے رہا تھا۔ اسے اٹھایا اور بنڈل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اسے جلد از جلد گھر پہنچنے کی تلقین کی۔ ملی نے ٹٹول کر محسوس کیا کہ اس میں کھانے پینے کی چیزیں ہیں تو اس کی آنکھوں میں آنسو سے تیر گئے۔ ان جھلملاتے آنسوؤں میں جانے کیسی چمک تھی' فضلو کو ایسا لگا جیسے یہ چمک اس کی آنکھوں میں منتقل ہو کر وہیں ٹھہر گئی ہو۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ رات کی تاریکیاں بڑھ چلی تھیں۔ فضلو سارے دن کے انتظار کے بعد تھک چکا تھا۔ اس کے دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ خدا اس کے گھر نہ آیا تھا۔ اس نے لالٹین جلائی اور حدیث کی کتاب نکالی۔ گزشتہ دن کے سبق کو دہرایا اور پھر جھک کر کے آگے پڑھنے لگا۔

بندہ (حیران ہو کر) خدا سے پوچھے گا۔ ''اے خدا میں کیونکر تیری عیادت کرتا' تو تو تمام جہانوں کا پالنہار ہے (تو کیونکر بیمار ہو سکتا تھا) اور اے خدا میں کیسے تجھے کھانا کھلاتا' کہ تو تو سارے جہانوں کا رب ہے (سارے جہانوں کا رزاق ہے' خود رزق کا محتاج کیونکر ہو سکتا ہے) اور اے میرے اللہ! میں تجھے پانی کہاں پلاتا تو تو رب العالمین ہے۔ (دونوں جہانوں کی مخلوق کا خالق بھوک اور پیاس میں کیونکر مبتلا ہو سکتا ہے)

فضلو کی دلچسپی بڑھ گئی۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہ تھا کہ خدا کو بھلا ان چیزوں کی کیا حاجت۔ وہ بڑے انہماک سے بندے اور خدا کے درمیان ہونے والی گفتگو پڑھنے لگا۔

''تب خدا فرمائے گا' کیا تو نہ جانتا تھا کہ فلاں شخص بیمار ہے۔ جب تو جانتا تھا تو اس کی عیادت کو کیوں نہ گیا۔ اگر تو اس کی عیادت کو جاتا تو بے شک مجھے بھی وہاں پاتا۔''

''اور کیا تجھے معلوم نہ تھا کہ فلاں شخص بھوکا ہے' تب اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو مجھے پالیتا۔''

''اور فلاں آدمی نے تجھ سے پانی مانگا تھا تو تو نے اسے پانی نہ پلایا۔ اگر تو اسے پانی پلاتا تو مجھے پالیتا۔''

تب فضلو کو کریمو کے چہرے پر بکھرتی سکون کی جھلک اور ملی کی آنکھوں میں تیرتی چمک یاد آئی اور اسے ایسا لگا جیسے اس کی آنکھیں روشن ہو گئی ہوں اور سارے جہاں کا اطمینان اس کے دل میں سمٹ آیا ہو۔

◆◆◆

بنک اکاؤنٹ

ٹھٹھرتی سردیوں کی وہ شام بوٹے پر بہت بھاری گزری۔ زمین تھوڑی تھی' وہ بھی بارانی۔ گندم کی فصل بس اتنی ہوئی تھی کہ گاؤں کے درزی' دھوبی' نائی' لوہار اور دوسرے کمیوں کا حصہ دینے کے بعد گھر کا خرچ بمشکل چلتا' لیکن اور اخراجات بھی آ پڑے۔ بڑے بیٹے نے دسویں کا امتحان پاس کر لیا تھا اور اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو شہر کے کالج میں داخل کروائے۔ داخلے میں تو کوئی دقت پیش نہ آئی تھی لیکن کالج کے ماحول کے مطابق کپڑے لتے شہر سے سلوانے پڑتے۔ پھر آنے جانے میں اس کا خاصا وقت صرف ہو جاتا۔ وہ چراغ جلے گھر پہنچتا' کھانا کھا کر مٹی کے تیل کے چراغ کی روشنی میں سر جھکائے پڑھتا رہتا۔ بوٹے نے سوچا اسے ہاسٹل میں داخل کروا دوں تو آنے جانے میں جو وقت صرف ہوتا ہے وہ بھی پڑھائی میں لگا سکے گا اور رات کو پڑھنے کی ضرورت ہوئی تو بجلی کی روشنی میں باآسانی پڑھ بھی سکے گا۔ فرمانبردار بیٹے نے بہتیرا منع کیا لیکن بوٹے نے اسے ہاسٹل میں داخل کروا دیا۔ باقی بچوں نے بھی امتحان پاس کر لیے تھے اور نئی کلاسوں کے لیے کتابوں' کاپیوں کا خرچ آ پڑا تھا۔ اس نے گھر میں استعمال کے لیے ذخیرہ گندم بیچ کر تمام اخراجات پورے کیے تھے۔ آنے والے دنوں کا معاملہ اس نے خدا کے سپرد کر دیا تھا۔

بوٹا خود پڑھا لکھا نہیں تھا۔ گاؤں کے پڑھے لکھے افراد بھی انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے لیکن جانے کب وہ عرفان کی کس منزل سے گزرا کہ اس نے تہیہ کر لیا کہ اپنے بچوں کو خوب پڑھائے گا۔ بیٹی کے بارے میں تو اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی کہ گاؤں میں صرف پرائمری سکول تھا اور پانچویں سے آگے پڑھنے کے لیے لڑکیوں کو ساتھ والے گاؤں میں بھیجنا پڑتا تھا اور محض پڑھائی کے لیے لڑکیوں کو دوسرے گاؤں بھیجنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن بیٹوں کی پڑھائی میں ایسی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اس کی بیوی بھی صابر اور قناعت پسند تھی۔ اس نے کبھی ہاتھ کی تنگی کی شکایت نہ کی۔

اب جو بیٹے نے بتایا کہ سردیوں کے لیے اسے کچھ کپڑوں اور فیسوں کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے تو اسے اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ گاؤں کے چوہدری سے کچھ قرض لے لے۔ چوہدری کا اپنا ایک بیٹا اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت گیا ہوا تھا۔ بیٹی تک شہر میں پڑھتی تھی۔ ایک چمکتی دمکتی کار اسے روزانہ کالج لایا' لے جایا کرتی۔ بوٹے نے سوچا چوہدری کو علم کی قدر ہے' جب وہ اسے بتائے گا کہ اسے اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے قرض کی ضرورت ہے تو وہ بخوشی قرض دے دے گا۔ قرض تو اس نے دے دیا تھا لیکن چھوٹے

ہی پوچھا تھا۔ ”توں ڈپٹی کمشنر لوانا اے اپنے پتراں نوں پڑھا کے؟“ پھر منشی کو پیسوں کی ادائیگی کے لیے کہتے ہوئے بھی اس نے طنزاً کہا تھا۔ ”دے دے بھئی اسے پیسے‘ شوق پورا کر لینے دے اسے بیٹوں کو کچھ دن پڑھانے کا۔“

بوٹے پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس کا بس چلتا تو الٹے قدموں لوٹ آتا لیکن گاؤں کی زندگی ایسی ہی ہوتی ہے۔ چوہدری سے اپنی ضرورت کے اظہار کے بعد وہ اس کی ”فراخ دلانہ پیشکش“ کو ٹھکرا بھی نہ سکتا تھا۔

پیسے تو وہ لے آیا تھا لیکن سردیوں کی وہ شام اس پر بہت بھاری تھی۔ چوہدری کا لہجہ برما بن کر اسے چھیدتا رہا۔ کیکر کے درخت سے ٹیک لگائے وہ ڈوبتے سورج کو دیکھتا رہا اور چھلنی ہوتا رہا۔ سورج ڈوب گیا۔ فضا کی نمی ٹھنڈکوں میں بدل گئی۔ اسے سردی لگی تو بوجھل دل کے ساتھ اٹھا اور گھر کی طرف چل دیا۔

گھر پہنچا تو سب سے چھوٹا بیٹا خوشیا اس سے لپٹ گیا اور فخر سے بتایا کہ وہ اپنی کلاس کے ایک ٹسٹ میں دوسرے نمبر پر آیا تھا۔ (چوہدری کے بیٹے کا کلاس فیلو ہو کر وہ اول تو کبھی نہ آ سکتا تھا) اور ماسٹر جی نے انعام میں اسے ایک پنسل اور ایک سنگترہ دیا تھا۔ عام سا سنگترہ ہوتا تو وہ اسے کھا پی کر کبھی کا برابر کر چکا ہوتا لیکن یہ انعام کا سنگترہ تھا اور اس نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ بوٹے کی اداسی دور ہو گئی اور اس کے چہرے پر خوشیوں کے رنگ بکھر گئے۔ سنگترے کو بڑے اہتمام سے چھیلا گیا اور اس کی پھانکیں سب گھر والوں میں تقسیم کی گئیں۔ ننھا خوشیا سب سے بڑے اشتیاق سے پوچھتا رہا کہ سنگترہ مزیدار تھا نا۔

رات کو کھردری چارپائی پر لیٹتے ہی بوٹے کے ذہن میں پھر چوہدری کے الفاظ گونجنے لگے۔ لیکن اب ان میں وہ کاٹ نہ تھی۔ بیٹے کی چھوٹی سی کامیابی نے چوہدری کے الفاظ کے نشتر کند کر دیئے تھے۔

اگلی فصل اٹھائی تو سب سے پہلے اسے چوہدری کا قرض لوٹانے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ وہ بڑی حویلی پہنچا تو چوہدری نے خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا۔ اسے موڑھے پر بٹھایا اور بڑی نرمی سے اس کے بال بچوں کی خیریت دریافت کی اور جب بوٹے نے اندرونی واسکٹ کی جیب سے پیسے نکال کر منشی کی طرف بڑھائے تو چوہدری نے بڑی ملائمت سے کہا۔

”کیوں اپنی کمائی اندھے کنویں میں ڈالتے رہتے ہو‘ جوان بیٹے بڑھاپے کا سہارا ہوتے ہیں‘ انہیں اپنے ساتھ کام پر لگاؤ۔“

اور جیسے بوٹے کے کانوں میں پگھلا سیسہ انڈیل دیا گیا ہو۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ چوہدری کا منہ نوچ لے۔ اس سے پوچھے کہ بچوں کو تعلیم دلانا اگر کمائی کو اندھے کنویں میں ہی ڈالنا ٹھہرا تو اس کا بیٹا ولایت کیا کرنے گیا تھا‘ اس کی بیٹی روزانہ شہر کیا کرنے جاتی ہے اور۔۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔۔ وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

”چوہدری جی! میں تو اپنی کمائی بنک میں ڈال رہا ہوں‘ شاید کبھی منافع دے۔“

اور چوہدری کے لہجے میں ساری ملائمت زہر ہو گئی‘ بولا۔

”شاوا بئی وڈے شاؤ کارا“

بوٹا سلام کر کے چلا آیا۔ پھر وہ اپنی ہڈیوں کا گودا گلاتا رہا‘ گرمیوں کی دوپہریں اپنے ننگے پنڈے پر سہتا رہا اور سردیوں کی طویل راتیں اس نے کھیتوں کی رکھوالی میں کاٹ دیں۔ فصل اچھی نہ ہوئی تو بکریاں پالیں‘ مویشی چرائے‘ پھلوں کے باغوں کی راکھی کی‘ غرض سب کچھ کیا لیکن قرض کے لیے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔ بچے تعلیم حاصل کرتے رہے۔

چھوٹا بیٹا خوشی محمد سب کا لاڈلہ تھا۔ سب اس کے ناز سہتے اور اس کی چھوٹی چھوٹی خوشی کا خیال رکھتے۔ دیہات میں رہتے ہوئے گھر کا ماحول ایسا ہو جاتا کہ ہر کوئی علم کا شیدائی ہو‘ ناممکن بات لگتی ہے لیکن ایسا ہو گیا تھا۔ بوٹا تھکا ہارا گھر آتا تو کوئی کاپیوں پر جھکا ہوتا‘ کوئی کتاب میں مگن ہوتا۔۔۔۔۔۔۔ اور اس کی دن بھر کی تھکن کافور ہو جاتی۔

ایک دن وہ گھر لوٹا تو خوشی محمد اس سے لپٹ گیا۔ اس نے نویں جماعت کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ خبر سناتے ہوئے اس نے پیار سے باپ کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے تو سن رہ گیا۔ کھردرے ہاتھ تو وہ دیکھتا آیا تھا لیکن اس دن کا کھردرا پن سوا تھا۔ ناخنوں پر مٹی بھری تھی اور انگوٹھا زخمی تھا‘ سوج کر کپا ہو گیا تھا۔ بیٹے کو علم تھا کہ ساتھ والے گاؤں میں جس چوہدری نے ٹیوب ویل لگوایا تھا‘ اس کا باپ اس کے کھیتوں میں دھان لگاتا رہا تھا۔ پانی بھرے کھیتوں میں لاب لگاتے ہوئے کانٹے تو چبھتے ہی رہتے ہیں لیکن اس دن خوشی محمد کے دل میں بھی ایک پھانس اتر گئی۔ اس کا باپ سرتاپا ایثار بنا بیٹوں پر قربان ہوا جا رہا تھا اور خود چراغ سحری بن کر رہ گیا تھا‘ بجھا چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ بیٹے کی آنکھوں میں تیرتی نمی دیکھ کر باپ نے پیار سے لپٹا لیا اور بولا۔

”بیٹا! میرے ہاتھ مٹی میں اس لیے لتھڑے رہتے ہیں کہ تمہارے ہاتھ صاف ستھرے دیکھ سکوں۔“

میٹرک کے بعد خوشی محمد نے آگے پڑھنے سے صاف انکار کر دیا اور باپ کا سہارا بننے کو ایک کوآپریٹو بنک میں ملازمت کر لی۔ سستا زمانہ تھا۔ بیس روپے تنخواہ بہت لگتی تھی۔ پہلی تنخواہ اس نے باپ کے ہاتھ پر لا کر رکھی تو اس نے سب سے پہلے سوا روپے کا مٹھائی کا ٹوکرا منگوایا۔ گاؤں کے مولوی صاحب سے ختم دلوایا اور مٹھائی گاؤں والوں میں تقسیم کر دی گئی۔

کوآپریٹو بنک میں خوشی محمد صرف چھ ماہ ملازمت کر سکا۔ ایک دفعہ بنک کا قرض نہ لوٹانے پر گاؤں کے ایک غریب آدمی کے گھر کی قرقی کا فیصلہ ہوا اور کاغذات خوشی محمد نے تیار کیے۔ فیصلہ خوشی محمد کا نہیں تھا لیکن گاؤں والوں کے لیے دفتر کا بابو ہی سب کچھ ہوتا

ہے۔ رموزِ مملکت سے آشنائی ویسے بھی ہر کسی کے بس کی بات کہاں۔ وہ شکایت لے کر بوٹے کے پاس آئے۔ اس نے عزت سے بٹھایا اور انتظار کرنے کو کہا۔ خوشی بابو گھر لوٹا تو باپ کو ڈبڈبائی آنکھوں سے مہمانوں کی خاطر مدارت کرتے پایا۔ باپ بیٹے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ باپ کے کچھ کہے بغیر ہی بیٹا سمجھ گیا۔ بھاگ دوڑ کر کے اس نے قرقی تو رکوا دی لیکن ساتھ ہی استعفیٰ بھی داغ دیا۔

چند دن گھر میں گزارنے کے بعد وہ جالندھر شہر گیا اور بھرتی کے دفتر میں پیش ہو گیا۔ اکہرے بدن کا آدمی تھا۔ طبی معائنہ میں وزن کم نکلا۔ دلگیر و اداس ہو کر لوٹنے کو تھا کہ ایک مسلمان صوبیدار سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے حال پوچھا اور بھرتی افسر کے پاس لے گیا۔ کہا کہ اسے رکھ لیں' کھائے پیئے گا تو وزن پورا ہو جائے گا۔ اور یوں خوشی محمد فوج میں بھرتی ہو گیا۔ کاغذات کی خانہ پری کے بعد اسے اینیمل ٹرانسپورٹ رجمنٹ کے ٹریننگ سنٹر میں بھیج دیا گیا۔ یہاں زندگی سخت تھی۔ وہ خوشیا جو بہن بھائیوں کی تمام تر چیخ و پکار پر کروٹیں بدلتا رہتا تھا' حوالدار میجر کی ایک وسل پر جھٹ پٹ اٹھ کھڑا ہوتا اور آناً فاناً تیار ہو کر پریڈ میں جا شامل ہوتا۔

چھ ماہ کی تربیت کے بعد اسے ایک اے ٹی (Animal Transport) رجمنٹ میں بھیج دیا گیا۔ یہاں ریکروٹمنٹ کی زندگی کی سی بھاگ دوڑ تو نہیں تھی لیکن کوئی خاص آسائش بھی میسر نہ تھی۔ وہ نیا سپاہی تھا اس لیے بہت سے مشکل کام اس کے ذمے تھے۔ منہ اندھیرے اٹھ کر صاحب لوگوں کی گھڑ سواری کے لیے گھوڑوں پر زین کسنا' تھانوں کی صفائی' چارے کا انتظام' گھوڑوں کی مالش اور اسی طرح کے اور بہت سے کام۔

ایک دن شام کے وقت بوٹا اس سے ملنے آیا۔ خوشی محمد گھوڑوں کے تھانوں کی لپائی سے فارغ ہی ہوا تھا اور ہتھ گاڑی میں جمع کی ہوئی لید کو کوڑی میں پھینکنے جا رہا تھا' ہاتھ لید اور کیچڑ میں لت پت تھے۔ رجمنٹل پولیس کا سپاہی بوٹے کو ملانے وہیں لے آیا تھا۔ یونٹ کے گیٹ پر کھڑے ہوئے سپاہی چمکتی دمکتی وردی میں ملبوس ہوتے ہیں۔ بیرونی گیٹ کے آس پاس ہی کوارٹر گارد ہوتی ہے جہاں وار ٹرافیاں' یونٹ کا نشان اور دوسری چیزیں جگمگا رہی ہوتی ہیں۔ بوٹے نے یہ سب کچھ دیکھا تو وہ اپنے خوشیا کو بھی لشکتی ہوئی وردی میں دیکھنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ لیکن باغ کے نظام میں ہر عنصر پھول تو نہیں ہوتا۔ پھول کھلانے میں مٹی کے ان ذرات کا بہت ہاتھ ہوتا ہے جو پودے کی جڑوں میں واقع زمین سے خوراک کھینچتے رہتے ہیں۔ بوٹے نے اپنے لاڈلے خوشیا کو اس حال میں پایا کہ وہ خاکی رنگ کی ایک نیکر میں ملبوس تھا' پاؤں گرد آلود تھے اور ہاتھ میں کیچڑ میں لت پت۔ خوشی محمد نے ہتھ گاڑی کو زمین پر ٹکایا اور بے تابانہ آگے بڑھا لیکن پھر ہاتھ کھینچ لیے مبادا باپ کے ہاتھ آلودہ ہو جائیں۔ بوٹے کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ اس نے بیٹے کو سینے سے لگا لیا جو اپنے ہاتھوں کو باپ کے اجلے لباس سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

یونٹ کینٹین پر چائے پیتے ہوئے باپ کی آنکھوں میں بہت سے سوال تھے۔ سب سے بڑا سوال تو یہ تھا کہ میرے ہاتھ تو مٹی میں اس لیے لتھڑے رہتے تھے کہ تمہارے ہاتھ صاف ستھرے دیکھ سکوں' لیکن یہ کیا؟ کیا واقعی میری کمائی اندھے کنویں میں گر گئی؟ خوشی محمد نے تسلی دے کر باپ کو رخصت کر دیا۔

دن سدا ایک سے نہیں رہتے۔ ایک دن خوشی محمد اپنے کام میں مصروف تھا کہ یونٹ کا آفیسر کمانڈنگ کیپٹن میکنزی ادھر آ نکلا۔ خوشی وردی میں تھا اور اس کے بازو پر E کا بیج لگا ہوا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ شخص انگریزی میں بات چیت کر سکتا ہے۔ کیپٹن میکنزی نے اس سے مختصر گفتگو کی اور پھر اسے اپنے دفتر میں سٹک اردلی (Stick Orderly) رکھ لیا۔ سٹک اردلی ہوتا تو قاصد ہی ہے لیکن اس کی شان نرالی ہوتی ہے۔ وہ کمانڈنگ آفیسر کے خاص احکامات پہنچانے پر مامور ہوتا ہے۔ وردی پر ایک خاص سیش (Sash) پہنتا ہے اور بغل میں ایک خوبصورت سٹک دبائے رکھتا ہے۔

خوشی نے اپنے فرائض بڑی پھرتی اور مستعدی سے انجام دیئے اور فرصت کے لمحات میں کتابوں کو رفیق بنائے رکھا۔ جلد ہی اسے لانس نائیک بنا دیا گیا۔ نائک بننے کے لیے بھی اسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اور یونٹ میں ایک ویکینسی نکلی تو اسے حوالدار بنا دیا گیا۔ پھر ایک موقع پر آفیسر کمانڈنگ نے جونیئر کمیشن دینے کی سفارش کے ساتھ اس کے کاغذات اوپر بھجوا دیئے۔

پاکستان بنا تو جالندھر دوسرے شہروں کی طرح طوفانوں کی زد میں آ گیا۔ بوٹا تنکا تنکا کر کے جو آشیانہ بنا رہا تھا' بکھرنے کو تھا۔ بوٹا گرچہ سیاسی میدان میں سرگرم عمل نہیں تھا لیکن گاؤں کے بہت سے لوگ بس اس وجہ سے شہید ہو چکے تھے کہ کلمہ گو تھے۔ بوٹے نے ہجرت کی۔ مال اسباب سمیٹنے کا وقت تھا نہ ذرائع۔ اس نے بیوی بچوں کا ہاتھ پکڑا اور پاکستان کی راہ لی۔

شیخوپورہ کے قریب ایک دیہات میں گاؤں والوں نے ٹھکانہ کیا۔ بوٹا بھی وہیں آ پہنچا۔ مہاجرین کی بحالی کے اقدامات شروع ہوئے تو دیہی علاقوں میں ایک ایکڑ فی نفر کے حساب سے زمین تقسیم ہوئی۔ بوٹے کے حصے میں نو ایکڑ زمین آئی۔ بچی کھچی پونجی سے اس نے بیلوں کی ایک جوڑی خریدی' ایک ہل بنوایا اور اللہ کا نام لے کر کھیتوں میں ہل چلانے لگا۔ زمین زرخیز تھی۔ پہلی فصل پر ہی بوٹے کا گھر بھر گیا۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ بچوں کو لائل پور (فیصل آباد) کے ایک سکول میں داخل کروا دیا۔ لائل پور میں گاؤں کے کچھ لوگ جا بسے تھے وہاں داخل کروانے میں مصلحت یہی تھی کہ ان سے قربت رہے۔ باقی فصلوں سے آمدنی ہوئی تو انہیں لائل پور میں ایک گھر لے دیا۔ ایک بھینس لے دی کہ بچوں کو تازہ' خالص دودھ ملتا رہے۔

ہجرت کے وقت خوشی محمد بوٹے کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ نائب صوبیدار کی حیثیت سے ایک یونٹ کے ساتھ مہاجر قافلوں کی

حفاظت پر مامور تھا۔ ایک سال بعد وہ گھر آیا تو وردی میں ملبوس تھا اور اس کے شانوں پر ایک پھول جگمگا رہا تھا۔ پاک فوج میں اسے کمیشن مل گیا تھا۔ بوٹے کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملانے لگے۔ اس کے خوابوں کی تعبیر دیر سے نکلی تھی لیکن اچھی تھی۔

اس کے بعد کی کہانی اسی جدوجہد کے تسلسل کی داستان ہے جس میں بوٹا مصروف تھا۔ ایک چٹے ان پڑھ باپ کے بیٹے تعلیم حاصل کر کے عملی زندگی میں داخل ہوئے تو روشن ستاروں کی طرح جگمگائے۔ ایک نیوی میں کمانڈر ہے' اسلام آباد میں مارگلہ پہاڑیوں کے دامن میں ایک وسیع و عریض کوٹھی میں رہائش پذیر' سپید برف جیسی وردی میں ملبوس' بوٹا اسے دیکھتا تھا تو فخر سے اس کا سر بلند ہو جاتا۔ ایک پاک فوج میں میجر ہے۔ ایک بیٹا کراچی کی ایک مشہور فرم میں' ایک ملٹری انجینئرز سروس میں اور ایک واہ آرڈیننس فیکٹری میں۔ یوں بیٹوں کو خوشحالی کی راہوں میں گامزن کر کے بوٹا ۱۹۷۸ء میں انہیں ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ گیا۔

خوشی محمد بطور میجر فوج سے ریٹائر ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے چار بیٹوں سے نوازا۔ تین کی شادیاں ہو چکیں۔ ایک داماد پاک فضائیہ میں ائیر کموڈور ہے' ایک پاک فوج میں لیفٹیننٹ کرنل اور ایک کراچی میں سول ادارے میں اچھے عہدے پر فائز۔ سب سے چھوٹی بیٹی گریجویشن کر کے ایم اے میں داخلہ لے رہی ہے۔ خوشی محمد ریٹائر ہو کر پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ فرصت کے مشاغل بہت ہیں۔ گھر کے لان میں گلاب کی کیاریاں سنوارنا' پچھواڑے میں لگائی سبزیاں سینچنا' اخبار اور کتابیں پڑھنا' گاڑی کی دیکھ بھال اور دوستوں سے ملاقاتیں' خوش گپیاں۔

جالندھر کے اس گاؤں کا چوہدری زندہ ہوتا تو دیکھتا کہ بوٹے نے اپنی کمائی اندھے کنویں میں گرائی تھی یا واقعی بنک میں جمع کروائی تھی کہ جس کا نفع بے حساب اور برکتیں بے شمار ہیں۔

◆◆◆

بحر عرب کا موتی......موگادیشو

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فوج کا کام جنگ وجدال' قتال اور خونریزی ہے لیکن شاید بہت کم لوگوں نے اس پر غور کیا ہوگا کہ کسی ملک کے امن اور سکیورٹی کی ضمانت اس کی فوج ہی ہوتی ہے۔ جتنی فوج مضبوط ہوگی اتنی ہی پائیدار امن کی ضمانت اور فوج کی اصل قوت' قومی نظریہ اور اس نظریے سے وابستگی اور ایمان کی پختگی میں ہے۔ فوج کی تعداد' اس کے ساز و سامان اور اسے مہیا کئے جانے والے وسائل کا تعین وہ خطرات کرتے ہیں جو کسی ملک کی سلامتی کو درپیش ہوں۔ پھر وسائل کا براہ راست تعلق ملکی معیشت سے ہے۔ معاشی استحکام کے بغیر محض فوج پر بھروسہ سراب ہے۔ متحدہ روس کے پاس دنیا کی سب سے بڑی فوج تھی۔ جدید ترین اسلحے کے انبار انہیں میسر تھے لیکن نظریہ باطل ثابت ہوا' معیشت کی چولیں ڈھیلی ہوئیں تو فوج رہی نہ ملک۔

ہم نے بات یہ کہنے کے لیے شروع کی تھی کہ فوج صرف لڑائی بھڑائی ہی کے لیے استعمال نہیں کی جاتی بلکہ لڑائی کے بغیر بھی امن کی ضامن ہوتی ہے بلکہ آج کے دور میں تو بین الاقوامی پلیٹ فارم سے فوجوں کو امن کے قیام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

پاک فوج نے ۱۹۶۰ء سے قیام امن کی بین الاقوامی کوششوں میں حصہ لینا شروع کیا جب پہلی بار اس کے دستے کانگو گئے۔ ۱۹۶۲ء میں ہالینڈ اور انڈونیشیا کے درمیان ایک معاہدے میں طے ہوا کہ نیوگنی کا علاقہ ایک سال کے لیے اقوام متحدہ کی نگرانی میں رہے گا اور پھر انڈونیشیا کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اقوام متحدہ کی طرف سے نیوگنی میں پاک فوج کے دستے تعینات کئے گئے۔ پاک فوج کے افسر اقوام متحدہ کے مشاہداتی مشن میں بھی شامل رہے اور یمن' نمیبیا' عراق' کویت' مغربی صحارا' بوسنیا اور لائبیریا میں فرائض انجام دیتے رہے۔ کویت' کمبوڈیا' ہیٹی اور صومالیہ میں جنگ کے اثرات زائل کرنے' بارودی سرنگیں صاف کرنے' باہم دست بگریباں قبیلوں کو لڑائی سے روکنے اور ملکی باشندوں کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے میں پاک فوج نے اہم خدمات انجام دیں۔

فیصلہ ہوا کہ عوام کی آگہی کی خاطر پاک فوج کی امن کوششوں پر ایک فلم بنائی جائے۔ تحقیق و تحریر کی ذمہ داری ہمیں سونپی گئی۔ فرنٹیئر فورس رجمنٹ کی ایک بٹالین کرنل رؤف کی قیادت میں صومالیہ جا رہی تھی' موگادیشو۔ ان کی روانگی میں دو دن باقی تھے جب حکم ہوا کہ ہم جی ایچ کیو کے فلاں شعبے میں رپورٹ کریں۔ فلاں شعبے سے وزارت خارجہ کے نام ایک خط لکھیں' وہاں سے یہ کام کرائیں' فلاں سے یہ ــــــــ پاسپورٹ اور دیگر کاغذات مکمل کر کے کرنل رؤف کے ساتھ بیٹھ جائیں۔ ہم بیٹھ گئے۔

۷۴۷ بوئنگ صبح ساڑھے سات بجے اسلام آباد کے ہوائی مستقر سے اڑا اور دو گھنٹے بعد کراچی اتر گیا۔ یہاں سے چونکہ سیدھا موگادیشو جانا تھا اس لیے ٹینک فل کروانے تھے اور۔۔۔۔۔۔ اور واشنگٹن سے موسم کی رپورٹ لینا تھی۔ مشن اقوام متحدہ کا' فوجی دستے پاکستان کے' سفر افریقہ کا اور موسم کی رپورٹ امریکہ سے آئی تھی چونکہ جہاز بھی امریکہ کا تھا اور عملہ بھی۔ پائلٹوں سے گفتگو کے بعد ہم ایئر پورٹ پر مٹر گشت میں مصروف ہو گئے۔ پاک فضائیہ کی شاہین فاؤنڈیشن کا ایک کارکن ''ٹگ ماسٹر'' لے کر آیا۔ اس سے انٹرویو فرمایا۔ وہ گاڑی نما مشین جس سے جہاز کو پیچھے کی طرف دھکیلا جاتا ہے ٹگ ماسٹر (Tug Master) کہلاتی ہے (رکشے کی طرح جہاز میں بھی ریورس گیئر نہیں ہوتے نا) یہ مشین خاصی مہنگی ہوتی ہے اور جب کوئی غیر ملکی جہاز پاکستان میں اسے استعمال کرتا ہے تو اس سے ڈیڑھ سو ڈالر کرایہ وصول کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سیڑھیاں' بیٹری چارجز' مسافروں کی انتظار گاہ' غرض کوئی بھی سہولت استعمال کی جائے اس کا کرایہ دینا پڑتا ہے (اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ مسافروں کی جیب سے وصول کیا جاتا ہے) یہ سب کچھ جاننے کے بعد ہماری سمجھ میں آیا کہ ہمیں کیوں جہاز ہی میں تشریف رکھے رہنے کو کہا گیا تھا۔ امریکی خاصی ''کفایت شعاری'' سے کام لے رہے تھے بلکہ ان کا بس چلتا تو شاید سیڑھیاں بھی نہ لگواتے لیکن مجبوری تھی کہ جہاز جہاں اترتا ہے وہاں سے بہت سے کاغذات کا تبادلہ کرنا ہوتا ہے۔ جن سہولتوں سے فائدہ اٹھایا گیا ہو' اس کے ووچروں پر پائلٹوں کے دستخط کرنا ہوتے ہیں' وغیرہ وغیرہ۔

آدھا دن گزر چکا تھا جب پائلٹوں نے روانگی کا اعلان کیا۔ کراچی سے اڑے تو تھوڑی دیر بعد بحیرۂ عرب کے اوپر تھے۔ آرمرڈ کور کے میجر (اب لیفٹیننٹ کرنل) زاہد ہمارے ہم سفر تھے۔ ان سے جہاز کے روٹ پر بات ہونے لگی تو نقشے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایئر ہوسٹس کو بلایا۔ مونیکا نام تھا اس کا۔ پوچھا' اٹلس مل جائے گی۔ مسکرائی اور چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں بوسیدہ سے اوراق تھے' کسی نقشے کی فوٹو سٹیٹ کاپیاں۔ ہم نے انہیں ہی غنیمت جانا اور کافی دیر بحیرۂ عرب کے ساتھ ساتھ واقع ممالک کے تاریخ جغرافیہ پر گفتگو کرتے رہے۔ اس دوران دو تین مرتبہ مونیکا آئی اور پوچھا کہ ''اٹلس فارغ ہو تو لے جاؤں؟'' جھنجھلا کر ہم نے اٹلس واپس کر دی۔

کراچی سے موگادیشو تک پانچ گھنٹے کی پرواز ہے۔ اس چارٹرڈ طیارے کے مسافر صبح ساڑھے چار بجے سے اسلام آباد ائیر پورٹ آئے بیٹھے تھے۔ اصولاً تو انہیں اب تک دو تین ناشتے اور موگادیشو پہنچنے سے پہلے ایک آدھ کھانا دیا جانا چاہیے تھا لیکن امریکیوں کی کفایت شعاری کی مہم جاری تھی۔ بے زبان مسافروں کو صرف ناشتہ دیا گیا جو ایک انڈے کے آملیٹ' ایک ڈنر رول اور ایک کباب پر مشتمل تھا۔ اکانومی کلاس کے تمام جوانوں میں جوس کے ڈبے بانٹ دیے گئے' افسر ہمارے فرسٹ کلاس میں تھے انہیں

یہ اضافی سہولت مہیا کی گئی کہ فسی مسکراتی ایئر ہوسٹس ہاتھ میں کاغذ پنسل لیے ہر ایک سے پوچھتی پھرتی تھی کہ وہ کیا پینا پسند کریں گے۔ جب مونیکا ہمارے پاس آئی تو جہاز یمن کے ساحل پر اڑ رہا تھا اور ہم کرنل رؤف اور کرنل زاہد کے ساتھ مل کر قوم سبا کی تاریخ دہرا رہے تھے۔ ملکہ سبا پر گفتگو کر رہے تھے' مشروبات کے انتخاب کی فرصت کسے تھی۔ ہم نے مونیکا سے کہا کہ وہ کوئی بھی سوفٹ ڈرنک لے آئے۔ تاریخ پر بحث کے دوران یہ ایک تاریخی غلطی ثابت ہوئی۔ وہ جو کچھ لے کر آئی گدلا گدلا سا تھا' نگلا جاتا تھا نہ پھینکا جاتا تھا۔ ہم کہ ٹھہرے روایتی مسلمان' کھانے پینے کے معاملے میں صرف ذائقوں ہی کے نہیں' پیشکش کی خوبصورتی کے بھی قائل ہیں۔ اس گدلے مشروب کو کیسے پی جاتے۔ بلا کر ایئر ہوسٹس سے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ اس نے بتایا' کاک ٹیل۔۔۔۔۔۔ کچھ سیب کا جوس' کچھ سنگترے کا رس' کچھ امرود کا ست' کچھ گاجر کی پھک' کچھ سیون اپ' کچھ کوکا کولا' یعنی کہ چوں چوں کا مربہ' جو مربہ بھی نہیں تھا۔ ہم حیرت سے ایئر ہوسٹس کو تک رہے تھے کہ کرنل رؤف نے وضاحت کی۔ ''جو لوگ ماضی میں ڈوب کر حال کو بھول جائیں' ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوتا ہے۔''

''یہ حال کی بات نہیں ہے' مستقبل میں بھی انہیں جو کچھ پینے کو ملے گا' وہ انہیں پسند نہیں آئے گا۔'' کرنل زاہد نے پیش گوئی فرمائی۔ ہم نے ایئر ہوسٹس سے درخواست کی کہ وہ شر پسندوں کی بات پر کان نہ دھرے اور ہمیں کوئی ایک مشروب لا دے' صاف سا' شفاف سا۔

''یہ بھی میں نے بڑی محنت سے بنایا تھا' صرف آپ کے لیے۔'' جاتے جاتے اس نے فرمایا۔ ہم نے داد طلب نظروں سے کرنل رؤف کی طرف دیکھا۔ ''دیکھا! امریکیوں سے کتنی مشقت بھرے کام لے رہے ہیں۔''

''ہاں' بچے ہوئے جوس کے جوٹھے ڈبوں سے قطرہ قطرہ نچوڑنا' تھا تو محنت طلب کام اور اسے شکل سے ہی پتہ چل گیا تھا کہ یہ محنت وہ صرف آپ کے لیے کر سکتی ہے۔'' کرنل رؤف نے وضاحت کی۔

پاکستان میں عصر کا وقت ہو گا جب جہاز صومالیہ کے دارالحکومت پہنچا۔ چونکہ پاکستان سے صومالیہ کا وقت دو گھنٹے پیچھے ہے اس لیے وہاں ابھی بھری دوپہر تھی اور تیز چمکدار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ موگادیشو کو کبھی بحر عرب کا سفید موتی کہا جاتا تھا اور جہاز نے اترنے سے پہلے جب شہر پر ایک چکر لگایا تو احساس ہوا کہ رکھنے والے نے اس کا بڑا صحیح نام رکھا تھا۔ بحر عرب کا صاف شفاف پانی زمرد کی طرح دمکتا ہوا۔۔۔۔۔۔ ساحل کے ساتھ ساتھ اور ذرا ہٹ کر جنگی جہاز کھڑے تھے' اکا دکا کشتیاں چل رہی تھیں اور ساحل کے بالکل قریب شاہراہیں اور انہیں زاویہ قائمہ پر کاٹتی ہوئی چھوٹی سڑکیں اور گلیاں جیسے کسی نے سفید کاغذ پر پیمانہ رکھ کر کالی پنسل سے

لکیریں کھینچ دی ہوں۔لیکن بلندی کم ہونا شروع ہوئی تو حسن ماند پڑنے لگا' دمکتا ہوا موتی گہنانے لگا۔عمارتیں گولیوں سے چھلنی ہو چکی تھیں' سڑکیں ویران تھیں' گلیاں سنسان۔صرف ائیر پورٹ پر چہل پہل نظر آتی تھی۔اس کے چاروں طرف کو براگن شپ ہیلی کاپٹر ایک دوسرے سے یکساں فاصلے پر بڑے سلیقے سے کھڑے ہوئے تھے۔ہم یہی سمجھے کہ ائیر پورٹ کی حفاظت کے لیے رکھے گئے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ امریکی فوجی واپس جاتے ہوئے اپنا جدید اسلحہ اور ساز و سامان سامان بھی واپس لیے جا رہے ہیں اور یہ ہیلی کاپٹر بھی۔پرانے' کھٹارا ہیلی کاپٹر پیچھے چھوڑے جا رہے ہیں۔ائیر پورٹ پر اترنے کے بعد قریب سے ان ہیلی کاپٹروں کو دیکھا تو پتہ چلا کہ امریکیوں نے انہیں نہلا دھلا کر' پالش کر کے' ان کے اردگرد پلاسٹک لپیٹ رکھا تھا کہ سمندر سے آنے والی نم آلود ہواؤں اور خشکی سے آنے والے گرد و غبار سے محفوظ ہیں اور وہ جنہوں نے کھٹارہ ہیلی کاپٹر اڑانے تھے' ان پر کیا گزرتی ہے' اس کی انہیں کوئی فکر نہ تھی۔اور وہ اتفاق سے پاکستانی تھے اور ہماری آمد سے ایک آدھ دن پہلے موگا دیشو پہنچے تھے اور جب ہم ائیر پورٹ سے ذرا دور ایک ایوی ایشن سکواڈرن میں جانے والے امریکی پائلٹوں سے پرانے ہیلی کاپٹروں کا چارج لے رہے تھے اور اس وقت کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ان ہیلی کاپٹروں کی پہلی اڑان ہی خطرناک ثابت ہوگی۔

آئی ایس پی آر کے میجر زاہد حسین چوہدری موگا دیشو ہی میں تعینات تھے اور ہمیں لینے ائیر پورٹ آئے ہوئے تھے۔انہوں نے ایک گاڑی میں بیٹھنے کو کہا جس کے ایک طرف یو این او کا اور دوسری طرف پاکستان کا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ائیر پورٹ کی حفاظت کے لیے بچھائی گئی خاردار تاروں کے درمیان سے گزرتے راستے پر ہوتے ہوئے جب ہم ائیر پورٹ کے بیرونی دروازے کے قریب پہنچے تو ڈرائیور نے اپنی طرف کا شیشہ چڑھاتے ہوئے ہم سے بھی درخواست کی کہ شیشہ چڑھا لیں۔حبس کا عالم تھا۔ہوا گرم تھی لیکن اچھی لگ رہی تھی اور ڈرائیور ہمیں اس سے بھی محروم کرنا چاہتا تھا۔ہم نے پس و پیش کی تو میجر زاہد نے وضاحت کی کہ ائیر پورٹ سے باہر مقامی جوان ملیں گے جنہیں حالات نے آوارگی پر مجبور کر دیا ہے۔وہ گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہیں اور جس کا جو کچھ ہاتھ آ جائے' اچک لیتے ہیں۔۔۔۔۔۔ٹوپی' عینک' گھڑی' قلم۔زیادہ تر لوگ مسلح ہوتے ہیں۔ایسے واقعات بھی ہو چکے ہیں کہ انہوں نے کسی کا ہاتھ تھام کر گھڑی اتارنا چاہی' مزاحمت ہوئی تو چھرے سے ہاتھ ہی کاٹ لیا۔ہم نے شیشہ چڑھانے ہی میں عافیت سمجھی۔

ائیر پورٹ کی عمارت سے باہر آئے تو واقعی نوجوانوں' بچوں بالوں کی ٹولیاں نظر آئیں۔کچھ نے ہماری گاڑیوں کے ساتھ ساتھ بھاگنے کی کوشش بھی کی۔ڈرائیور مشاق تھے' گاڑیاں صاف نکال لے گئے۔لیکن ہمارا دل کٹ کے رہ گیا۔تعلقات کی یہ کیا نوعیت تھی کہ جن کی مدد کو آئے تھے' ان سے اعتماد کے رشتے بھی قائم نہ ہو سکے تھے۔ہم اس پر کافی عرصہ غور کرتے رہے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ

یہ جو جنگ زدہ علاقوں میں امن قائم کرنے کے لیے اقوام متحدہ کی طرف سے بہت سے ملکوں سے تھوڑے دستے لے کر تعینات کر دیئے جاتے ہیں ان میں ایک خرابی ہے۔ہر ملک کی اپنی روایات ہوتی ہیں' اپنے مفادات اور اپنے اپنے نقطہ نظر۔محض اقوام متحدہ کے پرچم تلے کام کرنے سے ان کے رویے میں یکسانیت پیدا نہیں ہو جاتی۔صومالیہ میں پاکستانی دستوں کی تعداد بھی سب سے زیادہ تھی اور مذہب کے رشتے سے بھی ہمارے جوان پورے خلوص اور لگن کے ساتھ اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کرتے تھے۔

صومالیہ کے پڑھے لکھے لوگوں سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ اس بات پر پاکستان کے ممنون ہیں کہ اقوام متحدہ میں پہلی بار پاکستان کے نمائندے نے ان کے حق میں آواز اٹھائی اور یہ تجویز پیش کی کہ صومالیہ کو دس سال کے لیے اقوام متحدہ کی نگرانی میں چلایا جائے اور پھر آزاد مملکت قرار دے دیا جائے۔جنرل اسمبلی میں یہ تجویز منظور ہوئی اور اسی کے مطابق صومالیہ یکم جولائی ۱۹۶۰ء کو آزاد ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر ابھرا۔اس کا جغرافیائی نقشہ انگریزی کے عدد 7 سے ملتا جلتا ہے اور یہ پاکستان سے افریقہ کا قریب ترین ملک ہے۔

اقوام متحدہ کی طرف سے جب یہ فیصلہ ہوا کہ قحط کے ہاتھوں پریشان صومالیہ کے عوام کے لیے' ان کے معصوم بچوں کے لیے دودھ اور خوراک مہیا کی جائے تو مختلف ملکوں سے لیے گئے پچاس افسروں پر مشتمل ایک وفد کی قیادت ایک پاکستانی افسر بریگیڈیئر (اب میجر جنرل) امتیاز شاہین کر رہے تھے۔تجربہ یہ کہتا ہے کہ غربت آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی۔ہوتا یہ تھا کہ امدادی سامان کے جو کاروں صومالیہ کے مختلف علاقوں کو روانہ ہوتے تھے انہیں متحارب گروپ لوٹ لیتے تھے اور امدادی سامان صرف اپنے قبیلے کے افراد میں بانٹ دیتے تھے۔تب ضرورت محسوس ہوئی کہ بندرگاہ' ائیر پورٹ پر راستوں کو محفوظ کیا جائے۔اس مشن کے لیے جو پہلا فوجی دستہ ۱۴ ستمبر ۱۹۹۲ء کو موگا دیشو میں اترا' وہ بھی پاکستانی تھا۔فرنٹیئر فورس رجمنٹ سے تعلق تھا اس کا۔

پاکستانی کے روایتی حریف بھارت کے فوجی بھی وہاں تھے۔ان کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا۔وہاں اطالوی بھی تھے' انگریز بھی کہ صومالیہ جن کے زیر نگیں رہ چکا تھا اور جن کے خلاف طویل مزاحمت کے بعد انہوں نے آزادی حاصل کی تھی۔ان کے بارے میں احساسات و جذبات کا عالم کچھ اور تھا۔ہمارے ہوتے ہوئے دو اطالوی صحافیوں کو لوٹنے کی کوشش میں مزاحمت پر قتل کر دیا گیا۔اس سے اگلے روز ریڈیو اٹلی کی ایک خاتون رپورٹر مس الیریا الپی اور یوسنیا کا ایک کیمرہ مین حرو فتین دہشت گردوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے۔اس پر اقوام متحدہ کے صومالیہ میں ہیڈ کوارٹر (UNOSOM) (یونائیٹڈ نیشنز آپریشن فار صومالیہ) سے ہدایات جاری ہوئیں کہ آئندہ کوئی اقوام متحدہ کی گاڑی کو روکنے کی کوشش کرے یا جان کو خطرہ ہو تو فوراً گولی چلا دی جائے۔بھارت سمیت کئی ملکوں نے ان

ہدایات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی بار گولی چلائی اور کتنے ہی لوگ جاں بحق ہوئے۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ اقوام متحدہ کی وردی اور نیلی ٹوپی صلح و آشتی کی علامت نہ رہی اور ایک بار تلخیاں در آئیں تو پھر اجتماعی سوچ (Mob Mentality) میں اس بات کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے کہ کوئی یہ دیکھے کہ یہ یونیفارم پہن کس نے رکھی ہے۔ ایسا بھی ہوا کہ بھارتی فوجیوں نے پاکستانی دستوں کی ذمہ داری کے علاقے سے گزرتے ہوئے فائر کھول دیا۔ حرکتیں کسی کی اور ذمہ داری میں یکساں شریک تمام نیلی ٹوپی والے کہ روزمرہ کے واقعات کے بارے میں ''یونوسوم'' ہیڈکوارٹر سے صحافیوں کے لیے جو بریفنگ جاری کی جاتی تھی اس میں دستوں کی تخصیص نہیں کی جاتی تھی بلکہ سب کے سب اقوام متحدہ کے فوجی ٹھہرتے تھے۔ ایک بار میجر زاہد حسین چودھری نے غیر ملکی صحافیوں کو پاکستانی دستوں کی طرف سے فلاح و بہبود کے منصوبوں کے بارے میں بریفنگ کی کوشش کی تو یونوسوم کے باقاعدہ سرکاری ترجمان نے اس کا نہ صرف برا منایا بلکہ بدتمیزی پر اتر آیا۔ یہ الگ بات کہ بعد میں اس نے کھلے دل سے اس پر معذرت بھی کی۔

تو کہہ ہم یہ رہے تھے کہ مختلف ملکوں سے تھوڑے تھوڑے دستے لے کر جو ایک ہی شہر' گاؤں یا علاقے میں تعینات کر دیئے جاتے ہیں ان کی بجائے کسی ایک ملک کے دستے ہی پورے علاقے میں رہیں تو امن کی کوششیں زیادہ موثر ہو سکتی ہیں۔ جہاں زیادہ دستوں کی ضرورت پڑے تو کم از کم ایک شہر میں ایک ہی ملک کے دستے ہونے چاہئیں تاکہ برے ہوں یا بھلے' تمام واقعات کی ذمہ داری انہی پر ہو۔

تو ہم موگادیشو ائیرپورٹ سے پاکستانی بریگیڈ ہیڈکوارٹر کی طرف جا رہے تھے۔ شہر کو چھوڑتے ہوئے ایک لمبا چکر کاٹ کر ہم جس عمارت میں داخل ہوئے وہ اپنی اپنی سی' مانوس سی لگی' جیسے ہم پہلے بھی یہاں آ چکے ہوں۔ لیکن براعظم افریقہ میں تو ہمارا ورود مسعود پہلی مرتبہ ہو رہا تھا۔ ہم چکپے ہو رہے۔ میجر زاہد نے ہمیں جو مہمان خانہ دکھایا' کھانا کھا کر اس میں جا کر سو رہے کہ گزشتہ تین دنوں کی تھکن سے جسم ٹوٹ رہا تھا۔ جب تھکن بہت زیادہ ہو اور جسم بے چین ہو' تب بھی نیند گہری نہیں آتی۔ اٹھ بیٹھے۔ پیاس محسوس ہوئی۔ کمرے میں ایک فریج موجود تھا۔ اسے کھولا تو دنیا بھر کی نعمتوں سے بھرا پایا۔ دودھ کے ڈبے تھے' دختر رز یعنی انگور کا رس تھا' جوس تھا اور۔۔۔۔۔۔ اور آم۔۔۔۔۔۔ اور تربوز۔۔۔۔۔۔ یا اللہ یہ کس موسم کے پھل ہیں۔ جن لوگوں کو اس کا تجربہ ہے' وہ جانتے ہیں کہ انسان دو تین راتیں مسلسل جاگتا رہے تو بڑی مدہوش' مدہوش سی کیفیت میں ہوتا ہے۔ آنکھوں میں گلابی رنگ کے ڈورے' پلکیں مندتی ہوئی' قدم بہکتے ہوئے' گفتگو بے ربط سی' کوئی دیکھے تو کہے

ساری مستی شراب کی سی ہے

لیکن یہ مستی شراب کی نہیں' رت جگوں کی ہوتی ہے کہ دماغ کام کرنا چھوڑتا تو نہیں ہے رک رک کر کام کرتا ہے۔۔۔۔۔۔ تو ہم پر بھی کچھ ایسی ہی کیفیت طاری تھی۔ آم اور تربوز کی قاشیں دیکھ کر کچھ حیرت سی تو ہوئی لیکن سمجھ نہیں آئی کہ وجہ حیرت کیا ہے۔ آم کو کاٹ کر چکھا' بدمزہ سا تھا۔ ایک طرف رکھ دیا۔ پھر یاد آیا کہ ہم تو پانی پینے اٹھے تھے۔ فریج میں گرچہ دنیا بھر کی نعمتیں بھری تھیں لیکن گلہ سخت خراب تھا۔ دو تین دن کی تھکن' نزلہ زکام' کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ پانی پی کر لیٹ گئے۔ ذہن میں آم اور تربوز کی تصویریں ابھرتی تھیں اور ان پر ایک سوالیہ نشان۔ ہم جب پاکستان سے چلے تو موسم بہار تھا۔ سردیاں ابھی رخصت ہوئی تھیں اور ابھی تو ہمارا پہلا دن تھا۔ ابھی تو گرمیاں نہیں آئیں۔ ہاں' آم اور تربوز تو گرمیوں کے پھل ہیں جو ابھی شروع ہی نہیں ہوئیں۔۔۔۔۔۔ اوہو۔۔۔۔۔۔ برسوں پہلے پڑھے ہوئے جغرافیہ کے سبق یاد آئے۔ ہم ایسے ملک میں اترے تھے کہ خط استوا جس کے بیچ سے گزرتا تھا۔ پاکستان شمالی کرے میں ہے جہاں جب سردیاں ہوتی ہیں تو خط استوا کے پار گرمی پڑ رہی ہوتی ہے۔ اور جب یہاں گرمی ہو تو وہاں سردی۔۔۔۔۔۔ تو صومالیہ میں تو موسم گرما ختم ہو رہا تھا اور موسم کے پھل فریج میں موجود تھے۔ بعد میں ایک اور تبدیلی جو وہاں رہتے ہوئے محسوس ہوئی یہ تھی کہ دن کو سورج اور رات کو چاند بالکل آپ کے سر پر مسلط رہتا ہے جسے دیکھنے کے لیے آپ کو پوری گردن اٹھانی پڑتی ہے۔ اپنے ملک میں سایہ حد ادب قائم رکھتے ہوئے آپ سے ذرا ہٹ کر چلتا ہے لیکن وہاں تو بس قدموں سے لپٹا رہتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فلکی سیارے خط استوا کے تقریباً اوپر رہتے ہیں اور موگادیشو خط استوا سے صرف دو ڈگری شمال میں ہے جبکہ پاکستان خط سرطان سے بھی اوپر یعنی خط استوا سے تقریباً چوبیس ڈگری شمال میں ہے۔ ہم جب بھی سورج یا چاند کو دیکھتے ہیں تو وہ جنوب کی طرف اتنی بلندی پر ہوتا ہے کہ ہم باآسانی نظریں اٹھا کر دیکھ لیتے ہیں۔

تو رات کا وقت تھا۔ چاند کی چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ کھانا کھا کر ہم میجر زاہد کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ بالکل یوں لگا جیسے پنجاب یونیورسٹی کے ہاسٹل ہوں۔ زاہد سے ذکر کیا تو ہنستے ہوئے بتایا کہ پاکستانی بریگیڈ موگادیشو کی یونیورسٹی شعبہ سیاسیات ہی میں تو براجمان تھا اور ہم جہاں ٹھہرے ہوئے تھے وہ واقعی ایک ہاسٹل تھا۔ بلکہ ہم جس کمرے میں تھے وہ کسی وارڈن کی قیام گاہ رہی ہو گی تو وہ جو یہاں آتے ہی اپنائیت کا ایک احساس ہوا تھا' اتنا غلط بھی نہیں تھا۔ بالکل یوں لگا جیسے پنجاب یونیورسٹی کے ہاسٹل ہوں' نمبر چار اور پانچ۔ یہ تو یاد نہیں رہا کہ گراؤنڈ فلور پر کون تھے' البتہ چار نمبر ہاسٹل کے اوپر والی منزل میں ایم اے صحافت اور ان کے بالمقابل پانچ نمبر ہاسٹل کی اوپری منزل میں آئی ای آر یعنی انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ کے طلبہ رہتے تھے۔ امتحان کے دنوں میں کھانے سے فارغ ہو کر طلبہ مطالعے میں غرق ہو جاتے۔ ہر سو ایک گہرا سناٹا چھایا ہوتا۔ جب آنکھیں دکھنے لگتیں' سر چکرانے لگتے یا

نیند سے آنکھیں مندنے لگتیں تو کوئی ایک طالب علم بالکونی میں نمودار ہوتا' سرگوشیوں میں پڑوسی کو آواز دیتا' وہ اپنے پڑوسی کو۔ تھوڑی دیر میں بہت سے طالب علم اپنی اپنی بالکونی میں صف آرا ہوتے۔ کوئی ایک با آواز بلند پکارتا ''ون ٹو تھری ون'' اور پھر ایک لے میں نعرے بلند ہوتے۔۔۔۔۔۔ ''اوئے ئے ئے ئے۔۔۔۔۔۔ ماشٹرو! بس کرو۔'' یہ گویا اعلان ہوتا اس بات کا کہ بہت ہو چکی پڑھائی' ہو جائیں ذرا دو دو ہاتھ۔ تھوڑی دیر میں ایجوکیشن کے طلبہ بھی بالکونیوں میں نمودار ہوتے۔ جوابی نعرے آتے۔ ''اوئے ئے ئے ئے۔۔۔۔۔۔ صحافیو! کچ پڑھیا کرو۔'' ان دونوں میں نعرہ بازی شدت اختیار کرتی تو نچلی منزل کے طلبہ کی طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوتی۔۔۔۔۔۔ اوئے ئے ئے ئے' فراڈیو! چپ کرو۔

کچھ دیر تک یہ صوتی جنگ جاری رہتی۔ آنکھوں سے نیند اڑ جاتی۔ طلبہ کولروں سے ٹھنڈا پانی پیتے' تازہ دم ہوتے اور پھر پڑھائی میں جت جاتے۔

تو بالکل یوں لگا جیسے پنجاب یونیورسٹی کے ہاسٹل ہوں' نمبر چار اور پانچ۔۔۔۔۔۔ رات کا وقت تھا۔ کمروں کی بتیاں روشن تھیں۔ پاکستانی بریگیڈ میں آئی ایس پی آر کے نمائندے میجر زاہد کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے جب ہم ایک ہاسٹل کی طرف بڑھ رہے تھے تو راستے میں ایک آڈیٹوریم خالی پڑا تھا۔ سٹیج پر ایک یونٹ کی کنٹین کھلی ہوئی تھی۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ جوانوں کی تیز تیز باتیں کرنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ہاسٹلوں میں طلبہ نہیں' فوجی مقیم تھے۔ دیواروں پر شعبہ جاتی انتخابات کے نعرے نہیں' فوجی یونٹوں کے شعبوں کے نام یا نمبر درج تھے۔ فیلڈ ہاسپٹل' راشن سٹور' پی او ایل (پٹرول آئل لبریکنٹ)

میجر زاہد نے بتایا کہ یہ کبھی موگا دیشو یونیورسٹی کا شعبہ سیاسیات تھا۔ صرف اس شعبے کے طلبہ کے لیے چار ہاسٹل مخصوص تھے۔ اساتذہ کی رہائش گاہیں الگ تھیں جن پر بوگن ولیا کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں اور کیفے ٹیریا۔۔۔۔۔۔ بالکل نیو کیمپس کی طرح کا۔

70ء کی دہائی کے شروع میں پاکستان میں ایک زبردست مباحثہ شروع ہوا۔ موضوع زیر بحث تھا ''ایشیا سرخ ہے یا سبز''۔۔۔۔۔۔ ''سبز ہے سبز ہے' ایشیا سبز ہے''۔۔۔۔۔۔ ''سرخ ہے سرخ ہے' ایشیا سرخ ہے'' تعلیمی اداروں میں یہ نعرے عام سنائی دیتے۔ پنجاب یونیورسٹی بھی ''جماعتیوں'' اور ''سرخوں'' کی کشمکش کی زبردست آماجگاہ تھی۔ شیخ نصر اللہ ان دنوں انڈوں کا کاروبار کرتے تھے (اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں) جب طالب علم تھے اسلامی جمعیت طلبہ کے پینل پر پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے صدر منتخب ہوئے۔ سٹوڈنٹس یونین پر کافی عرصہ پابندی لگی رہی۔ ۱۹۷۰ء میں یونین بحال ہوئی تو غیر نصابی سرگرمیوں میں اچانک رونق بڑھ گئی۔ اب معلوم نہیں یہ کاروباری ضرورت تھی یا۔۔۔۔۔۔ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی'' طلبہ سیاست میں دلچسپی

۔۔۔۔۔۔ شیخ نصر اللہ نے نیو کیمپس کے کیفے ٹیریا کا ٹھیکہ لے لیا۔ یونیورسٹی میں سکول کے بچے تو پڑھتے نہیں' ایم اے یا بی اے آنرز کے طلبہ ہوتے ہیں اور ان سے اتنی ذمہ داری کی توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ کراکری احتیاط سے استعمال کریں گے' اس لیے اگر کسی طالب علم سے کوئی گلاس یا پلیٹ ٹوٹ جاتی تو ان سے کوئی معاوضہ وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ شیخ نصر اللہ نے جب کیفے ٹیریا کا ٹھیکہ لیا تو جماعتیوں اور سرخوں کی کشمکش عروج پر تھی لیکن دونوں طرف سے رواداری اور برداشت کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ ذاتی تعلقات اس نوعیت کے تھے کہ ساتھ اٹھتے تھے' ساتھ بیٹھتے تھے۔ ساتھ پڑھتے تھے اور کھانا بھی اکٹھے کھاتے۔ سیلف سروس ہوا کرتی تھی۔ اپنا اپنا کھانا لے کر ایک ہی میز پر بیٹھ جاتے۔ کھانا بھی چلتا رہتا فقرے بازیاں بھی۔

''یار دیکھو! اللہ تعالیٰ نے زمین سے جتنی چیزیں بھی اگائی ہیں' زیادہ تر سبز رنگ کی ہیں یعنی کہ سبز رنگ کی سبزیاں۔ انسانی صحت کے لیے بڑی مفید ہیں۔''

یہ سبزیاں اندر جا کر خون ہی بنتی ہیں نا۔۔۔۔۔۔ اور خون سرخ ہوتا ہے' سرخ اور کبھی کوئی سرخا کسی دلیل پر لاجواب ہو جاتا ہے تو گلاس اٹھا کر فرش پر پٹخ دیتا یا کوئی خالی پلیٹ میز کے کنارے سے سرکا دیتا۔ کراکری چکنا چور ہو جاتی۔ جمعیت کے کارکن خون کے گھونٹ پی کر چپ ہو رہتے۔

موگا دیشو یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات کا کیفے ٹیریا دیکھا تو خیال آیا کہ اپنے ہاں کی لڑائی بالکل بچوں کی سی لڑائی ہوتی تھی۔ اس میں معصومیت بھی تھی' کھلنڈرا پن بھی۔ جب نظریاتی بحث ہوتی تو غراتے بھی تھے لیکن فارغ ہوتے تو غٹرغوں' غٹرغوں بھی اکٹھے کیا کرتے۔ ہاسٹل آباد رہے' کلاسیں پر رونق۔۔۔۔۔۔ لیکن موگا دیشو میں جو لڑائی ہوئی' اس نے یونیورسٹی کو ویران کر دیا' ہاسٹلوں کو خالی۔ بڑی خواہش ہے کہ وہ آباد ہوں تو دوبارہ وہاں جائیں۔

جب ہم صومالیہ کے لیے روانہ ہوئے تو آئی ایس پی آر کی طرف سے ایک اور کام ہمارے ذمے لگا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے کینیا میں قائم ایک کمپنی ''کیمرا پکس'' کے تعاون سے آئی ایس پی آر نے کچھ دستاویزی فلمیں تیار کی تھیں۔ جب اس کمپنی کے کارکنان واپس گئے تو ایک صاحب آئی ایس پی آر کا ایک کیمرہ ''غلطی سے'' اپنے سامان میں لپیٹ کر ساتھ لے گئے۔ کیمرہ قیمتی تھا اور لاکھوں روپے اس کی قیمت تھی۔ ہمیں ہدایت کی گئی کہ کینیا میں اسے ڈھونڈیں اور اس سے کیمرہ واپس لائیں۔ وہ تو ہمیں کینیا پہنچ کر احساس ہوا کہ ہم نے ذمہ داری قبول کر کے کتنی بڑی حماقت کا ثبوت دیا تھا۔ اتنے بڑے ملک میں کہ رقبہ جس کا پانچ لاکھ بیاسی ہزار چھ سو چالیس مربع کلومیٹر ہو اور آبادی تقریباً دو کروڑ' اس میں بغیر کسی پتے کے' کسی مجہول شخص کو کیسے ڈھونڈا جا سکتا تھا اور اگر وہ مل بھی جاتا تو

۔۔۔۔۔۔جو شخص لاکھوں کا کیمرا ''غلطی سے'' لے گیا تھا' شرافت سے کیسے کر دیتا۔

موگادیشو اور نیروبی کے درمیان اقوام متحدہ کے طیاروں کی فری شٹل سروس چلتی تھی اور میجر زاہد حسین اگلے دن کی پرواز سے ہمیں نیروبی کے لیے بک کر چکے تھے۔ ان طیاروں میں پاکستانی فوجیوں کو بٹھانے کے لیے رابطے کے فرائض کیپٹن غلام حسین کے ذمے تھے۔ اگلے دن ہم ان کے ہمراہ موگادیشو ائیرپورٹ پہنچے تو اپنے فوجیوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ فرنٹیئر فورس رجمنٹ کی ایک بٹالین کے جوان تھے جو رخصت پر بذریعہ نیروبی پاکستان جا رہے تھے۔ ائیرپورٹ پر افراتفری کا عالم تھا۔ معمول کی کارروائی تو تھی نہیں کہ ہم ٹکٹ تھامے کسی کاؤنٹر پر رپورٹ کرتے اور ہمیں بورڈنگ کارڈ ایشو ہو جاتا۔ ہوائی اڈے کی عمارت کے اندر داخلہ بجائے خود ایک بڑی کارروائی تھی جو ہم کامیابی سے مکمل کر چکے تھے کہ عمارت کی حفاظت کے لیے تین حصار قائم کیے گئے تھے۔ سب سے اندرونی حصار امریکی فوجیوں کے ہاتھ میں تھا جو کتوں کو ساتھ لے کر عمارت کے چاروں طرف گشت میں مصروف تھے۔ کیپٹن غلام حسین ایک سمت میں کسی مجاز افسر کو ڈھونڈنے گئے اور ہمیں دوسری سمت میں تلاش کرنے کو کہا۔ کافی تگ و دو کے بعد ایک امریکی مسٹر برائن ملا جو نیروبی جانے والی پرواز کا ذمہ دار تھا۔ اسے بتایا کہ ہم نیروبی جائیں گے۔

''کوئی اتھارٹی؟'' اس نے مختصر سا سوال کیا۔

ہم نے جیب سے ایک مڑا تڑا کاغذ نکالا جو کیپٹن غلام حسین نے بطور اتھارٹی ہمارے سپرد کیا تھا۔ یہ پاکستانی مسافروں کی فہرست تھی جس میں ہمارا اور فرنٹیئر فورس کے جوانوں کے نام شامل تھے۔ مسٹر برائن نے ایک نظر فہرست پر ڈالی۔ پھر پوچھا کہ کیا ہم وہ فہرست اس کے حوالے کر دیں گے۔ بتایا کہ ایک ہی کاپی ہے۔ اس نے فہرست لے لی اور ہمیں وہیں انتظار کرنے کو کہتے ہوئے خود ایک عمارت میں غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد آیا تو فوٹو سٹیٹ کاپی اس کے پاس تھی۔ اس میں فہرست کے پہلے پانچ نام مٹے ہوئے تھے لیکن جنگی حالات تھے' تفصیل میں جانے کا وقت تھا نہ موقع۔ اس نے ہم سب کو گاڑیوں میں سوار کروایا اور صومالی فضائیہ کے طیاروں کے ملبے کے ڈھیروں سے گزرتا ہوا' ایک جہاز کے قریب جا رکا۔ گاڑیاں ہمیں اتار کر واپس چلی گئیں۔ یہاں اچھے خاصے امریکی فوجی بھی تھے۔ پتہ چلا' واپس جا رہے ہیں' براستہ نیروبی۔ کچھ خواتین فوجی بھی تھیں جنہوں نے شیفرڈ کتوں کی زنجیریں تھامی ہوئی تھیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ زیادہ صحت مند اور خوبصورت خواتین تھیں یا کتے۔ اس لیے کہ امریکی فوجی موگادیشو ائیرپورٹ چھوڑنے سے پہلے کبھی یہاں' کبھی وہاں کھڑے ہو کر جو تصویریں بنا رہے تھے ان میں وہ خواتین کو کتوں سمیت بڑے اہتمام سے شامل کرتے تھے اور اگر کوئی کتا کسی خاتون کو کھینچ کر لے جاتا تھا تو وہ انتظار کرتے تھے' معلوم نہیں خاتون کا یا کتے کا۔ بہر حال تصویر

اسی وقت اترتی تھی جب خاتون کتے سمیت واپس آ جاتی تھی۔ کتا گروپ صرف خاتون اور کتے پر ہی مشتمل نہیں تھا بلکہ ہر گروپ میں ایک اور نامی بھی تھا لیکن وہ کتے کے کھانے پینے کے برتن اور خوراک اٹھائے ہوئے تھا۔ تقسیم کار کی پابندی کا بڑا اہتمام نظر آتا تھا کہ اگر کتا اپنی انچارج کے ساتھ کھینچا تانی کرتا تھا تو وہ قطعاً دخل نہ دیتا تھا۔ بے نیازی سے کھڑا رہتا تھا' اس کی بلا سے' انچارج ڈانٹے یا پچکارے۔

مسٹر برائن امریکیوں کا سامان لادنے میں مصروف رہا۔ درمیان میں کیپٹن غلام حسین نے ایک دو بار اسے توجہ دلائی کہ پاکستانیوں کا سامان بھی لوڈ کروا دے لیکن اس نے سنی ان سنی کر دی۔ جب فارغ ہوا تو اس نے سامان کے وزن کی جمع تفریق کر کے بڑی لاپرواہی سے کیپٹن غلام حسین کو بتایا کہ پاکستانی تو اس پرواز سے نہیں جا سکیں گے۔

''کیوں نہیں جا سکیں گے؟'' کیپٹن غلام حسین نے مسٹر برائن کی ناک سے ناک ملاتے ہوئے دانت پیستے ہوئے کہا۔

ایک تھرڈ ورلڈ ملک کے ایک جونیئر فوجی سے مسٹر برائن کو قطعاً اس اشتعال انگیز رویے کی توقع نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ''ترلے منتیں'' کرنے پر وہ پاکستانیوں کو آئندہ کسی پرواز سے بھجوا دے گا لیکن غلام حسین سیاستدان تو تھا نہیں۔ اس نے ایک پاکستانی فوجی کو آواز دی۔

''بہزاد! ذرا یہ سٹین گن دینا مجھے۔''

یہ جن ذات شریف کا نام بہزاد تھا' بڑے مستعد ثابت ہوئے۔ انہوں نے سٹین گن کا رخ آسمان کی طرف کیا' اسے کاک کیا۔ سیفٹی کیچ اتارا اور کیپٹن غلام حسین کو تھماتے ہوئے بتایا۔

''سر! گن لوڈڈ' کاکڈ' سیفٹی کیچ ریموووڈ''

(Gun Loaded, Cocked, Safety Catch Removed)

غلام حسین نے سٹین گن تھامتے ہوئے' پھر مسٹر برائن سے پوچھا۔

''ہاں مسٹر برائن! کیوں نہیں جا سکیں گے پاکستانی اس فلائٹ سے؟''

مسٹر برائن نے دور ایک نظر گوروں کی طرف دیکھا جو کتوں اور لڑکیوں کی چاپلوسی میں مصروف تھے' پھر پاکستانیوں پر نگاہ کی جو پاس ہی پورے نظم و ضبط سے کھڑے اپنے افسروں کے اگلے احکامات کے منتظر تھے۔

''ٹھہرو ٹھہرو۔۔۔۔۔۔جائیں گے' جائیں گے' اسی فلائٹ سے جائیں گے۔''

مسٹر برائن کی ساری لاپرواہی کافور ہوگئی۔

پورے واقعہ میں چند سیکنڈ لگے ہوں گے۔ کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ دو اہم ملکوں کی خارجہ پالیسی کن نشیب وفراز سے گزر گئی' لیکن مسٹر برائن تیر کی طرح سیدھا ہوگیا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا پائلٹ کے پاس گیا۔ اس سے گٹ پٹ کر کے واپس آیا اور بڑی لجاجت سے بولا کہ سواریاں تو اسی جہاز سے چلی جائیں لیکن سامان چھوڑ جائیں' اگلی پرواز سے آجائے گا۔ جنگی حالات تھے' بندہ بے اعتبار' عین ممکن تھا کہ سواریاں کہیں ہوتیں سامان کہیں۔۔۔۔۔۔ کیپٹن غلام حسین نے یہ تجویز نما حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اقوام متحدہ کے احکامات کے مطابق ہم اور ہمارا سامان اسی جہاز سے بک تھا اور اسی سے جائے گا۔ ''مسٹر برائن! کو اگر کوئی شک ہے تو میں ابھی دور کئے دیتا ہوں۔'' غلام حسین نے پیش کش کی۔ شک دور کرنے کا طریق کار اگر ''مذاکرات'' تک محدود رہتا تو مسٹر برائن یقیناً بڑی خوشی سے یہ پیش کش قبول فرما لیتے لیکن غلام حسین امن پسند فوجی دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ مسٹر برائن پھر بھاگا بھاگا پائلٹ کے پاس گیا اور اسے ساتھ لے کر آیا۔ پائلٹ بھی جلدی میں تھے' امریکیوں کا سامان اتارنے اور پاکستانیوں کا سارا سامان لوڈ کرنے میں کافی دیر ہو جاتی۔ بالآخر طے یہ ہوا کہ تمام پاکستانی مسافر اپنا ذاتی سامان ساتھ لے جائیں لیکن بھاری سامان دو تین آدمیوں کے ساتھ چھوڑ جائیں۔ یہ سامان دراصل راشن اور دیگر سٹور تھا جو نیروبی میں پاکستان ہاؤس کے لیے بھیجا جا رہا تھا جو صومالیہ آنے جانے والے پاکستانی کے لیے ٹرانزٹ کیمپ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

◆◆◆

نیروبی......لاقانونیت کی انتہا

ایک ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز نیروبی پہنچا۔ دروازوں کی بجائے اس کی دم کھولی گئی۔ سب سے پہلے امریکی کتے اترے اپنی انچارج خواتین کے ساتھ۔ ان کے بعد کتا گروپ کے برتن بردار فوجی جنہوں نے جہاز سے اترتے ہی برتن زمین پر رکھے اور خاص بوتلوں سے پانی ان برتنوں میں انڈیل دیا۔ لیکن کتے پانی پینے سے زیادہ پہلے سے پیئے ہوئے پانی کو خارج کرنے کی فکر میں تھے اور بے چینی سے دائیں بائیں کسی اوٹ کی تلاش میں گھومتے تھے۔ ایک کتا اسی جہاز کے پہیے کو پانی دینے کی کوشش کر رہا تھا جس میں اس نے سفر کیا تھا۔ پائلٹ کاک پٹ سے اترے اور یہ منظر دیکھا تو رہا نہ گیا۔ ایک نے کسی سینئر سارجنٹ کی طرف منہ کر کے ہانک لگائی۔

''اے! اس کتیا کو پرے لے جاؤ۔''

سارجنٹ نے کتے اور اس کی انچارج کی طرف دیکھا' مسکرایا اور چلایا۔ ''یہ کتیا نہیں ہے' کتا ہے۔''

''غور سے دیکھو' کتیا کو پرے لے جاؤ۔ میرا جہاز بچ جائے گا۔'' پائلٹ نے دانت نکالتے ہوئے پھر ہانک لگائی۔ امریکی زندہ دل قوم ہے۔ سارجنٹ نے قہقہہ لگایا اور آواز دی۔

''اے نینسی! کتے کو ادھر لے آؤ' جہاز کو بخش دو۔''

ان مذاکرات کے دوران مطلوبہ وقت حاصل کر لیا گیا تھا۔ کتا فارغ ہو کر پانی پینے کے لیے اپنے برتنوں کی طرف لپک رہا تھا۔

نیروبی میں موسم خوشگوار تھا۔ کینیا کا یہ دارالحکومت خط استوا سے ایک ڈگری سترہ منٹ جنوب میں واقع ہے۔ مارچ کا مہینہ تھا' سردیوں کی آمد آمد۔ ہمارے پہنچنے سے کچھ دیر پہلے بارش ہو کر تھمی تھی۔ ہر چیز نکھری نکھری تھی' صاف ستھری۔ ٹرانزٹ کیمپ کے ایک افسر لیفٹیننٹ زبیر نے ہمارا استقبال کیا۔ وہ ہمارے پاسپورٹ لے کر امیگریشن کی ضروری کارروائیوں کے لیے چلا گیا اور کیپٹن غلام حسین ہمیں پسینجر لاؤنج کی راہداریوں میں سجی دکانوں کی سیر کرانے لگے۔ قیمتیں ڈالروں میں تھیں اور آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ ہمیں خوشبوؤں سے دلچسپی تھی لیکن ان کی قیمتیں بھی ہماری پہنچ سے باہر تھیں۔ ایک ٹیبل لیمپ پسند آیا جو ایک شیلف پر کافی اونچائی پر رکھا ہوا تھا۔ سیلز گرل نے اونچی ایڑی کی جوتی پہن رکھی تھی' پھر بھی اس کا ہاتھ لیمپ تک نہیں پہنچتا تھا۔ اس نے ایک سٹول پر

کھڑے ہو کر لیمپ اتارا۔ گرد آلود تھا۔ گویا کافی عرصے سے اسے چھوا تک نہیں گیا تھا۔ قیمت پوچھی' تین سواڑتیس ڈالر۔ ہم نے اسے وہیں رکھوا دیا جہاں اس کے مقدر میں گرد تھی یا غبار۔ ان دکانوں میں سستی صرف وہ مصنوعی مسکراہٹ تھی جو سیل گرلز کے لبوں پر پھیلی ہوئی تھی۔

زبیر نے آ کر ہماری ونڈو شاپنگ ختم کروائی۔ ائیر پورٹ کے باہر ایک کوسٹر اور ایک ویگن ہماری منتظر تھی۔ صاف ستھری سڑکوں کے چاروں طرف ہریالی بکھری ہوئی تھی۔ راستے میں لیفٹیننٹ زبیر نے پوچھا کہ ہم ہوٹل میں رہنا پسند کریں گے یا پاکستانی ہاؤس میں۔ ہوٹل کے کچھ کمرے اقوام متحدہ کی طرف سے پاکستانی برگیڈ کو دیئے گئے تھے جہاں آنے جانے والے افسر ٹھہرتے تھے۔ زبیر نے ہوٹل کے "ماحول اور سہولتوں" کا بڑا رنگین نقشہ کھینچا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ ہم کس مشن پر تھے۔ آئندہ چند دنوں میں ہم نے پاکستان ہاؤس میں موجود افسروں کی جان کھائی تھی' دماغ چاٹا تھا۔ ہوٹل کے کمروں میں بندرہ کر کیا کرتے۔ پاکستان ہاؤس پہنچے تو اپنے انتخاب پر خوشی ہوئی۔ چھوٹی سی عمارت تھی جس پر پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لہراتا تھا۔ خوبصورت سالان تھا جو ہنستے مسکراتے للی' گل داؤدی اور بالسم کے پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔

دوسرے دن ہم نے کیمرے کی تلاش کا آغاز کیا۔ پاکستان ہاؤس کے انچارج میجر شاہد تھے جن کا تعلق فرنٹیئر فورس رجمنٹ کی پانچویں بٹالین سے تھا۔ اس یونٹ کے ساتھ ہم نے کمیشن کے بعد ڈیڑھ سال کا عرصہ گزارا تھا۔ ان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کی روداد "جنٹلمین الحمدللہ" کے ابتدائی ابواب میں موجود ہے۔ تو شاہد کے ہمراہ ہم پاکستانی سفارت خانے گئے۔ میجر شاہد نے کسی صحافی کو لینے جانا تھا' وہ بھی آیا کہہ کر رخصت ہو گئے۔ ہمیں غالب یاد آئے' وہ جو کہتے تھے:

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

ہم وردی میں تو تھے نہیں' سوچا اہل کرم کا تماشا ہی کیا جائے۔ چنانچہ ہم پاکستان کے ایک عام سے شہری کی حیثیت سے سفارت خانے میں داخل ہوئے۔ (گیٹ کیپر نے ہمیں اقوام متحدہ کی گاڑی سے اترتے دیکھا تھا' شاید میجر شاہد کو بھی پہچانتا ہوگا کہ ان کا تو سفارت خانے آنا جانا رہتا ہی ہوگا۔ اس نے کوئی روک ٹوک نہیں کی) ہر سفارت خانے میں پریس کونسلر یا پریس اتاشی بھی ہوتے ہیں کہ کام جن کا پریس سے رابطہ رکھنا اور جی چاہے تو وہاں کے عوام میں اپنے ملک کو متعارف کروانا' ملکی پالیسیوں کو فروغ دینا اور ہو سکے تو اپنے ہم وطنوں کی خبر گیری وغیرہ وغیرہ۔ پوچھتے پاچھتے پریس کونسلر کے کمرے میں پہنچے۔ جن صاحب سے ملے زندگی کی بہاروں

کو خدا حافظ کہہ چکے تھے۔ پت جھڑ کے موسموں میں تھے۔ دلاور فگار کے ضرورت رشتہ کے اشتہار کے عین مطابق:

ایک لڑکا ہے اصیل النسل' عالی خانداں
عمر ہے لڑکے کی ففٹی سکسٹی کے درمیاں
آنکھ کی اک شمع روشن' دوسری تھوڑی سی گل
مختصر یہ کہ لڑکا ہے بہت ہی بیوٹی فل

ان کے کنوارپن کا پاکستان کو کوئی فائدہ نہ تھا کہ انہیں جو اچھا خاصا گھر کرائے پر لے کر دے رکھا تھا' وہ کسی شادی شدہ بلکہ بال بچوں والے افسر کی ضرورت کو بھی کافی ہوتا۔ خیر یہ باتیں تو ہمیں بعد میں معلوم ہوئیں۔ ہم نے جب ان سے تعارف ایک "پاکستانی" کی حیثیت سے کروایا اور بتایا کہ ہم کسی فوٹو گرافر عبدالقیوم کی تلاش میں ہیں جو "کیمرا ایکس" کے ساتھ کام کرتا تھا تو انہوں نے کمال مہربانی سے بتایا کہ کیمرا ایکس کے مالک محمد امین کینیڈا گئے ہوئے ہیں اور پیر کو آئیں گے۔ ہفتے کا دن تھا۔ صرف اتوار بیچ میں تھا۔ ہم نے درخواست کی کہ "کیمرا ایکس" کا اتہ پتہ اور فون نمبر دے دیں۔

انہوں نے فائلوں پر جھکے جھکے' سگریٹ کا کش لگایا اور بولے۔

"پیر کو آ کر لے لینا۔"

گویا اس وقت کا آنا' آنے میں آنا ہی نہیں تھا۔ پیر کو پہلے ان کے پاس آتے پھر کیمرا ایکس کی تلاش میں نکلتے۔ اور یہ جو ہفتے کا دن ضائع ہوا جا رہا تھا' اسے کس مصرف میں لاتے۔ لیکن یہ تو ہمارے ذاتی خیالات تھے۔ تھے تو ہم سفارت خانے میں اور سفارتی آداب کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں ہم نے غصے کو ضبط کیا' گہری سانس لی اور منتظر رہے کہ وہ فائلوں سے سر اٹھائیں تو ہم کچھ عرض کریں۔ کافی دیر کے بعد انہوں نے توجہ فرمائی۔ ایک آنکھ بند' چھنگلیا اور ساتھ والی انگلی میں سگریٹ دبائے' انہوں نے گہرا کش لگاتے ہوئے سر کی جنبش سے پوچھا۔ "جی۔۔۔۔۔۔۔ اور کچھ؟"

"یہ صومالیہ کے بارے میں کچھ معلومات مل سکیں گی؟"

انہوں نے دوسری آنکھ بھی بند کر لی۔ سگریٹ کا گہرا کش لگایا اور دھواں چھوڑتے ہوئے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے بولے۔

"حالات ٹھیک نہیں ہیں وہاں کے' ٹھیک نہیں ایں' بڑے خراب ہیں۔ ذرا ٹھیک ہو جائیں' پھر آنا۔" وہ پھر فائلوں پر جھک گئے۔ ان کے خیال میں ہم ساتھ والی گلی میں رہتے تھے اب نہ سہی پھر سہی۔"

ہم نے قدرے توقف فرمایا' پھر پوچھا۔

''سنا ہے پاکستان سے بڑی فوج آئی ہوئی ہے۔''

''ہوں۔۔۔۔۔۔۔ہم۔۔۔۔۔۔'' انہوں نے فائلوں پر جھکے جھکے ہنکارا بھرا۔

''سنا ہے' بھارتیوں نے فرح عدید پر بڑا کام کیا ہے۔ کوئی کتاب چھپوادی ہے اس کے نام سے۔''

ان کا پیمانہ صبر لبریز ہونے کو تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمیں باہر کی راہ بتاتے ''دید شنید'' والے رفیق ڈوگر آ پہنچے۔ میجر شاہد ہمیں سفارت خانے کے باہر چھوڑ کر جس صحافی کو لینے گئے تھے' اب پتہ چلا رفیق ڈوگر تھے۔ ہمیں ان سے شناسائی کا شرف حاصل ہے۔ سینئر صحافی ہی اور زود نویس ہیں اور اس پر کمال یہ کہ فوجی اصطلاح میں' جلدی میں درستگی کو قربان نہیں کرتے۔ عمرے سے واپسی پر وہ نیروبی ٹھہرے۔ موگا دیشو بھی آئے اور پاکستان آ کر انہوں نے صومالیہ پر بڑی دردمندی سے ایک تفصیلی کتاب لکھی ''آپریشن صومالیہ'' جو اس ملک کے مسئلے کے تمام پہلوؤں کا بخوبی احاطہ کرتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ان کی اس کتاب کی وجہ سے ہم صومالیہ کے بارے میں تفصیلات چھوڑ رہے ہیں۔ یہ مضمون صرف ذاتی تاثرات پر مشتمل ہے۔ جو تفصیلات جاننا چاہیں وہ ان کی کتاب ضرور پڑھیں۔ (دید شنید پبلی کیشنز' ۲۳ فضل منزل بیڈن روڈ لاہور سے شائع ہوئی ہے)

تو رفیق ڈوگر صاحب اور میجر شاہد کی آمد نے وہ تماشا منسوخ کر دیا کہ جو ہم دیکھنے والے تھے۔ ہمارے میزبان پر ہماری ''اصلیت'' ظاہر ہوئی تو ان کا موسم ایک دم خوشگوار ہو گیا۔ ہمیں نہ صرف ''کیمرا ایکس'' کا پتہ مل گیا بلکہ بھارت کی شائع کردہ کتاب کی فراہمی کا بھی وعدہ ہوا جو واقعی بعد میں مہیا کر دی گئی۔

پونے پانچ سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب نئی دہلی سے وائیکاس پبلشنگ ہاؤس نے شائع کی ہے۔ اس میں کل چالیس مضامین ہیں جن میں تین فرح عدید نے لکھے ہیں لیکن ٹائٹل پر جنرل عدید کی تصویر کے نیچے ان کا نام بحیثیت ایڈیٹر لکھا ہوا ہے۔ شریک ایڈیٹر جامعہ ملیہ دہلی کے پروفیسر ڈاکٹر ستیہ پال روہیلہ ہیں۔ دیباچہ بھارت کے امور خارجہ کے وزیر مملکت سلمان خورشید نے لکھا ہے اور وہ یہ دور کی کوڑی لائے ہیں کہ بھارت کے صومالیہ کے ساتھ دوستی کے تعلقات ۵۳۸ قبل مسیح سے ہیں جب تجارتی سامان سے لدے بحری جہاز صومالیہ اور بھارت کی بندرگاہوں کے درمیان آتے جاتے تھے۔

فرح عدید کو ۱۹۵۶ء میں صومالی فوج میں کمیشن ملا اور سروس کے دوران روم اور ماسکو سے انہوں نے وار کورس کئے۔ صدر زیاد برے کے عہد میں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۵ء تک قید رہے۔ رہائی کے بعد انہیں حکومتی عہدوں پر بحال کیا گیا۔

۱۹۸۹ء میں انہیں بھارت کا سفیر مقرر کیا گیا۔ بھارتی ان دنوں کی دوستی سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ فرح عدید کی سفارت کے دنوں میں تو انہیں کسی کتاب کی نہ سوجھی۔ اب جبکہ وہ ایک اہم متحارب گروپ یونائٹڈ صومالی کانگریس (عدید گروپ) کے سربراہ تھے اور امکان تھا کہ آنے والے دنوں میں صومالیہ کی قیادت ان کے ہاتھ آ سکتی ہے تو ان سے پینگیں بڑھائی جا رہی تھیں۔ افسوس گزشتہ دنوں ان کا انتقال ہو گیا۔

تو سفارت خانے میں رفیق ڈوگر صاحب سے تفصیلی ملاقات رہی۔ وہ بڑی باریک بینی سے صومالیہ کے بارے میں معلومات اکٹھی کر رہے تھے۔ ان سے پہلے بھی پاکستان سے ایک آدھ صحافی موگا دیشو آئے تھے لیکن بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے محفوظ حصار کے درمیان ایک رات گزار کر واپس چلے گئے۔ رفیق ڈوگر عمرہ کر کے آئے تھے اور وہ بھی رمضان میں' گویا گناہ سارے بخشوا آئے تھے۔ موگا دیشو میں شہید ہو جانے کی انہیں کوئی فکر نہیں تھی لیکن وہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ زندگی کی سب سے بڑی محافظ موت ہے۔۔۔۔۔۔۔ رفیق ڈوگر صاحب موگا دیشو میں دندناتے رہے اور صحیح سلامت لوٹ آئے۔ خیر اس دن تو وہ پاکستانی سفارت خانے میں تھے اور ان کی خوب آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ ہم واپس پاکستان ہاؤس آ گئے۔

اتوار کے دن میجر شاہد نے ہمیں اور میجر زاہد کو ساتھ لیا اور کینیا کے چائے کے باغات دکھانے لے گئے۔ کینیا کی چائے مشہور ہے اور چائے کے باغات میں لکونی گارڈنز۔ میلوں تک سڑک کی دونوں جانب باغات پھیلے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں عورتیں چائے کی پتیاں چن رہی تھیں۔ دوپہر ان باغات کے درمیان گزار کر ہم پاکستان ہاؤس واپس آ گئے۔

شام کو میجر زاہد کے ساتھ شہر کی وسطی مارکیٹ میں گئے۔ ایک ہوٹل سے چائے پی کر مٹر گشت میں مصروف تھے کہ پاکستان ہاؤس ہی میں مقیم دو افسر مل گئے۔ لیفٹیننٹ تیمور ہماری ''جراتوں'' پر حیران تھے اور ہم ان ''جراتوں'' سے بے خبر۔ تیمور نے بتایا کہ مارکیٹ کا وہ علاقہ غنڈہ گردی اور دہشت گردی کے لیے مشہور تھا اور دن دہاڑے وہاں لوگ لٹ جاتے تھے۔ سرِ عام غنڈوں کا کوئی گروہ کسی پر پستولیں تان لیتا تھا اور جیبیں خالی کروا کے چلتا بنتا تھا۔

''تو آپ لوگ اس علاقے میں کیا کر رہے ہو؟'' ہم نے جرح کی۔

''سر! میں تو کیمرے کی فلمیں لینے آیا تھا۔ آج چھٹی ہے' زیادہ تر دکانیں بند ہیں' شاید کوئی کھلی ہو۔''

''تو آؤ فلم تو خرید تے ہیں' ویسے بھی ہم دو سے چار ہو گئے ہیں۔''

ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک دکان نظر آئی جو نیم وا تھی' یعنی کھلی تھی لیکن لوہے کا مضبوط جالی دار شٹر بند تھا۔ ہم نے دستک دی اور

آنے کی ضرورت بتائی۔اس نے شٹر کھولنے کی زحمت نہیں فرمائی بلکہ جالی ہی میں سے پیسے لے کر فلمیں تھما دیں۔واپسی کے لیے ٹیکسی کرنا چاہی تو تیمور نے پھر منع کر دیا۔بولا'بس سے چلیں گے۔وجہ۔۔۔۔۔۔۔سیکورٹی!بس میں چڑھنے لگے تو کنڈکٹر نے پوچھا کہ بیٹھ کر جاؤ گے یا کھڑے ہو کر۔

''کیا احمقانہ سوال ہے؟بھائی جگہ ہوگی تو بیٹھ کر جائیں گے ورنہ کھڑے رہیں گے۔''

''بیٹھنے کی جگہ تو ہے۔''

''پھر۔۔۔۔۔۔؟''

''سر آئیں'بیٹھیں'میں سمجھاتا ہوں۔''تیمور ہمارا ہاتھ تھامے سیٹوں کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔پتہ چلا کہ وہاں بیٹھ کر جانے کا کرایہ دس شلنگ تھا اور کھڑے ہو کر جانے کا پانچ۔تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیٹیں خالی پڑی ہیں اور لوگ کھڑے ہیں۔لاقانونیت کے اس ماحول میں یہ قانون بڑا اچھا لگا ورنہ ہمارے ہاں تو کرایہ بھی پورا لیتے ہیں اور بیٹھنے دیتے ہیں نہ کھڑا ہونے دیتے ہیں۔ویگنوں کا یہ حال ہے کہ بیٹھے ہوئے لوگوں کے درمیان نئی سواریاں حالت رکوع میں داخل ہوتی ہیں اور اسی حال میں کھڑی رہتی ہیں۔بیٹھنے والوں کا دم گھٹتا ہے'کھڑے ہونے والوں کو''چک''پڑ جاتی ہے۔کرایہ پورا

مول لے کر عذاب''چلتا''ہوں

ہم ان سے کیمرہ لے کر رخصت ہونے لگے تو انہوں نے ٹھیٹھ پنجابی میں لطیفہ گوئی کے انداز میں پوچھا۔''یہ مسلمانوں کی سواریاں کدھر جا رہی ہیں اتنا قیمتی کیمرہ اٹھائے۔''

ان کا دفتر بیس پچیس منزلہ عمارت کی کسی اوپری منزل میں تھا اور کھڑکی سے شہر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ہم نے کھڑکی سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ سامنے چوک کے پار ہماری گاڑی کھڑی ہے۔لاقانونیت اپنی انتہا پر تھی۔مہندر ڈھلوں نے بتایا کہ لوگ تو سگریٹ کے ایک پیکٹ کے لیے چھرا گھونپ دیتے ہیں۔

تم کہاں لے کے چراغ'سامنے ہوا کے چلے

انہوں نے جب یہ جانا کہ ہم کیمرا لے جانے کے لیے کوئی خاص اہتمام کر کے نہیں آئے تو دوبارہ بٹھا لیا۔گتے کا ایک ڈب منگوایا'کیمرہ پیک کروایا۔ایک آدمی کو پہلے سے گاڑی کی طرف بھیجا کہ''سواریاں''آ رہی ہیں'گاڑی سٹارٹ رکھے۔پھر ایک گن مین کے ساتھ انہوں نے ہمیں نیچے بھجوایا اس ہدایت کے ساتھ کہ پاکستان ہاؤس پہنچتے ہی فون کرنا۔احتیاط کا یہ عالم؟ان کے دفتر سے واپسی پر سمجھ میں آیا۔ان کے دفتر پہنچنے سے پہلے تین آہنی دروازے عبور کرنا پڑتے تھے۔کوئی نو وارد لفٹ سے ان کے فلور پر اترتا تھا تو کلوز سرکٹ کیمرے اس پر فکس ہو جاتے تھے۔امن وامان کی اس بگڑتی صورت حال کے پیش نظر امریکی حکومت نے اپنے شہریوں کو کینیا جانے سے روک رکھا تھا۔

نیروبی میں ہمارا مشن مکمل ہو چکا تھا۔خواہش تو بڑی تھی کہ ایک دو پارک ضرور دیکھے جائیں جہاں شیر اور ہاتھی کھلے پھرتے تھے۔ کینیا کے پارک دنیا بھر میں مشہور ہیں کہ سینکڑوں میلوں پر محیط ان پارکوں میں ہر طرح کے جانور پائے جاتے ہیں'چیتے'ہاتھی' لگڑ بگڑ'بھیڑیے'لومڑی'گیدڑ'زرافے'زیبرے'ہرن'گینڈے اور شیر۔لوگ گاڑیوں میں بیٹھ کر پارکوں میں جاتے ہیں تو کبھی جنگل کا شیر راستہ کاٹتا ہے'کبھی کوئی مست ہاتھی جھومتا ہوا ملتا ہے۔کبھی کوئی زرافہ کھڑکی میں منہ ڈال کر آپ سے کھانے کی کوئی چیز لے لے گا اور کبھی گینڈوں کی کوئی فیملی مٹر گشت کرتی نظر آئے تو آپ خود ان سے کنی کترا کر نکل جانا چاہیں گے۔بہر حال ان جنگلی جانوروں کو قدرتی ماحول میں دیکھنا یقیناً اچھا لگتا ہوگا کہ پوری دنیا سے سیاح کینیا کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔سب سے زیادہ سیاح جرمنی سے آتے ہیں۔جس برس ہم وہاں تھے'مارچ تک ایک لاکھ چالیس ہزار سیاح کینیا آ کر واپس جا چکے تھے۔فرانس سے آنے والوں کی تعداد پچیس ہزار تھی۔امریکہ نے تو امن وامان کی ابتر صورت حال کی وجہ سے اپنے شہریوں کو وہاں آنے سے روک دیا تھا اور صاف کہہ دیا تھا کہ جو کینیا جائے اپنی ذمہ داری پر جائے۔

ایک ہم تھے کہ پابہ زنجیر' پورا ہفتہ تو کیمرے کی تلاش میں صرف ہو گیا تھا اور اب موگادیشو ہمیں پکارتا تھا کہ فلم کے لیے معلومات اکٹھا کرنے کا کام ادھورا تھا اور واپسی کا دن قریب آتا جاتا تھا۔ ویسے بھی ان دنوں انسانوں اور جانوروں میں ٹھنی ہوئی تھی۔ لاکھوں سیاحوں کی آمد سے حکومت کو کروڑوں پونڈ ملتے تھے۔ اس لیے حکومت کی طرف سے جنگلی جانوروں کے تحفظ کے لیے کئی انجمنیں قائم تھیں جنہیں اقوام متحدہ اور قدرتی ماحول کو قائم رکھنے کی خواہش مند کئی بین الاقوامی ایجنسیوں کی اشیرباد حاصل تھی لیکن دوسری طرف وہ انسان تھے جو جنگلی جانوروں کے مساکن کے آس پاس رہتے تھے۔ انسان برسوں سے جہاں آباد رہے' اسے مشکل سے چھوڑتا ہے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ جنگلی جانور ان کی بستیوں کا رخ کرتے تھے تو وہ مل کر دو چار ہاتھیوں' شیروں کو ٹھکانے لگا دیتے تھے یا اپنی جھونپڑیاں اٹھا کر تھوڑا دائیں بائیں منتقل ہو کر نئی بستیاں بسا لیتے تھے لیکن اب آبادیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ نئی جگہیں دستیاب نہیں ہوتیں اس لیے زیادہ تر لوگ بسی ہوئی بستیوں میں آ نکلتے ہیں۔ پالتو جانور گائے' بکری' بھینس اٹھا لے جاتے ہیں۔ سبزی خور جانور جیسے ہاتھی' کھاتے کم ہیں' فصلیں زیادہ اجاڑتے ہیں۔ اب یہ جو بہت سی انجمنیں ہیں وہ جنگلی جانوروں کے تحفظ کی بات تو کرتی ہیں لیکن انسانوں کی انہیں کوئی فکر نہیں۔ حکومت کی طرف سے جنگلی جانوروں کے ہاتھوں مارے جانے والے شخص کا معاوضہ تیس ہزار شلنگ (پاکستانی پندرہ ہزار روپے) مقرر ہے۔ فصلیں اجڑ جائیں تو ان کا کوئی معاوضہ نہیں۔ اس صورت حال سے تنگ آ کر ایک قبیلے ماسئی نے اعلان کیا کہ وہ اپنے تمام افراد کو زہر میں بجھے ہوئے تیروں سے مسلح کرنے لگے ہیں۔ جنگلی جانوروں کو حکومت خود روکے' کوئی ان کی بستیوں' فصلوں کی طرف آیا تو واپس نہ جائے گا۔ بہت سے قبیلوں کا کہنا ہے کہ وہ رقم جو ان جانوروں کو دیکھنے کے لیے سیاحوں سے حاصل ہوتی ہے' ان کے قریب بسنے والے انسانوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کی جائے' جانوروں سے تحفظ کے اقدامات پر خرچ کی جائے تو بات بنے لیکن وہ تو حکمرانوں کے اللوں تللوں پر خرچ ہوتی ہے' ہم جانوروں سے صلح کریں تو کیوں؟

تو یہ تھے وہ حالات جب ہم نیروبی کو چھوڑ کر موگادیشو کی طرف روانہ ہوئے۔ میجر شاہد ہمیں الوداع کہنے ائیر پورٹ تک آئے۔ روانی سے پہلے ایک دلچسپ واقعہ دیکھنے میں آیا۔ ایک مسافر شاید کسی پرواز کے لیے لیٹ ہو رہے تھے۔ وہ اپنا سامان سنبھالے تقریباً بھاگنے کے انداز میں کاؤنٹر کی طرف لپکے جا رہے تھے۔ ائیر پورٹ کے ایک اہلکار نے اسے روکا اور پوچھا کہ وہ کیوں بھاگ رہے ہیں۔ اس نے بتایا کہ میری فلائٹ جانے والی ہے۔ اہلکار نے پاس سے گزرتی ایک حسینہ کی طرف اشارہ کیا جس نے گلابی شرٹ پہن رکھی تھی اور اس پر موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا۔

No Hurry in Africa

مسافر نے حیران ہو کر حسینہ کی طرف دیکھا۔ وہ گزر گئی تو پشت پر لکھا تھا۔

No Hurry!Yes

میجر شاہد نے بتایا کہ واقعی افریقہ میں یہ چلن عام ہے۔ مغرب کی دوڑ بھاگ' بدحواسیاں اور لپک جھپک افریقہ میں نظر نہیں آتیں۔

◆◆◆

تباہ حال گوشہ سکون

موگا دیشو پہنچے تو ہو کا وہی عالم کہ بغداد کے افسانوں میں جس کا ذکر ملتا ہے جیسے کوئی آدم خور بلا شہر میں پھر گئی ہو۔گلیاں ویران' بازار سنسان' عمارتیں خالی' ہوٹل برباد جہاں جہاں فوج تھی وہاں جنگل میں منگل کا سماں تھا۔لیکن سوال یہ تھا کہ آخر وہاں غیر ملکی فوجیں تھیں ہی کیوں؟

ہمیں حیرت اس بات پر تھی کہ صومالیہ صرف مسلمان ملکوں ہی میں نہیں' دنیا کے ملکوں میں واحد ملک تھا جس کے ہاں خانہ جنگی کا کوئی جواز بنتا نہیں تھا۔عام طور پر کسی ملک کے لوگ آپس میں دست بگریبان ہو جائیں' لڑائی مار کٹائی پر اتر آئیں اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں تو اس کی وجہ مذہبی تفرقہ بازی ہوتی ہے جیسے شیعہ' سنی' دیو بندی' بریلوی' وہابی وغیرہ وغیرہ۔لسانی وجہ' زبان کی تفریق یا نسلی تفاخر۔کم از کم یہ تینوں وجوہ تو صومالیہ میں موجود نہ تھیں۔مذہبی طور پر صومالیہ کی ۹۹ فیصد آبادی ایک ہی مسلک رکھتی ہے۔تمام لوگ سنی شافعی ہیں اور توحید کے زبردست قائل۔قرآن کو خوب سمجھتے ہیں اور عربی زبان اچھی خاصی لکھی' پڑھی' بولی اور سمجھی جاتی ہے۔پورے ملک کی زبان بھی ایک ہے۔نسلی طور پر صومالیہ کے تمام باشندے ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کے جد امجد کا نام صومال تھا۔شاید یہ عربی لفظ ''ذومال'' کی ایک شکل ہے جس کا مطلب ہے مال والا اور صومالیہ میں مالدار شخص وہی ہوتا ہے جس کے پاس مال مویشی زیادہ ہوں۔خود صومالی زبان میں صومال کا مطلب ''دودھ والا'' ہے۔مفہوم دونوں کا قریب قریب ایک ہی ہوا۔تو ان سب کا جد امجد ایک ہی تھا۔آج جو قبیلے باہم برسر پیکار ہیں' اسی ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ دو بڑے متحارب گروپوں کے سربراہ فرح عدید اور علی مہدی محمد کا تعلق تو ایک ہی قبیلے سے ہے دونوں ہویے (Hawiye) قبیلے سے متعلق ہیں۔ان کی شاخوں میں فرق ہے۔جنرل فرح عدید ہبر قدر ہیں اور علی مہدی محمد ابگال۔لڑانے والوں نے انہیں اس بات پر لڑا دیا کہ برتر کون ہے۔۔۔۔۔۔ہبر قدر یا ابگال؟

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

تمام ملک میں ایک ہی زبان بولی جاتی ہے' صومالی۔شمال اور جنوب میں لہجے کا تھوڑا سا فرق ہے لیکن ابلاغ میں کوئی دقت پیش

نہیں آتی۔سب ایک دوسرے کی زبان کو اچھی طرح سمجھتے ہیں تو مذہبی' نسلی اور لسانی طور پر متحد ایک قوم میں اتنی دراڑیں' اتنے شگاف' اتنے اختلاف کیسے پیدا ہو گئے کہ انہوں نے لڑ لڑ کر اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔بلاشبہ یہ غیروں کی سازش تھی۔(تفصیلات کے لیے دیکھئے ''آپریشن صومالیہ'' از رفیق ڈوگر)

لیکن سوال یہ تھا کہ خود صومالیہ کی قیادت میں کوئی ایسا نہیں تھا جسے اس نقصان کا احساس ہوتا اور وہ لڑتے ہوئے لوگوں کا ہاتھ تھام کر ان سے پوچھتا کہ کیوں' کس لیے لڑ رہے ہو۔یہی وہ احساس تھا جو دل میں لیے ہم متحارب گروپوں کے لیڈروں سے پوچھتے تھے۔

''الیس منکم رجل رشید؟''

اور ان کی مسکراہٹوں سے اور ان کے جواب سے پتہ چلتا تھا کہ قائدین پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگ ہیں۔اصل میں تو یہ سوال حضرت لوط علیہ السلام نے اس وقت اپنی قوم سے کیا تھا جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس قوم کی بدکاریوں' بدعملیوں اور غلیظ ترین گناہوں کی وجہ سے ان کی تباہی و بربادی کا فیصلہ ہو چکا تھا اور یہ فرشتے اسی کام کے لیے آئے تھے۔جب وہ حضرت لوط علیہ السلام کے پاس پہنچے تو قرآن کے الفاظ میں ''ان کی قوم کے لوگ بے اختیار ان کی طرف دوڑے دوڑے آئے۔لوط نے ان سے کہا......

''کچھ خدا کا خوف کرو اور میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے ذلیل نہ کرو۔کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں؟'' (سورۃ ہود: ۷۸)

باطن کا حال تو خدا بہتر جانتا ہے بظاہر صومالی قوم لوط کی سی بدکاریوں میں مبتلا نہ تھے لیکن آپس کی لڑائیوں میں انہوں نے خود اپنی اینٹ سے اینٹ بجائی تھی اور اب ان کی بستیاں اسی طرح تباہ حال تھیں جیسے قوم لوط کی بستیاں عذاب الٰہی کے بعد۔

تو وہ سوال میں چھپی طنز کو خوب سمجھتے تھے' اس کا کوئی جواب نہ پاتے تھے اور مسکراتے تھے۔

ایک دن ہم نے فرنٹیئر فورس رجمنٹ کی ایک بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر کرنل آفریدی سے اس ''معصوم'' سی خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ہمیں حسین شیخ علی قدارے سے ملوا دیں۔وہ چند روزہ عبد حکومت جس میں علی مہدی محمد صومالیہ کے صدر تھے' حسین شیخ ان کے وزیر اطلاعات و ثقافت تھے۔ان کا گھر موگا دیشو کے دوسرے کنارے پر تھا اور رستہ جنرل فرح عدید کے زیر اثر علاقوں سے گزرتا تھا۔کرنل آفریدی نڈر اور بے باک افسر تھا جو بلا تکلف تمام علاقوں میں گھومتا تھا۔انہوں نے جھٹ حامی بھر لی تھوڑی دیر میں ان کی جیپ فراٹے بھر رہی تھی۔آدھ پون گھنٹے میں ہم وزیر اطلاعات کے گھر پہنچ گئے۔دروازہ کھٹکھٹایا۔ایک صاحب نمودار ہوئے اور ہمیں اپنے ساتھ اندر لے گئے۔انہوں نے پہلی منزل پر ہمیں ایک کمرے میں بٹھایا گھر کی دو خواتین نے ہمارا استقبال کیا۔پتہ چلا کہ حسین شیخ تو جمعہ کی نماز پڑھنے فلاں مسجد میں گئے ہوئے ہیں۔یہ مسجد آبادی کے بیچوں بیچ واقع تھی جس کے ارد گرد بلند مکان تھے

اور بلند مکانوں کا مطلب تھا کہ ان پر مورچے تھے۔ ہم سب یونیفارم میں تھے۔ سرکاری جیپوں پر سفر کر رہے تھے جن پر اقوام متحدہ کا جھنڈا لہراتا تھا اور لوگ اس جھنڈے کو دیکھ کر مشتعل ہوتے تھے۔ کرنل آفریدی نے سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

''یار! نماز تو پڑھاؤ جمعے کی۔'' ہم نے معصومیت سے کہا۔

''آؤ چلیں۔'' کرنل آفریدی اٹھ کھڑے ہوئے۔ گھر کی خواتین نے بڑا اصرار کیا کہ رک جائیں لیکن ہم نے اجازت چاہی۔ انہوں نے جلدی جلدی ٹھنڈے پانی اور پھلوں سے ہماری تواضع کی۔ وہ گھر آئے مہمان کی تواضع کے اسلامی آداب سے واقف تھیں۔

مسجد میں نمازیوں کا اژدحام تھا۔ ہم گاڑیاں ایک طرف کھڑی کر کے مسجد میں داخل ہوئے۔ وضو کے لیے لوگ ایک کنویں سے پانی نکالتے تھے اور جوس کے چھوٹے چھوٹے دو تین ڈبوں میں پانی لے کر وضو کرتے تھے۔ ہم ابھی خالی ڈبوں کی تلاش ہی میں تھے کہ دو تین نوجوان پانی کے ڈبے لیے ہماری طرف بڑھے اور ہمیں وضو کرنے کو کہا۔ ہم نے ڈبے ان کے ہاتھ سے لینا چاہے تو انہوں نے ہاتھ کھینچ لیے۔ وہ خود ہمیں وضو کروانا چاہتے تھے۔ ان کی محبتوں کو دیکھ کر آنکھوں میں نمی اتر آئی جسے ہم نے وضو کے پانی میں چھپا لیا۔ اعتماد کے رشتوں کے وہ سرے جن کے کھو جانے کا احساس موگا دیشو ائیرپورٹ سے نکلتے ہوئے ہوا تھا' مل گئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن سے نہ ملنے کی ہدایت تھی جن سے دور رہنے کا حکم تھا۔ اقوام متحدہ کے صاحبان اقتدار کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ لا الہ الا اللہ کے پڑھنے والے کس رشتے میں پروئے جاتے ہیں۔

تحیہ المسجد کے نوافل پڑھنے کے بعد ہم نے خطیب صاحب کی تقریر پر توجہ دی۔ وہ عربی میں تقریر کر رہے تھے اور صومالیہ کی خانہ جنگی کی مذمت کرتے ہوئے لوگوں کو اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کر رہے تھے۔ صومالی بھائیوں کے ساتھ نماز جمعہ میں بہت لطف آیا۔

نماز کے بعد لوگوں نے ہمیں گھیر لیا۔ حسین شیخ علی قدارے سے وہیں ملاقات ہوئی۔ پوچھا کہ خطیب صاحب جو مسلسل عربی میں تقریر کر رہے تھے تو کیا عام لوگ عربی سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا کہ مذہب کی ساری تعلیم عربی ہی میں دی جاتی ہے۔ تب ہم نے خانہ جنگی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے پوچھا کہ یہ جو آپ لوگوں نے بستیوں کی بستیاں برباد کر لی ہیں' اپنے آپ کو تباہ و برباد کر ڈالا ہے' یہ کس کا نقصان ہے؟

انہوں نے بڑے تحمل سے ہاتھ ہماری طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا''

ارد گرد کھڑے ہوئے لوگ کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ ہم نے سوال دہرایا۔

''الیس منکم رجل رشید؟''

حسین شیخ نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور ان کوششوں کا ذکر کرنے لگے جو ان کے پیر امام محمد امام عمر حراب اور ان کے گروپ کی طرف سے ہو رہی تھیں۔ پھر بولے کہ قوموں کی تاریخ میں نہ چاہتے ہوئے بھی ایسے موڑ آ جاتے ہیں۔ آخر جنگ جمل ہماری تاریخ کا حصہ ہے کہ نہیں۔

ارد گرد کھڑے لوگ پھر دانت نکال کر ہنسنے لگے۔ سنجیدہ گفتگو کا موقع محل تھا نہیں۔ انہوں نے بڑے اصرار سے دوپہر کے کھانے کے لیے اپنے گھر چلنے کو کہا لیکن ہم نے اجازت چاہی۔ گاڑیوں میں بیٹھ کر روانہ ہونے لگے تو لوگوں نے ''عاش عاش الباکستان'' (پاکستان زندہ باد) کے نعرے لگائے۔

بریگیڈ ہیڈ کوارٹر واپس آئے تو یہ بات ذہن میں کلبلاتی رہی کہ عام لوگ عربی سمجھتے ہیں۔ شام کو میجر زاہد کے ساتھ ٹہلتے ہوئے ہم بیرونی گیٹ پر جا نکلے جس کے باہر ہر وقت بچے بالے جمع رہتے تھے کہ باہر نکلنے والی ہر گاڑی سے انہیں پانی کی کسی بوتل کی آس لگی رہتی تھی۔ ہم باہر نکلے تو کئی بچے جمع ہو گئے۔ پوچھا' تم عربی سمجھتے ہو۔۔۔۔۔۔۔ سب نے اثبات میں جواب دیا۔

''اور قرآن۔۔۔۔۔۔؟''

کئی بچوں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ ہم نے ایک بچے کو قریب بلایا اور پوچھا کہ اسے کتنی سورتیں یاد ہیں۔ بولا' کئی سی سن لو۔ خیال تھا کہ اسے تیسویں پارے کی چھوٹی چھوٹی دو چار سورتیں آتی ہوں گی۔ دعویٰ وہ یہ فرما رہا تھا کہ کہیں سے سن لو۔ ہم نے اپنی طرف سے مذاق میں کہا کہ سورۂ یٰسین سناؤ۔ اس نے ہاتھ باندھے' تعوذ اور بسم اللہ پڑھی اور سورۂ یٰسین کی تلاوت کرنے لگا۔ باقی بچے مودب ہو کر سن رہے تھے۔ ہم حیرت سے انہیں تکتے تھے۔ وہ ایک رکوع پڑھ چکا تو ہم نے اسے روکا اور دوسرے بچوں کی طرف رخ کرتے ہوئے پوچھا۔۔۔۔۔۔ سورۂ الکہف کسے یاد ہے؟ کئی بچوں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ سورۂ الکہف پندرہویں پارے سے شروع ہوتی ہے اور سولہویں پارے میں جا کر ختم ہوتی ہے۔ ہم نے ایک بچے کو تلاوت کے لیے کہا۔ وہ سورۂ الکہف پڑھتا تھا اور اگر کہیں اٹکتا تھا تو دوسرے بچے اسے لقمہ دیتے تھے۔ ہم حیران تھے کہ ان کا سب کچھ تو برباد ہو گیا۔ ادارے تباہ ہو گئے' کالج سکول بند ہیں' یونیورسٹی پر فوج کا قبضہ ہے تو یہ قرآن کب' کہاں' کس سے پڑھتے ہیں۔ مخالف سمت میں واقع دوسرے گیٹ کی طرف گئے۔ وہاں بھی یہ خوشگوار تجربہ ہوا کہ بچے عربی سمجھتے تھے' قرآن یاد کیے ہوئے تھے۔ پتہ چلا کہ ان کے بڑوں کو شدت سے اس بات

کا احساس تھا کہ حالات سدھرتے سدھرتے شاید ایک زمانہ بیت جائے۔ اس دوران اگر تعلیمی سلسلے معطل رہے تو ان کی نسلیں ان پڑھ رہ جائیں گی اور انہیں موجودہ سے بھی کہیں بڑے خوفناک بحران کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چنانچہ انہوں نے حالات کے ٹھیک ہونے' مدرسوں کے واگذار ہونے اور کسی گرانٹ کا' بیرونی مدد کا انتظار نہیں کیا بلکہ مسجدوں میں' میدانوں میں' ٹوٹی ہوئی دیواروں کی اوٹ میں' درختوں کے سایوں تلے مدرسے قائم کر دیئے تھے۔ بچوں کی کوئی یونیفارم مقرر تھی نہ اساتذہ کی تنخواہیں۔ ایک احساس ذمہ داری تھا جو ان سکولوں کو چلا رہا تھا۔ اس کے بعد ہم جہاں بھی جاتے' بچوں سے ان کی تعلیم کے بارے میں ضرور پوچھتے۔ یہ بات جانے کیسے مشہور ہوگئی۔ ایک دن ہم افگوئی روڈ پر جا رہے تھے کہ بچوں کا ایک گروپ نظر آیا۔ انہوں نے ہاتھ دے کر روکا۔ جہاں دوسرے بچے پانی کی بوتلوں کے متلاشی تھے' ایک بچے نے ایک درخواست ہمیں تھمادی۔ کسی خاتون ٹیچر کی طرف سے تھی میلے کچیلے سے کاغذ پر شکستہ سی تحریر۔ اس میں پاکستانیوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے درخواست کی گئی تھی کہ ان کے ''سکول'' کے لیے چند بلیک بورڈ اور چاک کا انتظام کر دیا جائے۔ درخواست پر پتہ نہیں تھا۔ ہم نے بچے سے پوچھا کہ یہ سامان کہاں پہنچایا جائے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا کہ آپ بندوبست تو کریں' میں آپ کو ڈھونڈ لوں گا۔ اور واقعی دو ایک دنوں کے بعد اس نے ہمیں یونوسام ہیڈکوارٹر کے باہر ''پکڑ'' لیا۔ ہم نے اسے بتایا کہ ان کی فرمائش انشاء اللہ پوری ہوگی اور وہ پاکستانی ہیڈکوارٹر سے آ کر مطلوبہ چیزیں لے جائے۔

یونوسام (یونائٹڈ نیشنز آپریشن فار صومالیہ) ہیڈکوارٹرز پاکستانی بریگیڈ ہیڈکوارٹر کے سامنے تین چار سو گز کے فاصلے پر تھا لیکن حکم یہ تھا کہ بغیر حفاظتی گارڈ کے یہ فاصلہ بھی طے نہ کیا جائے۔ وہاں روزانہ صبح کے وقت پریس بریفنگ ہوتی تھی۔ وہاں پہنچے تو رفیق ڈوگر صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ بریفنگ کے دوران اقوام متحدہ کے ترجمان نے بتایا کہ کل شام اقوام متحدہ کے ایک ہیلی کاپٹر کو ہنگامی طور پر فلاں جگہ لینڈ کرنا پڑا۔ پائلٹ کو رات ہی بحفاظت ہیڈکوارٹر لایا گیا تھا جبکہ ہیلی کاپٹر وہیں کھڑا تھا اور صبح کے وقت اقوام متحدہ کی ٹیم اس کی خرابی دور کرنے متعلقہ مقام پر پہنچ گئی تھی۔ اس دن ہم دانستہ طور پر یونیفارم میں نہیں تھے۔ ہیلی کاپٹر کی خبر گزشتہ رات سے ہمارے علم میں تھی اور پریس بریفنگ میں ہم بطور صحافی شریک تھے' اپنے ہفت روزہ ''ہلال'' کی نمائندگی کرتے ہوئے ------ ہم نے پوچھا کہ ہیلی کاپٹر کو ایمرجنسی میں کیوں لینڈ کرنا پڑا۔ ترجمان بولا۔ ''معلوم نہیں' اسے پاکستانی پائلٹ اڑا رہا تھا' تفصیلات کا انتظار ہے۔'' اس نے خرابی کی ذمہ داری پاکستانی پائلٹ پر ڈالتے ہوئے ڈپلومیٹک سا جواب دیا۔ ہم پھر کھڑے ہو گئے اور بولے کہ تفصیلات ہم بتائے دیتے ہیں۔ یہ جو امریکی واپس جا رہے ہیں' تمام اچھے ہیلی کاپٹر ساتھ لے جا رہے ہیں اور پرانے' بوسیدہ' ناکارہ ہیلی کاپٹر اقوام متحدہ کے سر منڈھ رہے ہیں۔ ان کی ادائیگی کرنے سے پہلے کسی نے سوچا کہ ہیلی کاپٹر کے نام پر اقوام

متحدہ نے کیا خرید لیا ہے۔''

ترجمان منجھا ہوا کھلاڑی معلوم پڑتا تھا۔ اس نے پھر گول مول سا جواب دیا کہ اس کے پاس تفصیلات نہیں پہنچیں۔ اطلاعات آنے پر وہ آئندہ کسی بریفنگ میں تفصیلات بتائے گا۔ سرکاری بریفنگ کے بعد کئی غیر ملکی نمائندوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ہم نے جی بھر کے بھڑاس نکالی۔ ترجمان کنکھیوں سے دیکھتا پاس سے گزر گیا۔

ہم موگا دیشو میں گھومتے رہے اور اپنے سرکاری کام کے ساتھ ساتھ صومالی لیڈروں سے وہی ایک سوال پوچھتے رہے۔

''الیس منکم رجل رشید؟''

اور ایک دن اچانک ایک صومالی صحافی نے بڑے یقین کے ساتھ اثبات میں جواب دیا۔ ''فیہ'' کہ ہاں بھلا آدمی ہے۔

''کون ہے ------ کہاں ہے ------ کیا کر رہا ہے؟'' ہم نے بہت سے سوال ایک ساتھ کر دیئے۔

موسیٰ عثمان دو لے صحافی تھا' کسی اخبار کے لیے کام کرتا تھا لیکن ان دنوں ہماری ایک یونٹ کے ساتھ مترجم کے طور پر منسلک تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے ضلعے میں ایک عالم ہیں شیخ حامد۔ انہوں نے اپنے ضلع کے تمام سرکردہ رہنماؤں کو ایک جگہ جمع کیا اور اس بات پر قائل کیا کہ تمام لوگوں کی سلامتی اسی میں ہے کہ ضلعے میں اسلامی شریعت سختی سے نافذ کر دی جائے (پاکستان کے برعکس صومالیہ میں ضلع بڑا نہیں ہوتا' شہر بڑا ہوتا ہے اور اس کے انتظامی یونٹ ضلعے کہلاتے ہیں) تمام نے اتفاق کیا اور موگا دیشو کے اس جنوبی ضلعے میں شریعت نافذ کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ شروع شروع میں گیارہ افراد لوٹ مار اور چوری کے واقعات میں گرفتار ہوئے۔ ان پر ایک اسلامی عدالت میں مقدمہ چلا۔ تین پر جرم ثابت ہوا۔ شریعت کے مطابق ان کے بائیں ہاتھ کلائیوں پر سے کاٹ دیئے گئے۔ باقی آٹھ باعزت طور پر بری کر دیئے گئے۔

''پھر ------؟'' ہم نے بے تابی سے پوچھا۔

''پھر کیا ------ ہمارے ضلعے میں امن ہے' سکون ہے۔ کوئی گولی نہیں چلتی' کوئی ڈاکہ نہیں پڑتا۔ آپ سونا اچھالتے ہوئے گزر جائیں' کوئی آپ کو میلی نگاہ سے نہیں دیکھے گا۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' ہم نے حیرت سے پوچھا۔

آپ آئیں ہمارے ضلعے میں' اپنی آنکھوں سے دیکھیں' اسلام کی برکتیں۔'' موسیٰ عثمان نے دعوت دی اور ہمیں سوچ میں ڈال دیا۔

”تو وہاں آنے کے لیے تو ہمیں کسی حفاظتی گارڈ کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔“

”بالکل کوئی ضرورت نہیں‘ ویسے آپ اپنی تسلی کے لیے گارڈ سمیت آنا چاہیں تو کسی کو کوئی اعتراض بھی نہیں ہوگا۔“

اور ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم ان کے ضلع میں جائیں گے جسے انہوں نے مدینہ ڈسٹرکٹ کا نام دے رکھا ہے۔ طے ہوا کہ وہ صبح سویرے کوئی ٹیکسی لے کر بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے باہر آ جائیں گے اور ہم نہتے ان کے ساتھ چلیں گے۔

مدینہ ڈسٹرکٹ کا راستہ جس علاقے سے ہو کر گزرتا تھا وہاں پانچ فرنٹیئر فورس رجمنٹ تعینات تھی جس کے ساتھ بہت پہلے‘ کمیشن کے فوراً بعد ہم نے ڈیڑھ سال گزارا تھا۔ ”جنٹلمین الحمدللہ“ کے ابتدائی ابواب میں جن تجربات کا ذکر ہے وہ اسی یونٹ کے ساتھ رہتے ہوئے پیش آئے۔ فوج میں یونٹ کے ساتھ تعلق خاندان کا سا ہوتا ہے۔ 5 ایف ایف کو وہاں پا کر ہمیں بھی بہت خوشی ہوئی تھی اور یونٹ نے بھی اپنائیت کا اظہار کیا تھا۔ کمانڈنگ آفیسر کرنل ذوالفقار علی رانا نے خاص طور پر ایک رات ڈنر کا اہتمام کیا اور ہماری فرمائش پر ایڈجوٹینٹ کیپٹن علی ابراہیم کو ہدایت کی کہ آئندہ یونٹ کی پارٹیاں گشت پر جائیں تو ہمیں ساتھ رکھیں۔ بلکہ ایک مرتبہ تو لیفٹیننٹ مہر نبی بخش ہمیں نیند سے جگا کر رات کے پچھلے پہر پٹرولنگ پر ساتھ لے گئے۔

تو پانچ ایف ایف ہمیں خوب جانتی تھی‘ پہچانتی تھی۔ جب موسیٰ عثمان دوالے اپنے ایک ساتھی عبداللہ حسن حرابی کے ساتھ ہمیں ایک ٹیکسی میں لے کر مدینہ ڈسٹرکٹ جا رہے تھے تو راستے پر چیک پوسٹوں پر متعین سردار صاحبان اور جوانوں نے حیرت کا اظہار تو کیا لیکن راستہ نہیں روکا۔ ایک سردار صاحب کو شک ہوا تو انہوں نے ساری سواریاں نیچے اتار کر ان کی اور ٹیکسی کی تلاشی لی اور پھر ہمیں ایک طرف لے جا کر تنبیہ بھی کی کہ کہاں جا رہے ہیں۔ لیکن ہمیں مطمئن اور شادمان دیکھ کر جانے دیا۔

ہم جب مدینہ ڈسٹرکٹ پہنچے تو آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ زندگی یوں رواں دواں تھی جیسے یہ موگادیشو کا حصہ ہی نہ ہو۔ بازار بھرے پرے‘ لوگوں کی چہل پہل‘ اشیاء کی خرید و فروخت‘ خواتین اور بچوں کی آمد و رفت۔ خوف کا کوئی شائبہ نہ حزن و ملال کی پرچھائیں۔ ہم نے میزبانوں سے پوچھا کہ کیا سرکاری ادارے اور سکول بھی کھلے ہیں۔ جواب اثبات میں ملا تو ہم نے کسی عدالت کی کارروائی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ اپنی ”ضلع کچہری“ لے گئے۔ ایک برگد کے سائے تلے عدالت برپا تھی۔ جج ایک قرآن لیے بیٹھا تھا۔ مدعی ایک عورت تھی جس کا کہنا تھا کہ ملزم جو اس کے گھر میں ملازم تھا‘ کوئلوں کی بوری چرا کر لے گیا ہے۔ ہم کچھ دیر کارروائی سنتے رہے‘ پھر عدالت کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اٹھ آئے۔

پتہ چلا کہ مدینہ ڈسٹرکٹ میں چودہ سکول پوری باقاعدگی سے کام کر رہے ہیں۔ باقی ضلعوں کے لوگوں نے بھی اپنے بچے وہاں

بھیجنے شروع کر دیے ہیں اور داخلوں کی مانگ کے پیش نظر سکول دن رات تین شفٹوں میں کام کر رہے ہیں۔ ہم نے ضلعی انتظامیہ سے ملنے کی خواہش کی تو میزبان ہمیں ڈسٹرکٹ کمشنر کے دفتر لے گئے۔ حاجی موسیٰ سودے یالا ہو کمشنر تھے اور پانچ چھ ان کے مشیر‘ جن میں صومالی فوج کا ایک ریٹائرڈ میجر محمد حسین علی بھی شامل تھا۔ انہیں صدر علی مہدی نے کمشنر مقرر کیا تھا۔ شریعت کے نفاذ کے بعد جب ان کے ضلع میں امن و امان قائم ہو گیا اور اس بات کی شہرت پھیلنے لگی تو جنرل فرح عدید نے ان پر حملہ کر کے مدینہ ڈسٹرکٹ پر قبضہ کرنا چاہا لیکن یہ حملہ پسپا کر دیا گیا۔ ہم نے کمشنر سے پوچھا کہ ان کے ضلعے کی آبادی کتنی ہوگی تو انہوں نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ دن کے وقت ان کی آبادی کچھ اور ہوتی ہے اور رات کو کچھ اور۔۔۔۔۔۔۔ رات کو آبادی بڑھ جاتی ہے۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہم نے وضاحت چاہی تو انہوں نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ باقی شہر میں لڑتے ہوئے گروپ کے بیشتر افراد رات کو ان کے ڈسٹرکٹ میں آ کر پناہ لیتے ہیں اور چین کی نیند سوتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے علاقے میں دو بنک بھی کام کر رہے ہیں اور باقی شہر کے لوگ اپنی امانتیں‘ وصیتوں کے ساتھ ان بنکوں میں رکھواتے ہیں۔ انہوں نے پاک فوج کا شکریہ ادا کیا جن کی مدد سے ان کے علاقے میں پانی اور بجلی کی فراہمی ممکن ہو سکی۔ پورے شہر میں وہی ایک علاقہ تھا جہاں رات کو روشنیاں ٹمٹماتی تھیں ورنہ باقی شہر میں گھپ اندھیرا رہتا تھا۔

کمشنر کے دفتر سے نکلے تو ہم نے اس عالم سے ملنا چاہا جن کی پرخلوص کوششوں کا ثمر سکون کی صورت مدینہ ڈسٹرکٹ میں ہویدا تھا۔ شیخ حامد شیخ احمد ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے ہیں۔ موسیٰ عثمان کی ترجمانی کے ساتھ ان کی گفتگو کا آغاز ہوا۔ وہ جوش میں آتے تو عربی میں گفتگو شروع کر دیتے۔ ہم نے ان سے درخواست کی کہ وہ عربی ہی میں گفتگو کریں کہ ترجمان کی معرفت گفتگو ٹھہر ٹھہر کر آگے بڑھتی تھی۔ تب انہوں نے پوری فصاحت و بلاغت کے ساتھ ان کوششوں کا ذکر کیا جو شریعت کے نفاذ کے لیے کی گئی تھیں۔ عاجزی و انکساری کا مجسمہ شیخ حامد شیخ احمد پاکستان کے لیے سراپا شکر گزار تھا۔ انہوں نے کہا ”ہمیں ۵ جون کے واقعے پر افسوس ہے جس میں ۲۳ پاکستانی شہید ہو گئے۔ ہمیں احساس ہے کہ پاکستانی ہزاروں میل دور سے ہماری مدد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ کلمہ طیبہ کے حوالے سے وہ ہمارے بھائی ہیں۔ آپ واپس پاکستان جائیں تو ہماری طرف سے پاکستانی قوم کا شکریہ بھی ادا کریں اور یہ پیغام بھی دیں کہ یہ جو افسوسناک واقعہ ہوا ہے وہ ان سیاسی گرگٹوں کے ہاتھوں رونما ہوا ہے جو ہمارے ہیں نہ تمہارے۔ لیکن چونکہ ہماری سرزمین پر ہوا اور ہم ان کی مدد نہ کر سکے اس لیے ہم شرمندہ ہیں۔“

جب تک ہم شیخ حامد کے ساتھ رہے‘ سکون پھوار بن کر دل و دماغ پر برستا رہا۔ ان سے اجازت لے کر باہر آئے تو چاہا کسی بازار سے یادگار کے طور پر کوئی چیز خرید لیں۔ ایک دکان میں ایک گھڑی کا انتخاب کیا۔ پندرہ ہزار شلنگ قیمت تھی۔ بھلے وقتوں میں ایک

امریکی ڈالر میں چالیس صومالی شلنگ ملتے تھے لیکن ملک برباد ہوا' معیشت تباہ ہوئی تو ڈالر ساڑھے چار ہزار صومالی شلنگ کا ہو گیا۔ ہمارے پاس سو سو ڈالر کے نوٹ تھے۔ دکاندار کے پاس بقایا دینے کے لیے لاکھوں شلنگ کہاں سے آتے۔ ایک نوجوان سے لڑکے نے پیشکش کی وہ ڈالر کو بھنا لائے گا۔ ہم نے نوٹ اسے دیا۔ جب تک ہم دکاندار سے باتیں کرتے رہے وہ لڑکا نوٹ بھنا لایا۔ دس ڈالروں کے پینتالیس ہزار شلنگ اور باقی نوے ڈالر۔ گھڑی کی قیمت ادا کر کے ہم بازار میں نکل آئے۔ باوجود انکار کے موسیٰ عثمان نے ہمیں بازار سے پھل خرید کر دیئے اور شام گئے ہم پاکستانی بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں واپس آ گئے۔

دوسرے دن کی پرواز سے ہمیں واپس پاکستان آنا تھا' آ گئے۔۔۔۔۔۔۔ اور ہاں وہ فلم جس کا سکرپٹ لکھنے کے لیے ہم نے یہ سفر اختیار کیا تھا' بنی۔۔۔۔۔۔۔ "امن کے سفیر" کے نام سے۔ ٹیلیویژن سے نشر بھی ہوئی۔ اٹلی میں ہر سال مسلح افواج کے بارے میں فلموں کا ایک میلہ ہوتا ہے' وہاں بھی یہ فلم بھیجی گئی اور اسے انعام بھی ملا جسے وصول کرنے کے لیے آئی ایس پی آر کے دو افسر روم گئے اور براستہ لندن واپس آئے۔ ہمارے حصے میں آئے مبارکباد کے وہ اکا دکا خط جو اخبار میں پڑھ کر قارئین نے بھیجے (اور ہم نے بصد شکریہ ہضم فرمائے) یا ایک نیا حکم نامہ کہ جو افسر روم گئے تھے ان سے پوچھ پوچھ کر بعد از سفر رپورٹ (Post Visit Report) لکھی۔

◆◆◆

موت کی چاپ

ایک دستاویزی فلم بنانے کے سلسلے میں صحرائے تھر اور اندرون سندھ کا سفر درپیش تھا۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے پروڈیوسر راشد پرویز' کیمرہ مین خانزادہ' بوم آپریٹر بشیر ضیاء' انجینئر سعید اور لائٹ مین رضوان بھٹی ہمراہ تھے۔ رات حیدرآباد گیریژن میں گزارنا تھی۔ آفیسرز میس میں گئے تو رہائشی کمروں کے عجیب سے نام تھے۔ خنسر' ڈالی' رتنوز' انوپانی۔۔۔۔۔۔۔ یہ صحرائے تھر میں مختلف جگہوں کے نام تھے۔ رکھنے والوں یہ نام جانے کس مصلحت کے تحت رکھے تھے۔ غور کیا تو ان میں ایک حکمت تو یہ نظر آئی کہ صحرا کی طرف جانے والے ان ناموں سے مانوس ہو جائیں اور خدانخواستہ کہیں بھٹک جائیں اور نقشہ بھی پاس نہ ہو تو نام تو یاد رہ جائیں کہ پوچھتے پوچھتے کسی گوٹھ تک تو پہنچ سکیں اور واپس آنے والے جب ان خنک کمروں میں ٹھہریں تو ان جگہوں کی جھلسا دینے والی گرمی کو یاد کر کے خدا کا شکر ادا کریں۔ ہم "ڈالی" میں تھے جو چھاچھرو سے گڈرو کی رستے میں واقع ایک گوٹھ کے نام پر رکھا گیا تھا۔ سونے کی تیاریوں میں تھے جب ایک فون آیا۔

"ہم آپ کو کراچی میں ڈھونڈ رہے ہیں اور آپ یہاں تشریف فرما ہیں۔"

یا اللہ خیر۔۔۔۔۔۔۔ پی آر او کی ڈھنڈیا اسی وقت پڑتی ہے جب اخبارات میں کوئی شرارت ہو گئی ہو۔ پتہ چلا کہ ایک دن پہلے قائم مقام سٹیشن کمانڈر حیدرآباد کینٹ کرنل سید مرغوب زیدی نے حیدرآباد جیل جا کر کیپٹن ارشد جمیل سے ملاقات کی تھی اور اسے بتایا تھا کہ سپریم کورٹ کی طرف سے اس کی آخری آئینی درخواست بھی مسترد کر دی گئی ہے اور اڑتالیس گھنٹوں بعد اسے پھانسی دے دی جائے گی۔ وہ چاہے تو وصیت لکھ لے اور اپنے رشتہ داروں سے آخری ملاقات کر لے۔ ایک اخبار نے یہ ملاقات سٹیشن کمانڈر کی بجائے حیدرآباد کے گیریژن کمانڈر میجر جنرل محمد افضل جنجوعہ سے منسوب کر دی تھی۔ (جنرل جنجوعہ بعد میں لیفٹیننٹ جنرل ہو کر سندھ کے کور کمانڈر رہے' آج کل جی ایچ کیو میں انسپکٹر جنرل ٹریننگ اینڈ ایویلیویشن (IGT and E) ہیں) جنرل جنجوعہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھے' کسی کام کے سلسلے میں "چھور" گئے ہوئے تھے۔ اس غلطی سے کوئی قیامت نہیں آ گئی تھی لیکن ڈویژن ہیڈ کوارٹر کے سٹاف افسروں کا اصرار تھا کہ اس کی تصحیح شائع کروائی جائے۔ ہم نے سٹیشن کمانڈر سے بات کی اور اصل واقعے کی تفصیلات جاننے کے بعد متعلقہ ایڈیٹر سے بات کی۔ انہوں نے دوسرے دن معذرت کرتے ہوئے تصحیح شائع کر دی۔

کیپٹن ارشد جمیل نے ٹنڈو بہاول کیس میں کلیدی کردار ادا کیا۔ پاکستان کی تاریخ میں شاید کبھی کسی کیس کی اتنی تشہیر نہیں ہوئی تھی جتنی ٹنڈو بہاول کیس کی ہوئی۔ اس کیس پر سید کائنات ﷺ کی وہ حدیث صادق آتی ہے (جس کا مفہوم یہ ہے) کہ اچھے دوست کی مثال ایک عطار کی سی ہے کہ اس کے پاس جا کر بیٹھو تو وہ تمہیں خوشبو نہ بھی دے تو معطر خوشبوؤں سے لطف اندوز ہوتے رہو گے اور برے دوست کی مثال لوہار کی سی ہے کہ وہ برا نہ بھی چاہے تو اس کے پاس بیٹھنے سے کپڑوں پر چنگاریاں پڑتی رہیں گی' تپش بھی آئے گی اور آنکھوں میں دھواں الگ۔۔۔۔۔۔تو ارشد جانے کب' کیسے مفاد پرستوں کے نرغے میں آیا اور ان کی خودغرضیوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔

لالہ محی الدین پٹھان کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جو پچاس سال پہلے تلاش معاش کے سلسلے میں کابل سے آیا اور حیدرآباد کے قریب ٹنڈو بہاول میں آباد ہوا۔ شروع میں کپڑے کی دکان کھولی اور بڑی محنت سے قسمت آزمائی کا آغاز کیا۔ ایک مقامی زمیندار اس کی محنت اور دیانت سے متاثر ہوا اور اس نے اسے اپنا لے پالک بنا لیا۔ کچھ اپنی محنت' کچھ زمیندار کی کرم فرمائیاں۔۔۔۔۔۔لالہ محی الدین کا کاروبار چمک اٹھا۔ آمدنی بڑھی تو اس نے حیدرآباد کے مرکزی علاقے میں بڑا ہوٹل تعمیر کیا۔ سندھ کی اہم شخصیات' سیاستدان' حکام اور زمیندار اس ہوٹل میں آتے اور لالہ محی الدین پٹھان کے اثر و رسوخ میں استحکام کا سبب بنتے۔ اپنے گاڈ فادر حاجی فتح خان بھرگڑی سے تعلقات اتنے بڑھے کہ لالہ محی الدین کی بہن کی شادی اس کے بیٹے سے ہوئی۔ اب حاجی فتح محمد نے اپنی ساری جائیداد کا انتظام و انصرام اسی کے سپرد کر دیا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو اس نے ۱۳۴۰۰ ایکڑ زمین ایک بنگلہ اور ایک ہوٹل ترکے میں چھوڑا۔ نہ صرف اس کی جائیداد کا انتظام محی الدین پٹھان ہی کے ہاتھوں میں رہا بلکہ دو اور زمینداروں حاجی مدد علی اور جہاں خان کی زمینوں کی دیکھ بھال بھی اس کے سپرد ہوئی۔ تینوں کی وفات کے بعد صرف دو وارث باقی بچے۔ حاجی فتح علی خان کی بیٹی جادو اور مدد علی کی بیٹی سمی۔

دولت کی چکا چوند سے گھٹیا انسانوں کے دیدوں کا پانی ڈھل جاتا ہے۔ لالہ محی الدین اپنے محسنوں کے احسانات بھلا بیٹھا اور زمینوں پر قبضے کے خواب دیکھنے لگا۔ خطرہ محسوس کیا تو جادو نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار دریا خان عرف خمیسو اور سمی نے غلام حسین بھرگڑی کو اپنا مختار کار (اٹارنی) مقرر کر دیا۔ انہوں نے جلد ہی پتہ چلا لیا کہ لالہ محی الدین نے کاغذات میں ردوبدل کے ذریعے زمین کے کئی قطعات اپنے نام منتقل کرا لیے ہیں۔ لالہ محی الدین' اس کے بہنوئی غلام نبی پٹھان اور برادران نسبتی پولیس انسپکٹر مشتاق اور غلام نبی نے محسوس کیا کہ ان کی کرتوتوں کا پردہ چاک ہوا تو نہ صرف مقبوضہ جائیداد سے ہاتھ دھونے پڑیں گے بلکہ جیل کی ہوا بھی

کھانی پڑے گی۔ چنانچہ انہوں نے قتل و غارت کا ایک خوفناک منصوبہ بنایا۔

ہوٹل میں آنے جانے کی وجہ سے میجر ارشد کی لالہ محی الدین پٹھان سے شناسائی ہوئی' جو دوستی میں بدل گئی۔ وقوعے کے وقت وہ توپخانے کی ایک یونٹ میں متعین تھا اور ایک بیٹری کمانڈ کر رہا تھا۔ مئی کے آخر میں اسے انٹرنل سکیورٹی کے سلسلے میں جامشورو جانے کا حکم ملا۔ یکم جون کو ایک پولیس کانسٹیبل انٹرنل سکیورٹی کے لیے ایک ٹیوٹا ہائی لکس لے کر بیٹری میں آیا اور ایک حوالدار کے حوالے کر کے چلا گیا۔ اس گاڑی میں لکڑی کے پانچ بکس پڑے ہوئے تھے۔ حوالدار نے میجر ارشد کو اطلاع دی تو اس نے انہیں بیٹری سٹور میں رکھوا دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان ڈبوں میں کلاشنکوف اور گرنیڈ تھے۔ میجر ارشد نے تمام متعلقین کو اس بارے میں خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ پانچ جون کو میجر ارشد نے اپنی بیٹری کے پندرہ افراد کو ساتھ لیا اور انہیں نقشے کی مدد سے بتایا کہ ٹنڈو بہاول گاؤں میں کچھ ڈاکو چھپے ہوئے ہیں' ان کے خلاف اپریشن کرنا ہے۔ وہ دو گاڑیوں میں سوار ہوئے۔ غلام نبی پٹھان ان کے ہمراہ تھا اور ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ رات ساڑھے دس بجے وہ ٹنڈو بہاول پہنچے اور وہاں سے مندرجہ ذیل افراد کو گرفتار کر کے گاڑیوں میں بٹھا لیا۔

حاجی اکرم چانڈیو' غلام مصطفیٰ کندو' جاوید حلو کولی' غلام حسین بھرگڑی' اس کا بیٹا شفیع محمد' دھنی بخش' عثمان خاص خیلی' امام بخش اور اس کے بیٹے بہادر اور منٹھر چانڈیو۔ راستے میں امام بخش گاڑی سے چھلانگ لگا کر اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے واپس آ کر گاؤں والوں کو ساری بات بتائی۔

میجر ارشد تمام افراد کو لے کر جامشورو پمپنگ سٹیشن پر پہنچا اور اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ یہ سب لوگ ڈاکو' چور اور قاتل ہیں۔ اس کے حکم پر سب افراد کو گاڑیوں سے اتار کر انتہائی سرد مہری سے گولیوں سے بھون دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد میجر ارشد نے اپنے یونٹ کو وائرلیس پر اطلاع دی کہ اس پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے اور وہ مقابلے میں مصروف ہے۔ یونٹ نے فوراً کچھ افسروں کو اس کی "مدد" کے لیے بھیجا۔ جب تک یہ افسر جائے واردات پر پہنچے "مقابلہ" ختم ہو چکا تھا اور ارشد نے "کئی ڈاکو" ہلاک کر دیے تھے لیکن شاید وہ مکافات عمل کے قانون سے ناآشنا تھے۔

قریب ہے یارو روز محشر' چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبان خنجر' لہو پکارے گا آستیں کا

جن پر فائر کیا گیا تھا اور جنہیں مردہ سمجھ لیا ان میں محمد حسین بھرگڑی اور عثمان خاص خیلی ابھی زندہ تھے۔ بعد میں وہ استغاثے کے گواہ بنے۔ سخت زخمی حالت میں انہیں سی ایم ایچ منتقل کیا گیا۔ وقتی طور پر تو یہ کہانی گھڑی گئی کہ یہ سب لوگ ڈاکو' دہشت گرد اور غیر ملکی

ایجنٹ تھے۔ دوسرے دن وزیر اعظم محمد نواز شریف حیدر آباد آئے تو انہیں بھی یہی بتایا گیا اور انہیں وہ اسلحہ اور گرنیڈ دکھائے گئے جو ڈاکوؤں سے برآمد ہوئے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ پوری کہانی من گھڑت تھی۔ لیکن جب مقتولین "ڈاکو" تھے ہر کوئی ان کے قتل کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔ پولیس حسب معمول پیچھے نہ رہی۔ ۶ جون کو جامشورو تھانے میں جو ایف آئی آر کاٹی گئی اس میں کئی پولیس افسروں کو "پولیس مقابلے" میں شامل کر دیا گیا۔ بتایا گیا کہ "۵ جون ۱۹۹۲ء کو سب انسپکٹر اللہ ڈنو سب انسپکٹر مشتاق احمد' اے ایس آئی علی اکرم' ہیڈ کانسٹیبل امیر علی' محمد بچل' کانسٹیبل علی نواز' رب رکھا' حاجی مظفر علی' اے ایس آئی مشیر احمد' عبدالحمید' عاشق حسین قانون نافذ کرنے والے ادارے کے عملے کے ہمراہ رات کے وقت پٹرولنگ کر رہے تھے۔ رات گیارہ بجے دریائے سندھ کے بند پر پہنچے تو پمپ سٹیشن کے پاس ان پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ دو گھنٹے کے مقابلے میں نو ڈاکو ہلاک ہو گئے۔"

اصل صورت حال کا علم ہوتے ہی فوج کی احتسابی مشینری حرکت میں آ گئی۔ یونٹ کمانڈر سے لے کر جنرل آفیسر کمانڈنگ حیدر آباد گیریژن میجر جنرل اسلم اسحاق برطرف کر دیئے گئے۔ میجر ارشد اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ میجر ارشد کو فوری طور پر ڈیموٹ کر کے میجر سے کپتان بنا دیا گیا۔ اور مقدمے کی سماعت کے لیے فیلڈ جنرل کورٹ مارشل تشکیل دی گئی۔ سماعت کے دوران کیپٹن ارشد نے موقف اختیار کیا کہ اسے لالہ محی الدین پٹھان اور غلام نبی پٹھان نے بتایا تھا کہ سب مقتولین ڈاکو اور دہشت گرد تھے اور انہوں نے پورے گاؤں والوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اگر اس کی بات مان بھی لی جاتی تو اسے یہ حق کس نے دیا تھا کہ وہ انہیں ہلاک کر دے۔ پھر گاڑی میں سے ملنے والے اسلحہ کو چھپا کر رکھنا' دیہاتیوں کو گاؤں سے اغوا کرنا اور مقابلے کا ڈرامہ رچانا' سارے واقعات اس کے خلاف گواہی دے رہے تھے۔ اس نے فوجی عدالت سے درخواست کی کہ لالہ محی الدین پٹھان اور غلام نبی پٹھان کو اس کی طرف سے صفائی کے گواہوں کے طور پر طلب کیا جائے لیکن محی الدین پٹھان تو پر اسرار حالات میں پولیس کی تحویل میں ہلاک ہو گیا جبکہ غلام نبی پٹھان تا حال مفرور ہے۔ فوجی عدالت نے چار مہینوں میں اپنی کارروائی مکمل کر لی اور ۳۱ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو ارشد جمیل کو ملازمت سے برطرفی اور سزائے موت سنائی جبکہ دیگر تیرہ فوجی افراد کو بھی ملازمت سے برطرف کر کے عمر قید کی سزائیں سنائی گئیں۔ اس کے فوراً بعد ارشد جمیل کی بیوی اور بھائی کی طرف سے مقدمہ سول عدالتوں میں لے جایا گیا۔ سندھ ہائیکورٹ نے تفصیلی سماعت کے بعد کیس کو فوج کے ڈسپلن کا معاملہ قرار دیتے ہوئے مداخلت سے انکار کر دیا۔ پھر یہ مقدمہ سپریم کورٹ میں گیا۔ وہاں بھی سزا بحال رہی۔ چیف آف آرمی سٹاف اور صدر مملکت سے رحم کی اپیلیں بھی کی گئیں جو مسترد ہو گئیں۔

اس کے بعد ارشد جمیل کی والدہ نور جہاں کی طرف سے سپریم کورٹ میں انسانی حقوق کے حوالے سے ایک آئینی درخواست دائر

کی گئی جس میں موقف اختیار کیا گیا کہ ارشد جمیل کو فوجی عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل کا حق نہیں ملا۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۵ء کو سپریم کورٹ نے تفصیلی سماعت تک سزائے موت پر عمل درآمد روک دیا۔

جب ملک کی اعلیٰ ترین عدالت میں ارشد کا کیس زیر التوا تھا کچھ مفاد پرستوں نے متاثرہ خاندانوں کے بھولے بھالے دیہاتیوں کو بہلا پھسلا کر ایک اور ڈرامہ رچایا جس میں مزید دو خواتین موت کے گھاٹ اتر گئیں۔ انہیں اس بات پر راضی کیا گیا کہ وہ ارشد جمیل کو پھانسی نہ دینے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنے کپڑوں کو آگ لگا لیں۔ انہیں یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ کپڑوں میں آگ لگتے ہی انہیں بچا لیا جائے گا لیکن خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلے گی اور حکومت انہیں مزید سہولتیں دینے پر مجبور ہو جائے گی۔ چنانچہ ایک متاثرہ خاندان کی عورت زیب النساء اور اس کی بہن حاکم زادی نے ۱۱ ستمبر ۱۹۹۶ء کو حیدر آباد میں جی او آر کالونی کے سامنے اپنے کپڑوں پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا لی۔ فوری طور پر جمع ہونے والے لوگوں نے انہیں بچانے کی کوشش کی اور آگ بجھا کر انہیں آغا خان ہسپتال بھجوا دیا گیا جہاں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دونوں خواتین ۲۰ اور ۲۱ ستمبر کو انتقال کر گئیں۔

اس واقعے سے پہلے تک حکومت ٹنڈو بہاول کیس کے متاثرہ خاندانوں کو بحال کرنے کی کوششیں کر چکی تھی۔ ہر مقتول کے قانونی وارث کو تین لاکھ روپے اور زخمیوں کو ایک ایک لاکھ روپے دیئے گئے تھے۔ مجموعی طور پر ۲۸ لاکھ روپے ادا کئے گئے۔ مقتولین کے ورثا کو پچیس پچیس ایکڑ زمین دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ مقتولین کے ورثاء کو ملازمتیں بھی فراہم کی گئی تھیں۔ خودسوزی کرنے والی ایک خاتون حاکم زادی کو سوئی سدرن گیس کمپنی میں ملازمت دی گئی تھی۔ حاکم زادی نے دوسری شادی کر لی تھی اور دوسرے شوہر سے اس کا ایک بچہ بھی تھا۔ حاکم زادی کو خودسوزی پر اکسانے میں اس کے شوہر فیروز بھٹی کا ہاتھ تھا۔ ایک روایت کے مطابق وہ اس شادی سے خوش نہیں تھا۔ اس نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔۔ حاکم زادی سے چھٹکارا اور حکومت سے متوقع سہولتوں کا حصول۔ ٹنڈو بہاول کے تمام باشندوں کو ان کی خواہش کے مطابق اسلحے کے لائسنس مہیا کئے گئے تھے۔

اکتوبر ۹۶ء کے آخر میں ارشد جمیل کی انسانی حقوق کے حوالے سے دائر کردہ آئینی درخواست سپریم کورٹ نے خارج کر دی۔ ۲۸ اکتوبر سوموار کے دن اسے حیدر آباد جیل میں پھانسی دی جانی تھی۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ پاک فوج کا کوئی حاضر سروس افسر اپنے جرم کی سزا پاتے' پھانسی چڑھ رہا تھا۔

ہم اندرون سندھ کے شہروں دادو اور سیہون شریف سے واپس لوٹے تو تھکن سے بدن چور چور تھا۔ اس بار ہمیں "انو پانی" میں جگہ ملی۔ آرام دہ بستر' صاف ستھرا باتھ روم' گہری اور پرسکون نیند کا خیال ہی بڑا خوشگوار تھا۔ لیکن نہا دھو کر لائٹ بجھا کر بستر پر لیٹے تو

ارشد جمیل آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ آج اس کی زندگی کی آخری رات تھی۔ صبح سویرے سورج طلوع ہونے سے پہلے اس نے دنیائے فانی سے کوچ کر جانا تھا۔ سوچا کہ ہم اگر ارشد جمیل کی جگہ ہوتے تو کیا حالت ہوتی۔ زبان پر بے ساختہ کلمہ طیبہ اور درود شریف کا ورد جاری ہو گیا۔ خود کو کال کوٹھری میں محسوس کیا۔ سلاخوں سے باہر پہریداروں کے بھاری بوٹوں کی چاپ جو موت کی چاپ محسوس ہوتی تھی' گزرے ہوئے دن آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ کیا کوئی عمل ایسا تھا جو آنے والی زندگی میں کام آتا؟ انسان کی ساری زندگی دوست بنانے اور زندگی سنوارنے ہی میں گزر جاتی ہے لیکن آنکھیں بند ہوتے ہی اس کے دوست' احباب ہی سے اٹھا کر قبر تک پہنچا آتے ہیں۔ دنیا کی ساری کمائی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ بقول نظیر اکبر آبادی:

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

ساتھ تو صرف وہ نیکیاں جاتی ہیں جو رضائے الٰہی کی خاطر کی جائیں۔ اس کے لیے شعوری کوشش لازم ہے۔ راہ چلتے کسی فقیر سے جان چھڑانے کی خاطر اس کی ہتھیلی پر چند سکے رکھ دینا ہی انفاق فی سبیل اللہ نہیں ہے۔

''تم نیکی کو نہیں پا سکتے جب تک وہ چیز (اس کی راہ میں) خرچ نہ کرو جس سے تم محبت رکھتے ہو۔''

سورۃ الکہف کے آخر میں ایک آیت ہے:

(اے محمد ﷺ) ان سے کہو' کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ جن کی زندگی کی ساری جدوجہد راہ راست سے بھٹکی رہی اور سمجھتے وہ یہ رہے کہ جو کچھ کر رہے ہیں' ٹھیک ہے۔''

تو مبارک ہیں وہ لوگ جو زندگی کی مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اعمال کا جائزہ لیں اور ایسے عمل کرنے کی شعوری کوشش کریں کہ آخرت میں کام آئیں۔ لاشعوری طور پر ہم ایسے اعمال کو زندگی کے آخری حصے کے لیے موخر کرتے رہتے ہیں جبکہ کسی کو معلوم نہیں کہ موت کب' کہاں آ جائے۔ راہ چلتے' بیٹھے بیٹھے' لیٹے لیٹے' کسی بھی وقت فرشتہ اجل کی تشریف آوری ہو سکتی ہے اور وہ واحد ہستی ہے جسے آپ انتظار کے لیے نہیں کہہ سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی گنجائش رکھی ہوتی تو عزرائیل کا کام بہت بڑھ جاتا۔

''میں بی اے کر لوں۔''

''میں نے ابھی دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔''

''میرے چھوٹے چھوٹے بچے' انہیں بڑا تو ہونے دو۔''

''یہ گھر اتنی مشکل سے بنا کے سنوارا ہے' چند دن اس میں رہنے تو دو۔''

''جوان بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں۔''

''میں نے اپنے کسی بیٹے کی کوئی خوشی نہیں دیکھی۔''

''میرا ڈھائی کروڑ کا سامان پورٹ پر آیا پڑا ہے' اسے چھڑا نہ لوں ذرا؟''

''فصلیں تیار کھڑی ہیں' کٹائی کا موسم ہے بابا۔''

''الیکشن کا رزلٹ تو آ جائے۔''

''ذرا یہ ورلڈ کپ ہو لے' پھر اس کے بعد دیکھیں گے۔''

ہم میں سے کون ہے جو اس طرح کے مسائل سے نبرد آزما نہیں رہتا' لیکن سوال جواب کی گنجائش رکھی نہیں گئی۔ سورج نے مشرق سے نکل کر مغرب میں ڈوبتے رہنا ہے اور کاروبار حیات اسی طرح چلتے رہنا ہے لیکن جب بلاوا آ جائے تو بلا چون و چرا اس زندگی کو خیر باد کہنا پڑتا ہے تو خوش قسمت وہ لوگ ہوئے جو انہی مسائل میں الجھے الجھے زندگی کی گتھیاں سلجھا لیتے ہیں۔

اس روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

آخرت کا خوف دانائی کو جنم دیتا ہے اور جسے یہ دانائی میسر آ جائے اس کے لیے یہ زندگی بھی سہل' وہ بھی۔ ایسے ہی لوگ برملا یہ کہہ سکتے ہیں ''ہم اس قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔'' جو موت کے لیے تیار رہتا ہے' وہ موت سے ڈرتا نہیں ہے' مسکراہٹوں سے اس کا استقبال کرتا ہے۔

نشان مرد مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

جب ہم یہ سطور لکھ رہے تھے تو روزنامہ ڈان میں ایک خوبصورت مضمون پڑھنے کو ملا۔ سرفراز کیانی صاحب کا لکھا ہوا ''کیا آپ مرنے کے لیے تیار ہیں؟'' پورا مضمون تو بہت طویل ہے۔۔۔۔۔۔۔ چند اقتباسات:

''ہر جاندار کو ایک دن ضرور مرنا ہے اور آپ کو بھی۔ تو جو وقت میسر ہے اس سے بھرپور فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے۔ ہم سب اس لیے مرتے ہیں کہ ہمارے جسموں میں ایک پروگرام نصب ہے اور یہ زبردست شماریات پر مبنی ہے۔''

''موت کے ڈر سے چھٹکارا اسی وقت ممکن ہے جب انسانی ذہن اسے ایک لازمی امر کے طور پر تسلیم کر لے اور دنیاوی زندگی کے

مال ومنال کی محبت سی چھوٹ جائے۔"

"اپنے دس بارہ دوستوں سے پوچھیں کہ انہوں نے موت کے لیے کیا منصوبہ بندی کی ہے تو وہ حیرانی سے آپ کو تکنے لگیں گے۔ اس لیے کہ موت کے لیے منصوبہ بندی کوئی نہیں کرتا۔ جب موت اٹل ہے تو اسے سامنے رکھتے ہوئے باقی زندگی کی پلاننگ کیوں نہ کی جائے؟"

اپنے اردگرد نظر دوڑائیں تو آپ دیکھیں گے کہ سو برس یا اس سے زائد عمر کے افراد بہت کم نظر آئیں گے تو کم وبیش پچاسی برس کی اوسط عمر کا تعین کریں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ جو تخلیق پاکستان کے ساتھ پیدا ہوئے زیادہ سے زیادہ ۲۰۳۰ء تک جی سکیں گے۔ باقی رہ جانے والے عمر میں کوئی پونے چار سو مہینے اور پندرہ سو ویک اینڈ ہیں۔ باقی لوگ بھی اپنی عمروں کا تعین اور باقی رہ جانے والی عمر کا حساب لگا سکتے ہیں۔

"اگر آپ ان خواہشوں کو شمار کریں جو نا آسودہ ہیں تو دیکھیں گے کہ وقت تو بہت کم باقی رہ گیا۔ آپ نے کوئی ناول پڑھنا تھا؟ شاعری کا کوئی دیوان؟ کسی صحت افزا مقام کی سیر؟"

"جو آج کل پچاس کے پیٹے میں ہیں وہ رہ جانے والی عمر کے حساب سے پلاننگ کریں۔ اگر شادی نہیں کی تو فوراً کر ڈالیں لیکن بچوں کی خواہش نہ کریں۔ اگر گھر بنا لیا ہے تو فبھا ورنہ اب اس جھنجھٹ میں پڑ کر اپنا بڑھاپا خراب نہ کریں' بچت نہ کریں' کس کے لیے۔۔۔۔۔۔ جو کچھ ہے بچوں کی تعلیم پر خرچ کریں یا اپنی زندگی آرام سے گزارنے میں صرف کریں۔ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ترکے میں چھوڑی جانے والی دولت بڑی بے رحمی سے ضائع کر دی جاتی ہے۔"

"آیئے سکون سے مریں اور سکون سے مرنے کی منصوبہ بندی اسی زندگی میں ممکن ہے' آخرت میں نہیں۔"

موت کے بارے میں ایسا تیکھا مضمون کبھی نظر سے نہیں گزرا۔ بس ایک کمی ہے کہ سارا زور دماغ اسی زندگی کی منصوبہ بندی پر خرچ کیا گیا ہے جبکہ اصل زندگی تو اس زندگی کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اس کے لیے تیاری بھی اسی زندگی میں کرنی ہے۔ جہاں ناول اور شاعری کی کتابیں پڑھنی ہیں وہاں اس پیغام کو سمجھنے کی کوشش بھی ہونی چاہیے جو اس زندگی کی الجھنوں سے چھٹکارے کا راستہ بھی بتاتا ہے اور اس زندگی کی کامیابی کا بھی کہ جس کا کوئی انت نہیں۔ اس پیغام میں ناول پڑھنے پر پابندی ہے نا شاعری سے لطف اندوز ہونے کی ممانعت۔ شادی کی مخالفت ہے نا گھر بنانے کی حوصلہ شکنی۔ بس قبلہ درست رکھنا ہے۔ قدم قدم پر رب کو راضی رکھنے کی ترکیب کرنی ہے۔ ہر اس سہولت کو چھوڑنا ہے جس سے رب روٹھے اور ہر وہ کام کرنا ہے جس کا حکم ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے جب اس کے

پیغام سے جڑے رہیں۔ پتہ چلتا رہے گا' وہ کیا چاہتا کیا نہیں۔ انسان جہاں اس چند روزہ زندگی کی منصوبہ بندی کرے' وہاں ہمیشہ رہنے والی زندگی کے لیے بھی سوچ بچار کرے اور دیکھے کہ باقی رہ جانے والی زندگی میں کیا کچھ کیا جا سکتا ہے' مثلاً

☆ قرآن کو کسی تفسیر کے ذریعے سمجھنے کی کوشش۔ آج کل عام فہم تفاسیر لائبریریوں اور بازار میں عام دستیاب ہیں۔ کچھ سورتیں یاد کرنے کی منصوبہ بندی اور جو لوگ قرآن یاد کر کے بھول گئے ہیں وہ اہتمام کریں کہ کب' کتنا' کیسے یاد کرنا ہے۔ بلا منصوبہ بندی تو یہ کام ادھورا پڑا رہے گا اور مہلت عمر ختم ہو جائے گی۔

☆ حدیث کی کوئی ایک کتاب ترجمے کے ساتھ۔

☆ فرض نمازوں کے علاوہ یہ جو نوافل کی تلقین کی گئی ہے جیسے نماز اشراق' چاشت' اوابین' تہجد' صلوۃ تسبیح' تحیۃ الوضو' تحیۃ المسجد کب سے نہیں پڑھی؟ یہی تو تقرب الٰہی کا ذریعہ ہیں۔ انہی کے ذریعے انسان اللہ تعالیٰ کے اتنا قریب ہو سکتا ہے کہ پھر وہ انسان کی آنکھ' ہاتھ' کان بن جاتا ہے۔ ان سے واقفیت بھی ہے یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہو تو معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ ہمارے پبلشر عبدالوحید سلیمانی صاحب کو خط لکھیں۔ وہ اس بارے میں اچھی کتابیں (بعض اوقات بلا معاوضہ) فراہم کرتے ہیں' یا ہمیں لکھیں۔ اگر یہ نمازیں کبھی نہیں پڑھیں تو پہلی فرصت میں کم از کم ایک بار تو پڑھ لیں۔ آئندہ کے لیے منصوبہ بندی کریں کہ نیک عمل کرنے کی نیت سے بھی اکاؤنٹ بڑھتا ہے۔

☆ جس کو اللہ تعالیٰ نے جتنی زیادہ نعمتوں سے نوازا ہو' اس پر اتنا ہی زیادہ شکر واجب ہے۔ لازم ہے کہ اٹھتے بیٹھتے' چلتے پھرتے زبان سے شکر کے کلمات ادا ہوتے رہیں۔ اس سلسلے میں خدا کے پیارے حبیب ﷺ نے سونے کی دعا' اٹھنے کی دعا' گھر سے نکلنے کی دعا' گھر کو لوٹنے کی دعا' کھانا شروع کرنے اور کھانے کے بعد کی دعا اور اسی طرح روزمرہ کے معمولات میں پڑھنے والی بہت سی دعائیں سکھائی ہیں۔۔۔۔۔۔ انہیں جاننے' یاد کرنے اور ورد زبان بنانے کی منصوبہ بندی کریں۔

☆ انفاق فی سبیل اللہ کا حکم راہ چلتے فقیروں کو کچھ دینے سے ادا نہیں ہوتا' مستحق کو ڈھونڈ کر اس کی جائز ضرورتیں پوری کریں اور کم از کم ایک بار تو اتنا خرچ کریں کہ آپ کو خود تنگی محسوس ہو۔

☆ رمضان کے روزوں کے علاوہ بھی نفلی روزوں کی تلقین کی گئی ہے۔ مثلاً ایام بیض کے روزے' کم از کم ایک بار تو یہ روزے رکھیں اور آئندہ کے لیے منصوبہ بندی۔

☆ جیسے پکنک کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اس میں گھر کے سبھی افراد دل وجان سے حصہ لیتے ہیں' اسی طرح کوئی ایک دن "یوم عبادت"

کے طور پر وقف کریں اور گھر کے سبھی افراد کو اس میں شریک کریں۔

☆ جو شخص یہ چاہے کہ اس کی دعائیں مستجاب اور عبادتیں بارگاہ ایزدی میں مقبول ہوں' اسے دو باتوں کا اہتمام ضروری ہے۔۔۔۔۔

رزق حلال اور حقوق العباد کی ادائیگی۔

سید الکونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص رزق حرام کا ایک لقمہ کھاتا ہے' چالیس دنوں تک اس کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ گزشتہ دنوں ایک طبی کتاب کے مطالعے سے انکشاف ہوا کہ انسان جو کچھ کھاتا ہے اس کے اثرات چالیس دنوں تک جسم میں موجود رہتے ہیں۔ محترمہ بانو قدسیہ کے طویل ناول "راجہ گدھ" کا تو مرکزی خیال ہی یہی ہے کہ رزق حرام انسان کے Genes کو متغیر کرتا ہے اور آنے والی نسلوں میں جنون' دیوانگی یا پاگل پن کے اثرات چھوڑتا ہے۔

☆ اور آخری بات حقوق العباد سے متعلق۔۔۔۔۔۔ کہ روز محشر باری تعالیٰ اپنے حقوق تو معاف فرما دیں گے لیکن بندوں کے حق دینے پڑیں گے۔ جس نے کسی کا حق مارا ہوگا' کسی پر ظلم کیا ہوگا' کسی کی غیبت کی ہوگی تو اس کا حساب تو دینا پڑے گا اور یہ وہ دن ہوگا جب ماں بیٹے کے اور بیٹا ماں کے کام نہ آئے گا۔ سکہ رائج الوقت صرف نیکیاں ہوں گی اور مفلس ترین شخص وہ کہ جس کی ساری نیکیاں حقوق العباد کی ادائیگی میں دوسروں کو دے دی جائیں گی اور پھر بھی حقوق العباد بقایا ہوں گے تب دوسروں کے گناہ اس پر لاد دیئے جائیں گے۔

تو ہم ارشد کی بات کر رہے تھے۔ "انو پانی" کے آرام دہ بستر پر دراز تھے' جب ارشد کا خیال آیا۔ نیند اڑ گئی۔ اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ جی چاہا کسی طرح ارشد سے ملاقات کی جائے۔ انتظامیہ نے صحافیوں پر سخت پابندی عائد کر رکھی تھی۔ ہم نے ایک صحافی کو ارشد سے ملوانے کی کوشش کی تھی لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ ہم خود تو مل سکتے تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل سعید جو بطور کپتان سعودی عرب میں مقامات قرآن کے دورے میں ہمارے ساتھ تھے' حیدر آباد گیریژن میں جی ون تھے' انہیں فون کیا۔ پتہ چلا "چھوڑ" گئے ہوئے ہیں۔ ایک اور میجر صاحب کو فون کیا جنہوں نے جنرل جنجوعہ کے بارے میں غلط خبر کی اشاعت کی خبر دی تھی' کراچی گئے ہوئے تھے۔ براہ راست قائم مقام اسٹیشن کمانڈر کرنل مرغوب زیدی سے رابطہ کیا اور درخواست کی کہ وہ جیل جائیں تو ہمیں ساتھ لے چلیں۔ وہ فوراً ہی مان گئے۔ بولے "صبح چار بجے تیار رہنا' ہم آپ کو میس سے لے لیں گے۔"

رات سوتے جاگتے ہی گزری۔ مقررہ وقت پر وہ آ گئے۔ ہم تیار تھے۔ ان کے ساتھ ایک افسر اور تھے' لیفٹیننٹ کرنل امتیاز۔ ہم تینوں جیل کی طرف روانہ ہوئے تو کرنل مرغوب نے بتایا کہ گزشتہ شام ارشد جمیل نے اپنی بیوی' بچے اور بھائی سے آخری ملاقات کی۔

بار بار ماں کو پوچھتا تھا۔ "امی نہیں آئیں؟"

"امی کیوں نہیں آئیں؟"

"امی کو ساتھ لاتے۔"

کرنل مرغوب زیدی سخت پریشان تھے۔ کہتے تھے کہ یار دیکھو میں ڈاکٹر ہوں' میرا کام زندگی بچانا ہے لیکن حالات نے مجھے ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ آج مجھے ایک زندگی ختم کرنے کے احکامات پر دستخط کرنا ہوں گے۔

سوا چار بجے صبح ہم جیل کے دروازے پر پہنچے تو بیرونی دروازے کے باہر ادھر ادھر موٹر سائیکلیں اور اکا دکا گاڑیاں کھڑی تھیں اور دو دو تین تین کی ٹولیوں میں کھڑے لوگ باتیں کر رہے تھے۔ کرنل مرغوب بڑے حیران تھے کہ یہ کون لوگ ہیں اور اتنی صبح یہاں کیا کر رہے ہیں۔ ہم نے وضاحت کی کہ سر' یہ صحافی برادری ہے۔ انہوں نے یقیناً آپ کی گاڑی کا نمبر بھی نوٹ کر لیا ہوگا۔ صبح اخبار میں پڑھ لیجئے گا۔ (یہ پیشین گوئی حسب معمول درست ثابت ہوئی) جیل کے صحن میں پہنچ کر گاڑی ایک طرف پارک کی۔ اندرونی دروازے پر پہنچے۔ کسی نے درز سے جھانکا' پھر بھاری قفل کھلنے کی آواز آئی اور ہم ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے۔ پاکستان کی تقریباً سبھی جیلیں ایسے بنائی گئی ہیں کہ بیرونی اور اندرونی دروازے کے درمیان بیس پچیس فٹ کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اسے ڈیوڑھی کہتے ہیں۔ ڈیوڑھی کے دائیں بائیں دفاتر ہوتے ہیں یا قیدیوں سے ملاقات کے لیے آنے والوں کے لیے جالی دار کھڑکیاں۔ گویا جیل میں آنے والوں اور باہر جانے والوں کو لازماً ڈیوڑھی سے گزرنا پڑتا ہے اور ہر آنے جانے والے کا ایک رجسٹر میں اندراج کیا جاتا ہے۔ ہمارے کوائف نوٹ کرنے کے بعد ہمیں جیل سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں بٹھا دیا گیا۔

اپوائنٹمنٹ بورڈ کے مطابق حیدر آباد جیل میں سب سے پہلے ایک انگریز جی ڈبلیو لونگ مین ۱۲ جون ۱۹۳۳ء کو بطور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تعینات ہوا۔ جب سے اب تک چالیس افسر بطور سپرنٹنڈنٹ تعینات ہو چکے تھے لیکن ہم جس دن کا ذکر کر رہے ہیں' اس دن یہ عہدہ خالی پڑا تھا اور سزائے موت پر عمل درآمد کے لیے اسسٹنٹ انسپکٹر جیل خانہ جات اوکاش احمد شیخ خاص طور پر تشریف لائے تھے۔ یہ کافی پرانے افسر تھے۔ حیدر آباد جیل میں بھی دو مرتبہ تعینات رہ چکے تھے۔ ان کے دفتر میں بیٹھے ہم سب مضطرب اور ہراساں تھے۔ جبکہ ان کے لہجے میں معمول کا سکون تھا۔ انہوں نے سب کے لیے چائے منگوائی۔ پھر وہ خود تو چائے پی گئے ہم میں سے کوئی بھی ایک آدھ گھونٹ سے زیادہ نہ لے سکا۔ ہم سے رہا نہ گیا تو اوکاش صاحب سے پوچھا کہ اپنی زیر نگرانی وہ کتنی پھانسیوں پر عمل درآمد کروا چکے ہیں۔ بتایا کہ اس سے پہلے وہ اڑتالیس افراد کو پھانسی گھاٹ پار کروا چکے ہیں۔ آج انچاسویں پھانسی ہے۔

''ایک اور پھانسی کے بعد گولڈن جوبلی پوری کرلوں گا۔'' انہوں نے ہنستے ہوئے بتایا۔

کس قدر سنگدل اور وحشت ناک کام تھا لیکن اس میں بھی لوگوں کے لیے فخر کے مقام موجود تھے۔ ہم جو باقی تھے ہم سب کا نہ صرف موت کو قریب سے دیکھنے کا یہ پہلا تجربہ تھا بلکہ عجیب اتفاق تھا کہ سب لوگ اتفاقاً وہاں موجود تھے۔ کرنل مرغوب زیدی اصل میں تو سی ایم ایچ کے کمانڈنگ آفیسر تھے لیکن اسٹیشن کمانڈر چند دن قبل ریٹائر ہو گئے تھے۔ نیا افسر ابھی پوسٹ بھی نہیں ہوا تھا چنانچہ سٹیشن پر سینئر ترین کرنل ہونے کی وجہ سے وہ قائم مقام اسٹیشن کمانڈر تھے اور یہ ناخوشگوار فریضہ بھی انہیں انجام دینا پڑ رہا تھا۔ سٹیشن ہیڈکوارٹر کے ایک سٹاف افسر کرنل امتیاز قانونی کارروائی اور متعلقہ دستاویزات پر تمام متعلقین سے دستخط کروانے کے ذمہ دار تھے۔ ارشد کی یونٹ کا ایک افسر کیپٹن محمد رضوان ارشد کی شناخت کے لیے آیا تھا (قانونی ضرورت تھی) اور سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہا تھا۔ سی ایم ایچ کے ایک میجر ڈاکٹر محمود کی ڈیوٹی تھی کہ پھانسی کے بعد ارشد کی نبض چیک کرے۔ ان کی طرف سے ارشد کی موت کے اعلان کے بعد ہی اسے پھانسی کے پھندے سے اتارا جانا تھا۔ ہم تو خیر صحافیانہ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر چلے آئے تھے۔ سٹی مجسٹریٹ غفور علی جتوئی کی صرف دو دن پہلے پوسٹنگ ہوئی تھی اور وہ سخت مضطرب تھے کہ سب سے پہلا سرکاری فرض اس قدر ہولناک تھا۔

کاغذی کارروائی شروع ہوئی۔ اوکاش شیخ نے ایک کاغذ کرنل مرغوب کی طرف بڑھایا جس کے مطابق وہ ارشد جمیل کو صحیح سلامت فوج کے حوالے کر رہے تھے۔ کرنل مرغوب نے اس پر دستخط کر دیے۔ کیپٹن رضوان نے بھی دستخط کیے جو اس بات کی تصدیق تھے کہ فوج کے حوالے کیا جانے والا شخص ارشد جمیل ہی ہے۔ پھر کرنل مرغوب نے کچھ کاغذات اوکاش شیخ کے حوالے کیے جس میں مختصراً درج تھا کہ فیلڈ جنرل کورٹ مارشل نے ارشد جمیل کو موت کی سزا سنائی تھی۔ اس کے خلاف اپیلیں سندھ ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ سے مسترد ہو چکی ہیں۔ رحم کی اپیلیں بھی خارج ہو چکی ہیں چنانچہ ارشد جمیل کی سزائے موت پر عمل درآمد کروایا جائے۔

کاغذی کارروائی کی تکمیل پر ہم سب پھانسی گھاٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ اندرونی دروازے سے جیل میں داخل ہوئے تو دیکھا دروازے سے پھانسی گھاٹ جانے والے رستے پر دونوں جانب پانچ پانچ گز کے فاصلے پر جیل کے سپاہی کھڑے ہیں اور ان کے بیچ بیچ مٹی کے تیل سے جلنے والی لالٹینیں رکھی ہیں۔ رات کا اندھیرا ابھی باقی تھا اور جیل میں بجلی کے جو قمقمے تھے ان کی روشنی مدھم تھی۔ بجلی چلی جاتی تو بالکل گھپ اندھیرا ہو جاتا۔ ایسی صورت حال کے لیے ہی لالٹینوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہم جن سپاہیوں کے سامنے سے گزرتے وہ ''ہوشیار'' (اٹن شن) ہو کر سلیوٹ کرتے۔ جب ہم گزر جاتے تو وہ اپنی لالٹین اٹھا کر ہمارے پیچھے چلنے لگتے۔ پھانسی

گھاٹ پہنچنے تک ہمارے پیچھے سپاہیوں کا اچھا خاصا اژدحام اکٹھا ہو چکا تھا۔ پھانسی گھاٹ کے سامنے ایک میز اور اس کے اردگرد چند کرسیاں پڑی تھیں۔ اوکاش شیخ صاحب' کرنل مرغوب اور دوسرے افسروں نے کرسیاں سنبھالیں۔ روشنی ابھی بھی مدھم تھی۔ شیخ صاحب ایک ٹارچ بھی تھامے ہوئے تھے جس کی مدد سے وہ کاغذات ترتیب دے رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں بائیں جانب واقع پھانسی کی کال کوٹھڑیوں کی طرف سے کچھ سپاہی ارشد جمیل کو لیے حاضر ہوئے۔ دنیاوی کارندوں کے سامنے یہ گویا آخری پیشی تھی۔ ارشد جمیل جیل کے سفید کھدر کے کپڑوں میں ملبوس تھا اور اس کے ہاتھ پشت کی جانب ہتھکڑی سے بندھے ہوئے تھے۔ نواڑ کی ایک پٹی سے بازو بھی باندھے گئے تھے۔ وہ پراعتماد تھا' اس کی چال میں کوئی لڑکھڑاہٹ نہ تھی۔ جاندار قدموں سے چلتا وہ آیا اور میز کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ہم نے اس آخری کارروائی کی بہت سی کہانیاں سنی تھیں۔ بڑے بڑے جی دار لوگ اس مرحلے پر آ کر حوصلہ ہار جاتے تھے اور ان کے لیے اپنے پیروں پر کھڑا رہنا مشکل ہو جاتا۔ کئی لوگوں کو یہاں سے سٹریچر پر پھانسی گھاٹ لے جایا جاتا رہا ہے۔ ارشد کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ جب سے جیل آیا تھا مسلسل قرآن کی تلاوت کرتا رہا تھا اور زیادہ وقت عبادت میں گزارتا تھا۔ گزشتہ بہتر گھنٹوں میں اس نے مسلسل عبادت کی تھی اور ایک گھنٹہ بھی نہ سویا تھا۔ آخری ملاقات کے علاوہ اس نے کسی سے بات چیت بھی نہ کی تھی۔ عبادت کی انہی کیفیات کے دوران شاید اسے اشارہ مل گیا تھا کہ اس کی خطائیں معاف کر دی گئیں کہ وہ رب غفور ہے' رحیم ہے۔ خشوع و خضوع کے ساتھ اس کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھائے جائیں تو دعاؤں کا جواب بھی آتا ہے اور یہی جواب انسان کو سکون بخشتا ہے۔ دعا قبول ہو جائے تو بھی اور نہ قبول ہو تب بھی کہ راضی بہ رضا رہنے کو صبر بھی وہیں سے اترتا ہے۔ دعا کسی بھی حال میں خالی نہیں لوٹتی۔

تو ارشد پرسکون تھا۔ ڈیوٹی مجسٹریٹ نے اس کی لکھی ہوئی وصیت اسے پڑھ کر سنانی شروع کی تو ارشد بولا کہ اس نے خود وصیت لکھی ہے' اسے پڑھ کر سنانے کی کیا ضرورت ہے۔ مجسٹریٹ نے کہا کہ یہ قانونی ضرورت تھی۔ ارشد چپ ہو گیا۔ اس دوران ہم نے ایک تصویر بنائی۔ فلیش گن کا جھپاکا ہوا۔ ارشد نے ایک نظر ہماری طرف دیکھا' پھر آنکھیں بند کر لیں اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔ وصیت میں ارشد نے اپنے بھائی پرویز کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا اور درخواست کی تھی کہ اس کے تمام حقوق وراثت پرویز کے حوالے کیے جائیں۔ بھائی کو ہدایت کی تھی کہ وہ اس کے بیٹے اسامہ کی تعلیم و تربیت اور پرورش کی ذمہ داری اچھے طریقے سے ادا کرے۔ بعد میں ہم نے یہ وصیت نامہ خود بھی دیکھا' اتنی خوبصورت تحریر جیسے کسی نے موتی پرو دیے ہوں۔

ارشد نے وصیت نامے پر دستخط پہلے ہی کیے ہوئے تھے۔ ڈیوٹی مجسٹریٹ نے پھر بھی اس سے پوچھا کہ دستخط اسی کے ہیں۔ اس

نے اثبات میں جواب دیا۔ آخری کارروائی ختم ہوئی۔ اوکاش شیخ نے سپاہیوں سے کہا۔ ''لے جاؤ۔'' سپاہی ارشد کو پھانسی گھاٹ کی طرف لے چلے۔ چند قدموں بعد اسے ٹھہرایا گیا اور کہا گیا کہ وہ جوتے اتار دے۔ وہ معمولی ہوائی چپلیں پہنے ہوئے تھا' اتار دیں۔ کسی سپاہی نے سیاہ رنگ کا ایک ٹوپ ارشد کو اوڑھا دیا جس سے گردن تک چہرہ چھپ گیا' گویا دنیا سے نظری واسطہ ختم ہو گیا۔ ٹوپ اوڑھتے ہوئے ارشد نے بلند آواز سے کلمہ شہادت پڑھا' پھر پھانسی گھاٹ کی طرف چلا۔ چند قدم پر تو پھانسی گھاٹ تھا جس کی پیشانی پر بڑے بڑے حروف میں انگریزی میں Gallows اور سندھی میں پھانسی جو گھاٹ تحریر تھا۔ ارشد کو ایک پھٹے پر کھڑا کر دیا گیا۔ یہ پھٹہ ایک دروازے کی طرح تھا' جس کے دو کواڑ تھے۔ عین درمیان میں ایک چوکور نشان تازہ تازہ پینٹ کیا گیا تھا جس میں ارشد کو کھڑا کیا گیا اور اس کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا گیا۔ کسی نے کالے رنگ کی پٹیوں سے اس کے پاؤں بھی باندھ دیئے۔ اس موقعے پر اس نے کہا' میرا منہ قبلہ رخ کر دو۔''

کسی نے کہا۔ ''آپ کا منہ قبلے ہی کی طرف ہے' آپ کلمہ پڑھیں۔''

ارشد نے بلند آواز سے کلمہ شروع کیا' ارد گرد جیل کے ملازمین بھی کلمہ پڑھنے لگے۔ ارشد کی آواز بتدریج آہستہ ہوتی گئی۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے لیور کے قریب کھڑے ایک سپاہی کو اشارہ کیا' اس نے لیور دبایا۔ پہلی کوشش ناکام ہوئی۔ کسی نے کہا' ذرا زور سے دباؤ۔ اس نے دوسری کوشش کی اور ایک زبردست کھٹاک کے ساتھ وہ پھٹہ جس پر ارشد کھڑا تھا' نیچے کی طرف کھل گیا۔ ارشد تیزی سے نیچے کی طرف گرا' رسے کا جھول ختم ہوا تو لمحے کے ایک حصے میں گردن کا منکا ٹوٹ گیا۔ جسم نے ایک دو جھٹکے کھائے' پھر ساکت ہو گیا۔

باہر کی طرف سے ایک شور سا اٹھا۔ تیز تیز باتیں کرنے کی آوازیں۔ معلوم ہوا کہ ٹنڈو بہاول کیس کے متاثرہ خاندانوں کے افراد آئے ہیں۔ ڈپٹی کمشنر حیدر آباد کی طرف سے متاثرہ خاندانوں کو تحریری طور پر ارشد جمیل کی پھانسی کی اطلاع دی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ وہ چاہیں تو پھانسی کا عمل دیکھ سکتے ہیں۔ وہ جیل کے بیرونی دروازے پر تو بروقت پہنچ گئے تھے لیکن انہیں کسی نے اندر نہیں گھسنے دیا۔ اوکاش شیخ نے ڈپٹی کمشنر کا تحریری حکم دیکھا تو انہیں اندر بلوا لیا۔ یہ چھ افراد تھے۔ کنڈو اور جاوید خاص خیلی کے بھائی یار محمد خاص خیلی' مقتول شفیع محمد بھرگری کے دو کزن محمد جمن اور غلام حسین بھرگری' غلام مصطفیٰ بروہی کا بھائی شفیع محمد بروہی' دھنی بخش کا بڑا بھائی عبدالمجید اور حملو کولی کا بھائی سوجھو کولہو۔ یہ سب افراد پھانسی گھاٹ پر آئے اور انہوں نے ارشد جمیل کو پھانسی کے پھندے پر لٹکے ہوئے دیکھا۔

اس کے بعد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے ہمیں نیچے والے کمرے میں چلنے کو کہا۔ یہ پھانسی گھاٹ اس طرح بنایا گیا تھا کہ پھانسی دینے کا عمل ایک کمرے میں انجام دیا جاتا تھا اور لیور دبانے پر جب دروازے کے کواڑ نیچے کی طرف گر جاتے تو پھانسی پانے والا تقریباً پندرہ بیس فٹ نیچے ایسے گرتا کہ نچلے والے کمرے میں پہنچ جاتا تھا۔ ایک زینے کے ذریعے ہم نچلے کمرے میں پہنچے۔ کچھ سپاہی اوپر ہی رہ گئے۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد فوجی ڈاکٹر نے ارشد کی کلائی تھام کر اس کی نبض دیکھنا چاہی تو اوپر کھڑے ایک سپاہی نے بتایا کہ نبض ابھی چل رہی ہے۔ وہ پندرہ فٹ اوپر تقریباً ایک انچ موٹے رسے کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے ایسے تھامے ہوا تھا جیسے نبض محسوس کر رہا ہو۔ ڈاکٹر نے اس کی تصدیق کی۔ تھوڑی دیر بعد اسی سپاہی نے بتایا کہ نبض رک گئی ہے۔ ڈاکٹر نے سٹیتھوسکوپ سے نبضیں چیک کیں اور ارشد جمیل کی موت کا اعلان کر دیا۔ دور کہیں فجر کی اذان بلند ہو رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔ اللہ اکبر' اللہ اکبر

ہم واپس ڈیوڑھی میں آ گئے۔ یہاں ارشد کے بھائی پرویز موجود تھے۔ شیخ صاحب نے پوچھا کہ وہ ارشد کے کپڑے ساتھ لائے ہیں۔ اثبات میں جواب پا کر ایک سپاہی کو بلایا گیا اور کپڑوں کا جوڑا دے کر اسے باہر بھیج دیا گیا۔ اس اثنا میں ارشد کی نعش پھانسی گھاٹ سے ڈیوڑھی میں لائی جا چکی تھی۔ جیل کے کپڑے اتار کر سٹور مین کے حوالے کر دیئے گئے اور گھر سے لائے گئے کپڑے پہنائے گئے۔ وصیت نامہ' ارشد کے گلے اور بازو سے اتارے گئے تعویذ اور ایک انگوٹھی' پرویز صاحب کے حوالے کر دی گئی۔ ڈیوڑھی کے باہر ایدھی کی ایمبولینس کھڑی تھی۔ سٹریچر کے ذریعے جیل کے اہلکار ارشد جمیل کی نعش باہر لائے۔ ایمبولینس میں رکھنے لگے تھے کہ ٹنڈو بہاول کے متاثرہ خاندانوں سے آئے ہوئے افراد نے مداخلت کی اور کہا کہ انہوں نے جس شخص کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا ہوا پایا' اس کا چہرہ سیاہ رنگ کی ٹوپی سے چھپا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔ ہمیں کیا معلوم کہ انہوں نے کسی پتلے کو لٹکا رکھا ہو' ہمیں ارشد جمیل کا چہرہ دکھایا جائے کہ یقین ہو کہ پھانسی ارشد جمیل کو دی گئی ہے۔ چادر ہٹا کر انہیں ارشد جمیل کا چہرہ دکھایا گیا۔ پھر ایمبولینس نعش لے کر کراچی کی طرف روانہ ہو گئی جہاں سے بذریعہ پی آئی اے اسے اسلام آباد لے جانا تھا اور وہاں سے ضلع اٹک میں ان کے آبائی گاؤں میں سپرد خاک کیا جانا تھا۔

اس طرح پاکستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ مشتہر ہونے والے کیس کا ایک باب ختم ہوا اور اپنے پیچھے کئی سوال چھوڑ گیا۔ فوجی احتساب کے ذریعے وہ تمام افراد جنہیں جرم میں ملوث پایا گیا' چار ماہ کے عرصے میں سزائیں پا چکے تھے۔ ملک کے اعلیٰ سول عدالتوں میں کیس پہنچنے کی وجہ سے ارشد جمیل کی سزائے موت پر عمل درآمد میں تاخیر ہوئی۔ اس دوران دو خواتین نے خودسوزی کر لی۔ جو سویلین کیس میں ملوث تھے ان کا مرکزی کردار غلام نبی پٹھان سات سال بعد بھی مفرور ہے۔ اس کے بیوی بچے بلوچستان میں مقیم

ہیں۔اس کے جو دو کزن گرفتار ہیں وہ بھی بمشکل دو تین مرتبہ عدالت میں پیش کیے گئے ہیں۔

جس معاشرے میں دادرسی اور انصاف کی فراہمی کی رفتار اتنی سست ہو اس میں جرائم کی شرح بڑھنا ایک فطری امر ہے۔ ہماری معزز عدالتوں کے محترم جج صاحبان کے لیے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ اس معاملے میں ہونے والی تاخیر معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہے اور اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ جیلوں میں ایسے ایسے افراد بھی ملتے ہیں کہ دس دس برس سے سلاخوں کے پیچھے ہیں اور عدالتوں میں ان کے مقدموں کا آغاز بھی نہیں ہوا۔ ارکان اسمبلی کو فرصت ہو تو انہیں اس معاملے میں قانون سازی کی طرف توجہ دینی چاہیے بلکہ سیاسی جماعتوں کو اسے اپنے منشور میں شامل کرنا چاہیے۔ کم از کم یہ تو ہو کہ سزا ہونے پر وہ مدت مجرم کی سزائے قید سے منہا کر دی جائے جو اس نے بطور حوالاتی جیل میں گزاری ہو اور جو برسوں جیل میں رہنے کے بعد "باعزت" بری ہوا اسے حکومت کی طرف سے تلافی مافات کے طور پر ایک معقول رقم ادا کی جائے کہ وہ باعزت طور پر دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔

◆◆◆